پشتونوں کی تاریخ



ترجمہ

پروفیسر انور رومان

پشتونوں کی تاریخ

Pathan Borderland
by
James W. Spain

ترجمہ:
پروفیسر انور رومان

گوشۂ ادب
جناح روڈ۔کوئٹہ(پاکستان)
فون:92-081-843229 فیکس:92-081-837672
E-mail- goshaeadab@yahoo.com
goshaeadab@hotmail.com

یہ کتاب گوشۂ ادب سے شائع کی گئی۔

قیمت۔ 495 روپے

فہرست

انتساب

مصنف نے اپنی کتاب کا انتساب اپنے والدین کے نام کیا تھا۔

میں اس کاوش کو پیر سیّد علی حیدر شاہ مدظلہٗ العالی، میاں ڈھیری (صوابی) کے نام منسوب کرتا ہوں۔ پیر صاحب اسلامی زہد و اتقا، ایثار، انسان دوستی اور خدمتِ خلق کے ایک بہترین نمونہ تھے۔ میں جب بھی ان کی خدمت اقدس میں حاضر ہُوا مالا مال اور تر و تازہ ہو کر آیا۔ وہ سارا دن مسجد اور گھر کا چکر لگاتے رہتے مسجد میں مردوں کے ہجوم اور گھر میں بچوّں اور عورتوں کے انبوہ! قریب قریب اور دُور دُور کے دیہات کے مرد، عورتیں اور بچےّ۔ سیدھے سادھے اور پیوند پوش، دُکھی، بیمار، لڑکھڑاتے ہوئے مایوس، ڈگمگاتے ہوئے! پیر صاحب اپنے حوصلہ آفریں لفظوں، شفا آور نسخوں، مجرّب دواؤں، اپنی محبت بھری لمس اور اپنی دلی دعاؤں سے ان سینکڑوں انسانوں کو ہر روز ایمان کی روشنی اور امید کی تابانی سے ایسے اُجال دیتے کہ وہ جہد للبقا کے لئے نئے سرے سے مسلّح ہو جاتے! ایک گرتے ہوئے انسان کو تھام

لینا ، ایک ڈوبتے ہوئے انسان کو بچا لینا ، ایک بجھتے ہوئے انسان میں جوت جگا دینا ، ایک رُوٹھے ہوئے انسان کو منا لینا ، ایک کھوئے انسان کو تلاش کر لینا ، یہی وہ مقام ہے جو عالمگیر مذہب، جمیل و جلیل فن اور غیر فانی روحانیت کی ابدی و آفاقی اقدار کا سنگم ہے اور پیر صاحب موصوف اسی مقام پر فائز تھے ! ؎

یہ شب کے مسافروں کی خاطر
مشعل نہ ملے تو گھر جلاؤں

انور رومان

دیباچۂ مصنّف

یہ مطالعہ بنیادی طور پر شمال مغربی سرحد اور اس میں رہنے والے پٹھانوں کے قارئین کی دلچسپی کے لیے معرضِ تحریر میں لایا گیا ہے خواہ وہ ہنگامی قارئین ہوں یا مستقل۔ لیکن یہ اس شخص کے لئے ناممکن ہے جو پٹھانوں اور ان کی سرزمین میں دلچسپی بھی رکھتا ہو اور بایں ہمہ وہ اس کردار سے لاتعلق رہے جیسا کہ خود پٹھان ہیں۔ جو سرحدی سرزمین عالمی معاملات کے وسیع تر منظر پر ادا کرتی ہے۔ کپلنگ کے دنوں کا "عظیم مقابلہ" ہنوز ختم نہیں ہوا۔ اس میں اب بھی کئی کھلاڑیوں اور بے حد متنوّع احاطوں کی گنجائش موجود ہے۔

جو کچھ بھی سرحد سے متعلق ہے اسے چھُونے اور چھیڑنے کے دوران میں نے مسلسل مقامی واقعات و تغیّرات کو عالمی سیاق و سباق میں بیان کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بین الاقوامی معاملات کے محض اُن پہلوؤں کے نقش و نگار اُبھار رہے ہیں جن کا سرحد اور ایں کے لوگوں پر کوئی نمایاں اثر ہُوا ہے یا ہو رہا ہے۔

پھر بھی زیادہ تر مواد کو خلاصتہً پیش کرنا پڑا اور بشریات،

عمرانیات اور نفسیات جیسے میدانوں میں بھی گامزن ہونا پڑا جن کا مجھے ذوق نصیب نہ تھا اور جس میں میری مہارت شاید محدود تھی ۔ یہ بھی گذارش ہے کہ یہ کتاب پانچ سال سے زیادہ کے عرصہ میں حصّوں اور ٹکڑوں میں لکھی گئی اور پھر چار سال مزید اس کی تکمیل اور اشاعت کے درمیانی وقفہ پر صرف ہو گئے ۔

شاید اس کتاب کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ یہ ایک امریکی نے لکھی ہے ۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ سرحد کے متعلق واحد جامع کتاب ہے جو کسی امریکی کے قلم سے ضبطِ تحریر میں آئی ہے ۔ مجھے اس خود ستائی کو یہ کہہ کر اعتدال پر لانے دیجئے کہ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ ایک تیسرے فریق نے لکھی ہے جس کا اس مختلف النّوع کشاکش سے کوئی مفاد وابستہ نہ تھا جو تاریخ سرحد کے خاصے بڑے حصّہ پر محیط ہے خواہ یہ روسی بمقابلہ انگریز کی ہو یا انگریز بمقابلہ پٹھان یا پاکستانی بمقابلہ افغان !

بے لاگ پن (پتہ نہیں یہ اس میں موجود ہے یا نہیں ،) سرحد کے متعلق ادب میں کمیاب ہے ۔ ہردم رواں انگریزوں نے اس ادب میں بے پناہ اضافہ کیا ہے ۔ ان میں سے بہت سوں نے ہندوستان اور دنیا میں تہذیب و ترقی کے محافظین کی حیثیت سے کشش انگیز لیکن زبردست بدوضع پٹھانوں اور ہمہ وقت بدشگون روسیوں کے خلاف قلم اٹھایا ہے ۔ کچھ انگریز وحشیانہ کشش سے مغلوب ہو

گئے ہیں اور انہوں نے کلکتہ، نئی دہلی اور لندن کی کوتاہ ذہن اور سرد مہر حکومت کے خلاف "اپنے" پٹھانوں کا دفاع کیا ہے لیکن بہ خود بھی سرحد کی مار دھاڑ میں ذاتی طور پر ملوث رہے ہیں۔ معدودے چند پٹھان جو دنیا کے سامنے اپنے لوگوں کا نفسِ ناطقہ بنے ہیں عموماً پرانی لڑائیوں میں نمبر بڑھاتے رہے ہیں یا نئی لڑائیاں بھڑکاتے رہے ہیں۔ ان میں سے کسی نے انگریزوں کے لئے کوئی اچھا لفظ استعمال نہیں کیا۔

میں نے ان صفحات میں جو کچھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ سرحد میں ایک گہری دلچسپی کا نتیجہ ہے جو ایک عشرہ پہلے کراچی میں امریکی سفارتخانے میں تعیناتی کے دوران پیدا ہوئی اور جو اس وقت سے بعد کے دوروں کے ذریعے قائم رہی ہے۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء کے دوران فورڈ فاؤنڈیشن کی ایک فیاضانہ گرانٹ نے لندن کی انڈیا آفس لائبریری نیز پبلک ریکارڈ آفس، برٹش میوزیم اور آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں میرے لئے تحقیق کو سہل بنا دیا فورڈ گرانٹ نے ہی یہ موقع فراہم کیا کہ میں سرحدی علاقے میں کئی ماہ کا اضافی مطالعہ کر سکوں (ان میں سے بعض مہینے پٹھان گاؤں کے باشندے کے طور پر)، لاہور اور پشاور میں سرکاری ریکارڈ کی ورق گردانی کر سکوں اور قبائلیوں اور پاکستانی سرکاری افسروں کے ساتھ وسیع تبادلہ خیال کر سکوں۔ چند ہفتے کا کابل کا دورہ بھی

کیا جاسکا۔ میدان تحقیق میں جمع کردہ مواد میں لائبریری آف کانگریس، نیویارک پبلک لائبریری اور کولمبیا یونیورسٹی لائبریری میں مزید مطالعات سے بیش بہا اضافہ ہُوا۔

اس کتاب کے لئے بیشتر کام فورڈ فاؤنڈیشن گرانٹ کی بدولت ہی ممکن ہُوا لیکن فاؤنڈیشن مواد کی صحت کی ہرگز ذمہ دار نہیں اور نہ ہی میرے طریقۂ پیشکش کی اور نہ ہی ان آرا کی جو میں نے قائم کی ہیں یا ان فیصلوں کی جو میں نے صادر کئے ہیں۔

میں سرحد کے ان متعدد ماہرین و اہلِ علم کا بھی شکر گزار ہوں جو میرے ساتھ بے حد متعاون و مہربان رہے۔ ان میں پاکستان و افغانستان کے بہت سے سیاسی رہنما، سرکاری افسر اور قبائلی شامل تھے جنہوں نے نہایت فراخدلی سے مجھے اپنا وقت بھی دیا اور مخصوص علم بھی! ان میں سعداللہ خان، عطا اللہ جان خان مرحوم سی ایس پی اور پشاور کے ایڈووکیٹ جنرل، چودھری محمد علی جو سب کے سب مدتوں سرحد میں ملازمت کر چکے ہیں اور پاکستان کے دفتر خارجہ کے محمد اسلم خان خٹک خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میں تخت بھائی کے عبدالستار خان اور جمشید خان کے لئے سراپا سپاس ہوں جن کا گھر میرے متعدد دوروں میں میرا "دوسرا گھر" بنا رہا۔ ان اصحاب نے ان سالوں میں سرحد میں میری دلچسپی کو تازیانہ لگایا میری غلطیوں کو درست کیا اور تحقیق کے نئے گوشوں کی بھی نشاندہی

کی۔ اس وجہ سے اس کتاب کی تخلیق میں ان کا بڑا حصّہ ہے لیکن میرے آخری، اخذ کردہ نتائج کی ذمہ داری کے سلسلے میں وہ بھی لازماً اتنے ہی معصوم سمجھے جائیں جتنی فورڈ فاؤنڈیشن!

علمیت کے وسیع تر میدان میں پروفیسر شوئیلر۔ سی۔ والس اور جے۔ سی۔ ہُورلوِٹز کا، جو کولمبیا یونیورسٹی کے سکول آف انٹرنیشنل افیئرز سے منسلک ہیں، بے حد ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی اس کتاب کی تخلیق میں ایک اہم عامل بنی نیز اشتیاق حسین قریشی کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں جو مسلم ہندوستان پر گہرے عبور و شعور (جس سے مَیں بے تکلفانہ فیض یاب ہوتا رہا) کی وجہ سے پٹھانوں کی داستان کو تناظر میں رکھنے کے لئے بے حد ممد و معاون ثابت ہوئے۔

آخر میں مجھے اپنی رفیقۂ حیات کا ذکر کرنا ہے جس نے نہ صرف گرد آلود کتاب دان غور و خوض سے دیکھے اور دھندلے مسوّدات مدوّن کئے بلکہ نہایت ذوق و شوق اور جی داری سے پشاور کی تنگ و تاریک گلیوں میں اور خیبر کی پہاڑیوں کی خطرناک ترین ڈھلانوں پر میرے ساتھ ساتھ رہی اور اپنی انتیازی اور صحیح بین نسوانی آنکھ سے اہم "چھوٹی چھوٹی اشیا" کی طرف توجہ دلاتی رہی جن کے پاس سے میں بسا اوقات بے خیالی میں گزر جاتا تھا۔ صرف وہی جو اتنی بے دھڑک اور دل بستہ رہی ہے۔ اس کتاب کے صوری و معنوی وجود

کے لئے اپنے حق کو ساقط نہیں کر سکتی !

واشنگٹن، ڈی سی　　　　　　　　جے۔ڈبلیو۔سپین

ستمبر ۱۹۶۱ء

پیش لفظ (مترجم)

یہ شاید کہنا ضروری ہے کہ اس کتاب کا مصنّف جیمز۔ ڈبلیو سپین امریکی بننے سے پہلے بھی زیادہ تر یورپی بلکہ مغربی تھا اور امریکی بننے کے بعد بھی زیادہ تر یورپی بلکہ مغربی ہے۔ اس کا "امریکی پن" اس سے ظاہر ہے کہ سرحد، برطانوی ہند اور انگریزوں کے متعلق لکھنے کے باوجود جن سے زیادہ تر امریکی ماخوذ ہیں، اس نے انگریز حکمرانوں، سیاست کاروں اور ارباب نظم ونسق کے لئے معذرت خواہانہ انداز اختیار نہیں کیا جیسا کہ بہت سے انگریز قلمکاروں نے کیا۔ سپین نے ان کی کسی پالیسی کا جواز پیش کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ اس کا تجزیہ، موازنہ اور محاکمہ کرنے کی سعی ضرور کی ہے اور حتی الوسع اس کے روشن اور تاریک پہلو اور اس پالیسی کے خلاف جہاد و اجتہاد کرنے والوں کا مؤقف بھی لازمًا بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے سرحد کی یہ تاریخ نہایت غیر جانبدارانہ، معروضی اور متوازن ہے۔

وہ یورپی بلکہ مغربی اس لئے ہے کہ اس کے آباؤ اجداد بھی

بیشتر امریکیوں کی طرح یورپی بلکہ مغربی تھے اور ان کے ابنا و اخلاف امریکی بننے کے بعد بھی اہلِ یورپ یا اہلِ مغرب سے نسلاً، وراثتاً، ثقافتاً، مذہباً اور مزاجاً قریب رہے۔ امریکہ یوریشیا کی اقوام کی ایک بہت بڑی بھٹی تھی۔ جس میں مختلف النسل، مختلف القومیت اور مختلف الفکر لوگ جدوجہد آزادی، دوراندیش قیادت، محکم دستور اساسی، یکساں نظام تعلیم، جیمز مانرو (امریکہ کے پانچویں صدر ۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۵ء) کے اصول، ابراہام لنکن (امریکہ کے سولھویں صدر ۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۵ء) کی داخلی اتحاد و استحکام کے لئے تطہیری مہم، یورپ کے سیاسی خارزار سے دُوری اور مغربی نصف کرّہ میں کسی مساوی یا حریف قوت کے فقدان جیسے عوامل کی وجہ سے پگھل کر ایک نئی قوم، ایک منفرد قوم یعنی امریکی قوم بن گئے اور گو آج بھی وہاں بعض سنگین اندرونی تضادات موجود اور برسرکار ہیں تاہم ان میں یک جہتی، منزل آشنائی اور وصل خواہی کے خیالات و احساسات اتنے راسخ ہو چکے ہیں کہ یہ تضادات ان کی "امریکیت" کے لئے خطرہ نہیں بلکہ وہ کسی وقت "امریکیت" کی زد میں آ سکتے ہیں لیکن امریکیت تو بمشکل دو سو سال پرانی ہے لہٰذا تاریخی اور ذہنی طور پر اہلِ امریکہ اب بھی اہلِ یورپ ہیں اور یورپ میں بھی وہ مغربی یورپ سے ہر لحاظ سے قریب ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو اہلِ مغرب ہی سمجھتے ہیں!

ان کو مغرب سے بہت سی چیزیں ورثے میں ملی ہیں۔ آریہ نسلیت اور اس کی فوقیت کا طنطنہ، حضرت عیسیٰؑ کی بجائے ان کے حواریوں کا ترتیب دادہ مذہب، صلیبی سورماؤں کا تعصب سفید فام اقوام کے بارِ تہذیب کا نظریہ اور اسلام سے بغض للہی اور اس سے حیرت انگیز بلکہ مضحکہ خیز حد تک ناواقفیت وغیرہ ان میں شامل ہیں۔

سپین بھی ان سے کاملاً مستثنیٰ نہیں ہے۔ وہ وہابیت کی بنیاد آل سعود سے منسوب کرتا ہے۔ وہ جہاد کو ملائیت کا شوشہ گردانتا ہے۔ وہ اسلام کو ایک خشک، افسردگی آفریں اور تفریح کش مذہب سمجھتا ہے۔ وہ تہذیب انسانی پر اسلام کے اثرات واحسانات کا شعور نہیں رکھتا۔ وہ پشتو زبان وادب کے ارتقا کو قبول اسلام کے بعد کا واقعہ تو قرار دیتا ہے لیکن پٹھانوں پر اسلام کے مجموعی اور مسلسل اثرات کی خبر نہیں رکھتا۔ پٹھانوں کا نسلی وجغرافیائی وجود پہلے سے موجود تھا لیکن ان کا تاریخی وجود وشہود وصعود سراسر اسلام کا مرہُونِ منت ہے۔ ان کی ثقافت پر اس کے گہرے اثرات مرتسم ہیں۔ پختون ولی جو ان کا دستور وقانونِ حیات ہے بعض باتوں میں مسخ ہونے کے باوجود بحیثیت اسلامی ہے لیکن شاید سپین یا کسی بھی یورپی وامریکی قلمکار کو ہم بے خبر یا مُوردِ الزام ٹھہرا کر اپنی بریت کا ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ماضی حال کے لئے ایک مینارۂ نور ہے تو حال بھی ماضی کا تصدیق یا تکذیب کنندہ ہے۔ اس وقت کم وبیش چھیالیس آزاد اسلامی ممالک کرّہ ارض پر موجود ہیں لیکن ان کے معاشرے میں اسلام بہت کم نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ مسلمان دنیا کے ہر ملک میں چند ہزار سے لے کر چند کروڑ تک پائے جاتے ہیں اور دنیا میں ہر پانچواں آدمی مسلمان ہے لیکن اس کے باوجود وہ دنیا کے پسماندہ ترین، جاہل ترین، غلیظ ترین اور مریض ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور صدیوں سے بزبان حال اپنے ماضی کی نفی کرتے ہیں اور اسلام کی تردید کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض افراد اس کے حامل و عامل ضرور ہیں لیکن معاشرتی اور مجموعی لحاظ سے اسلام زیادہ تر مسجد و مکتب کی زینت ہے اور گھروں، دکانوں، دفتروں، کھیتوں، منڈیوں، کارگاہوں، ایوانوں اور تعلیمی اداروں میں یہ شاذ و نادر اور خال خال ہی نظر آتا ہے۔ ذمہ دار، مقتدر اور مفاد پیوستہ طبقے صدیوں سے اس گنج گرانمایہ پر ناگ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسلام تو اوّل تا آخر، الف تا ہے، مہد تا لحد، فرد تا اجتماع، زراعت تا سیاست، محنت تا حکومت، عورت تا مرد ہے ہی ترا اطلاقی! اسے محروم اطلاق کر دینا اس کی نفی کے مترادف ہے۔

لہٰذا سپین یا کسی بھی دوسرے قلمکار کو زیر تنقید لانے سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ مسلمان خود اپنے معاشرے، اپنے

سیاسی و تعلیمی ادارے اور اپنے سماجی و اقتصادی نظام اسلام کے مطابق ڈھالیں تاکہ اسلام کا مقصد پورا ہو، اس کا کردار اجاگر ہو اور یہ علم الیقین اور حق الیقین کے علاوہ عین الیقین کا بھی مظہر ہو۔ جیسا کہ قرون اولیٰ میں تھا۔

بہرحال ہیپن نے اپنی اس مختصر لیکن جامع تاریخ میں بہت سے اہم مسائل چھیڑے ہیں اور ان کی چھان بین کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً

۱۔ پٹھان جو اتنے جرأت آزما، خطر پسند اور مہم جُو رہے ہیں پاکستان کی سرحدی سرزمین کے انتہائی شمالی حصے میں کیوں نہ پھیل سکے؟ (باب سوم)

۲ پٹھانوں میں نسلی تفاخر کے باوجود احساسِ قومیت کیوں نہ جڑ پکڑ سکا؟ (باب چہارم)

۳ پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں پٹھان لاتعلق کیوں رہے؟ (باب پنجم)

۴ انگریزوں نے اپنی آمد کے بعد بندوبست اراضی کیا تو موجودہ صوبہ سرحد غذائی لحاظ سے ایک فاضل صوبہ بن گیا لیکن یہ کیفیت صرف چند سال تک قائم رہ سکی اور انیسویں صدی کے اواخر سے پہلے پہلے یہ خسارے کا صوبہ کیوں کر بن گیا؟ (باب پنجم)

۵ بلوچستان میں سنڈیمن سسٹم کیوں کامیاب رہا ؟

(باب پنجم)

۶ جہاد پسند اسلام کا سخت قائل اور اس پر سختی سے عامل صوبہ مغلوب الہندو کانگریس کے ساتھ کیسے ملا رہا ؟ (باب ہشتم)

۷ عبدالقیوم خان نے صوبہ سرحد کو پاکستان کا ایک مثالی صوبہ اور جہاں زیب نے سوات کو صوبہ سرحد کا ایک مثالی علاقہ کیسے بنایا ؟ (باب یازدہم)

۸ ڈاکٹر خان صاحب نے وَن یونٹ کا وزیر اعلیٰ بننا کیوں منظور کیا۔ (باب یازدہم)

۹ پختونستان کیا ہے ؟ اور اس کے محرکات اور نتائج و عواقب کیا ہیں ؟ (باب دوازدہم)

یہ اور اسی قبیل کے دیگر سوالات جو اس کتاب میں اٹھائے گئے ہیں۔ سپین نے ان کی توجیہہ کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے جو اسباب و محرکات دریافت کئے ہیں اور ان کے جو تجزیے پیش کئے ہیں اور جو نتائج و عواقب اخذ کئے ہیں وہ سب کے سب حرفِ آخر ہیں یا ان کے علاوہ عوامل خارج از امکان ہیں جیسا کہ مسئلہ نمبر ایک مذکورہ بالا پر آگے آنے والے مختصر سے تبصرہ سے ظاہر ہو گا لیکن یہ ضرور ہے کہ سپین نے پوری

کوشش کی ہے کہ وہ ہر قسم کی مطبوعات و مسودات تک رسائی حاصل کرے اور اس کے علاوہ اپنے زیرِ مطالعہ لوگوں سے براہِ راست ملے ان کے ساتھ رہے اور ان کے لیل و نہار دیکھے تاکہ جو کچھ پہلے لکھا جا چکا ہے اس کی تردید یا تائید ہو سکے اور جو کچھ ہنوز دیکھا نہیں گیا وہ معرض وجود میں آ سکے۔ اس کی رسائی بہت دور تک ہے۔ پاکستان سے براستہ برطانیہ امریکہ تک۔ البتہ اسے اس کا افسوس ہے کہ وہ روسی قلمکاروں کی تحریرات سے استفادہ نہیں کر سکا کیونکہ وہ روسی زبان سے ناواقف ہے۔ اگر وہ واقف ہوتا تو ممکن ہے کہ اس کی ترتیب دادہ تصویر میں کئی تبدیلیاں ہو جاتیں۔

تاہم یہ کافی حد تک تیقن کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی زبان کے قریباً تمام اصلی اور ثانوی ذرائع و وسائل اس کی گرفت میں رہے ہیں۔ روسی ذرائع سے وہ متمتع نہیں ہو سکا لیکن یہ افغانستان سے زیادہ اور سرحد اور پٹھانوں سے من حیث المجموعی کم متعلق ہیں اور پھر ثانوی ذرائع میں روسی مصنفین بھی شامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سپین کے ذہن و قلم پر اکثر انگریز قلمکاروں کی طرح کوئی قدغن نہیں ہے اور اس کے مطالعات و مشاہدات کسی چیز کو ثابت کرنے یا کسی چیز کا دفاع کرنے یا جواز ڈھونڈنے کے پابند نہیں ہیں بلکہ اس نے اپنے موضوع کا از خود، براہ راست مطالعہ کر کے ہی محرکات و عواقب تلاش کئے ہیں۔ تاہم یہ ایک ناقابلِ انکار

حقیقت ہے کہ دوسری جنگ عالمگیر کے بعد ایشیا میں سلطنت برطانیہ
کی کم وبیش دو سو سالہ بساط لپیٹی گئی تو اس کی بین الاقوامی ذمہ داریاں
امریکہ نے سنبھال لیں لہٰذا یہ سمجھنا کہ کم از کم ان ذمہ داریوں کے احاطے
میں امریکی انگریزوں سے بالکل مختلف ہیں یا امریکی انگریزوں کی وضع
کردہ اور متروکہ پالیسی کے سلسلے میں قطعاً بے لوث ہیں اور سپیچ اس
عرصے میں بھی اتنا ہی لاتعلق ہے جتنا دوسری جنگ عالمگیر سے پہلے
تھا شاید ایک خوش فہمی ہی ہو گی ۔

جہاں تک مذکورہ بالا مسئلہ نمبر ایک کا تعلق ہے تو اس سلسلے
میں گذارش ہے کہ اس وقت پٹھانوں کی مجموعی آبادی قریباً بارہ ملین
ہے جن میں سے قریباً چھ ملین پاکستان کے قبائلی علاقہ، صوبہ سرحد
اور بلوچستان میں ہیں اور باقی چھ ملین افغانستان میں ہیں لیکن پاکستان
میں پٹھانوں کی آبادی یقیناً اس سے زیادہ ہے ۔ اس لئے کہ اس
میں پنجاب اور سندھ کی پٹھان آبادی شامل نہیں ہے ۔ اس کی وجہ
یہ ہے کہ پٹھان اور پشتو کو لازم و ملزوم قرار دیا جاتا ہے حالانکہ
زبان ایک سماجی عمل ہے جو ایک مخصوص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے
اصلی یا مادری زبان ایک مختلف ماحول میں زیادہ سے زیادہ تیسری
نسل کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے ۔ اسی لئے ماہرین زبان کو نسلی
شناخت کا حتمی ذریعہ نہیں مانتے اور اس کی بجائے جسمانی خصائص
بشریاتی پیمائش اور ثقافت و روایات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔

بہرحال سکندر لودھی (۱۴۸۹ء تا ۱۵۱۷ء) کے دَور میں ہندوستان میں پٹھانوں کی کل تعداد قریباً ۹ لاکھ تھی۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق سرحد و بلوچستان کے سوا ہندوستان میں پٹھان مردوں کی آبادی ۱۱,۰۳,۶۸۰ تھی گویا مجموعی آبادی قریباً دو ملین ہو گی اس مردانہ آبادی کی صوبہ وار تقسیم یوں تھی۔

یو۔ پی	۴,۱۷,۳۲۶
بنگال	۲,۱۴,۳۸۷
پنجاب	۱,۴۴,۷۵۲
راجپوتانہ	۶۴,۹۲۱
مدراس، کوچین، ٹراونکور	۵۱,۸۶۷
سنٹرل انڈیا	۴۷,۰۰۰
میسور	۲۶,۶۳۱
کشمیر	۲۶,۶۳۱
برار اور حیدر آباد	۲۶,۲۲۸
برما	۷,۴۳۰
آسام	۶,۶۳۲
بمبئی و بڑودہ	۶,۰۰۰

۱۹۴۷ء تک یہ آبادی کم و بیش چار یا پانچ بلین ہو گی ۔ جو اکثر و بیشتر مہاجرین کی صورت میں، پاکستان میں آگئی لیکن یہ پٹھان اُردو اور پنجابی بولنے والے ہیں اور انہی میں شمار ہوتے ہیں ۔ بنگالی اور دیگر زبانیں بولنے والے انہی علاقوں میں رہ گئے ۔

ان پٹھانوں کا ہندوستان کی تاریخ پر بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر بالخصوص بہت گہرا اثر ہے ۔ وہ زیادہ تر عسکری تھے ۔ منصب دار، جاگیردار اور زمیندار ۔ وہ اہلِ سیف بھی تھے اور اہلِ قلم بھی اور علم و فضل میں تُرکوں اور ایرانیوں کا لگا کھاتے تھے ۔ ان پٹھانوں نے متعدد ریاستیں بھی قائم کیں جو ۱۹۴۷ء تک بلکہ بعد تک موجود رہیں جیسے بھوپال، رامپور، ٹانک، مالیرکوٹلہ، جوناگڑھ وغیرہ ان میں سے بہت سے اولیاء اللہ بھی ہوئے ۔ روہیل کھنڈ ہو یا دلّی کا افغان پورہ اور پُل بنگش، ملتان کے پٹھان نواب ہوں یا قصور اور ممدوٹ کے وہ مسلمان تمدّنِ ہند کے محترم و محتشم خالق و حامل تھے اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہو یا فارسی زبان کی ترویج و تشہیر یا اردو زبان کی تخلیق و تزئین، پٹھانوں کے کارنامے اور نقوش لازوال ہیں صوبہ بمبئی کی بندرگاہ بروچ آج بھی بڑیچ پٹھانوں کی یاد دلاتی ہے جو ان کے کاروباری مزاج و مہارت کی آئینہ دار ہے ۔ اُن کی بہ کارکردگی صرف لودھی اور سوُری ادوار تک ہی محدود نہ تھی ۔ بلکہ ان سے پہلے کم از کم سلطان محمود غزنوی کے دَور سے اور ان کے

بعد بھی وہ ہر لحاظ سے ہندی مسلمانوں کے صفِ اوّل کے افراد تھے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی ثقافت کے بہترین نمونے، نمائندے اور زعیم تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی تھے اپنے قدو قامت، رنگ رُوپ اور وضع قطع میں دیگر مسلمانوں سے منفرد ہونے کے باوجود ان کے ہم زبان، ہم سوز اور ہم منزل تھے۔ محض زبان کی بنا پر انہیں پٹھان ماننے سے انکار کرنا ایسے ہی ہے جیسے تاریخی واقعات وحالات کو دو آنکھوں کی بجائے صرف ایک آنکھ سے دیکھنا۔ وہ نسلاً آج بھی پٹھان ہیں۔

سپین نے پٹھانوں کے پھیلاؤ کو دیکھا تو اسے اس پر حیرت ہوئی کہ یہ لوگ سرتا پا" ہر چہ بادا باد، ما کشتی درآب انداختیم" کا مجسمہ ہونے کے باوصف انتہائی شمال میں کیوں نہ نفوذ کر سکے؟ اس نے سکنڈے نیویا کے ماہر بشریات، مسٹر فریڈرک بارتھ کا سہارا لیا جو ۱۹۵۴ء میں سوات میں مصروفِ تحقیق رہا تھا۔ اس کے مطابق پٹھانوں کی توسیع اس حد پر جا کر رک گئی جہاں دو فصلی علاقہ کی حد ختم ہوئی اور یک فصلی علاقہ کی حد شروع ہو گئی۔ اس استدلال میں بہت وزن ہے اور اس میں پٹھان توسیع کو ایک نئے زاویے سے دیکھا گیا ہے لیکن نہ فریڈرک بارتھ اور نہ ہی سپین اس اٹل حقیقت کو سمجھ سکے کہ پٹھانوں کے قدرتی نکاس کے لئے ہندوستان کا وسیع اور کشش انگیز میدان تھا جو صدیوں سے شمال مغربی دروں

کے نوواردوں کا ہدف بنا رہا تھا۔ لہٰذا وہ شمال کے منجمد علاقوں اور جنوب کے نسبتاً خشک علاقوں کی بجائے ایسے علاقوں کا رُخ کیوں نہ کرتے جس میں اتنی گنجائش اور امکانیت تھی کہ وہ انہیں قبول کرنے کے لئے تیار تھا۔

افسوس ہے کہ پیش لفظ ہر مسئلہ پر ایسی بحث کا متحمل نہیں ہو سکتا لہٰذا میں باقی نکات بلکہ پوری کتاب قارئین پر ہی چھوڑتا ہوں سپین نے بہت کچھ لکھا اور سوچا ہے اور اس کی سوچ اکثر و بیشتر تاریخ سے ہم آہنگ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو وہ محض ایک دلچسپ مطالعہ ہے لیکن اگر تدبّر و تفکّر سے کام لیا جائے تو تاریخ ماضی کا آئینہ، حال کا معیار اور مستقبل کی بھی نقش گر بن جاتی ہے اور ؎

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

کے مصداق ابھی مزید سوچنے کی گنجائش بھی ہے اور ضرورت بھی۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس کتاب کو پوری توجہ اور انہماک سے پڑھیں گے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر پاکستان و افغانستان کے حکمران طبقے، اہل سیاست اور اہل الرائے اس کتاب کو غور سے پڑھیں تو نہ صرف ہماری سرحدی سرزمین کے بہت سے اہم تاریخی، اقتصادی اور سماجی پہلو سامنے آئیں گے بلکہ وہ ہمسائگی کی اہمیت بھی سمجھ سکیں گے اور ہمسایہ داری کے بہت سے تقاضے بھی پورے کر

سکیں گے جو ہنوز ان کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ یہ تقاضے پورے ہو جائیں تو پھر بنیادی یگانگتیں اور مماثلتیں جن میں اسلام اور اسلامی ثقافت اہم ترین ہیں یقیناً اس ہمسایہ داری کو محکم سے محکم تر کرتی رہیں گی۔

تاریخ کا ایک ناگزیر سبق یہ ہے کہ انسانوں کے مختلف رنگوں، نسلوں، زبانوں، ثقافتوں اور مذہبوں کے باوجود ان کے درمیان ایک ناقابلِ انکار وحدت ہر وقت موجود ہے اور اگر قیادت چاہے تو وہ اس مواد سے فائدہ اٹھا کر انسانوں کو رشتۂ وحدت میں پرو سکتی ہے۔ قیادت جب بھی چاہے ایسا ہو سکتا ہے اور جب رشتہ ہائے اتحاد و اشتراک زیادہ سے زیادہ ہوں اور نکاتِ اختلاف کم سے کم ہوں جیسا کہ پاکستان و افغانستان میں تو ایسی صورت میں اس مضمر وحدت کو ایک روشن حقیقت اور قوتِ سیال بنا دینا تو اور بھی آسان ہے بشرطیکہ قیادت ذاتیات و ہنگامیات سے اوپر اُٹھے اور اپنی باگ ڈور منشائے وقت اور تقاضائے تاریخ کے ہاتھ میں دے کر اس گوہرِ نایاب کو پالے!!

آخر میں مَیں جناب عابد بخاری کا تہِ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اس خاکسار کو ایک اچھی اور اہم کتاب ترجمہ کے لئے دی۔ ترجمہ اصل کا بدل تو نہیں ہو سکتا لیکن وہ اتنا بے وقعت بھی نہیں ہوتا جتنا ہمارے جیسے سیماب پا ملکوں میں بسا اوقات

سمجھ لیا جاتا ہے۔ یونانی و لاطینی تراجم اسلامی تہذیب کے ارتقاء کے لیۓ اتنے ہی اہم تھے جتنے عربی و فارسی تراجم جدید تہذیب کے ارتقاء کے لیۓ!

کوئٹہ

۷، ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ — انور رومان

۱۸، نومبر ۱۹۸۸ء

تعارف

پٹھانوں یا پختونوں یا افغانوں (جیسا کہ وہ عموماً اپنے کو کہتے ہیں) پر گہری نظر ڈالنے سے پہلے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ وہ کوئی گمنام اولین باشندے نہیں ہیں جو حال ہی میں اندرونِ افریقہ یا آسٹریلیشیا کے کسی دُور افتادہ کوتے میں دریافت ہوئے ہیں۔ ان کا قبائلی معاشرہ غالباً سب سے بڑا اور اہم ترین ہے۔ جو موجودہ دنیا میں اب بھی زندہ ہے۔ قریباً گیارہ ملین پٹھان ہیں جن میں سے قریباً نصف پاکستان اور نصف افغانستان میں ہیں (مقابلتاً کُرد ان کے قریباً نصف ہیں) نصف سے کافی زیادہ غالباً سات یا آٹھ ملین ابھی تک ایک سخت قبائلی سماجی نظام کے تحت رہتے ہیں۔ باقی ماندہ تین چار ملین کم و بیش بیرونی سماجی و سیاسی تنظیم کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں تاہم وہ بھی ایک مشترکہ ثقافت اور زبان میں شریک ہیں اور اکثر و بیشتر اپنے قبائلی حسب و نسب کو یاد رکھے ہوئے ہیں جس سے ایک مشترکہ تشخص کا شعور قائم و دائم ہے۔ پورا گروہ بہت حد تک ہم خیال ہے اور اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ پٹھان کا رویّہ اور ردِّ عمل بھی قریباً وہی

ہوتا ہے جو کم سے کم مہذب کا۔

پٹھانوں کی اپنی تاریخ ہے جو تقریباً ایک ہزار سال پرانی ہے ان کا اپنا ادب ہے، شاعر اور علماؑ و فضلا ہیں اور ان کے اپنے مشاہیر ہیں جو تاریخ ایشیا میں اتنے ممتاز و محترم ہوئے۔ آج بھی ان کے ہم نسل لوگ صوبہ سرحد کی حدود کے پار اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں۔ افغان شاہی خاندان محمدؐ زئی درانی ہے۔ صدر پاکستان اور افواج پاکستان کے چوٹی کے اکثر افسران پٹھان ہیں۔ اس وقت بھی سرحد کے دیہات میں ایسے لوگ اپنی پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں جو پہلی جنگ عالمگیر میں جرمنوں اور ترکوں سے لڑے ہیں۔ اس جنگ کے بعد روسی بالشویکوں سے نبرد آزما ہوئے ہیں اور پھر دوسری جنگ عالمگیر میں اطالویوں اور جاپانیوں سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنہیں ملکۂ وکٹوریہ نے تمغے پہنائے ہیں اور لینن نے اعزاز بخشے ہیں۔ انہوں نے آزمودہ کار برطانوی افسروں کو مارا ہے اور کابل میں ایک بادشاہ کو تخت پر بٹھانے میں مدد دی ہے۔

جو آدمی راقم الحروف کی طرح کپلنگ کی کہانیوں اور قصوں کے رومان اور تشبیہات نادر سے سیراب ہو کر سرحد میں پہلی دفعہ آتا ہے اس کے لئے حیرت و استعجاب کا دفتر کھل جاتا ہے۔ یہ سب کچھ سچ ہے۔ طویل القامت، باریش قبائلی پشاور کی تنگ گلیوں میں سے کوئی بے باکانہ نغمہ گاتے ہوئے گزرتے ہیں۔ کندھوں پر رائفلیں

اٹھائے ہوئے اور کالر کی پٹیوں میں خنجر لگائے ہوئے، شہر کی گرتی ہوئی دیواروں کے ساتھ ساتھ قدیم سرائیں کھڑی ہیں جہاں بخارا، سمرقند اور کاشغر کے بڑے بڑے کاروان کبھی اپنا سامان اتارتے تھے، بازار غیر ملکی سازوسامان سے بھرے پڑے ہیں۔ سُرخ اور سنہری سلیپر، پیتل اور تانبے کے ظروف، مرصّع خنجر، سنہری دستار اور مشرق کے رنگا رنگ مصالحہ جات۔ مسجد مہابت خان کے میناروں کی خیرہ کن مرمریت، صرافوں کی گرد آلود گلی کے جھمکوں اور چُوڑیوں میں منعکس ہوتی ہے۔ اگر تیمور لنگ بھی یہاں سے گزرے تو وہ بھی پانچ صدیوں کا فرق محسوس نہ کر سکے گا۔

خیبر سے گزرتے ہوئے، قلعہ جمرود پر سیّاح کی اچھی طرح جامہ تلاشی ہوتی ہے جہاں عظیم سکھ جرنیل ہری سنگھ پٹھانوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور پھر اگر اس کے پاس مطلوبہ اختیار نامہ ہے تو اُسے آگے تنگ گھاٹی میں جانے دیا جاتا ہے جس میں اب بھی قدم قدم پر قلعے اور بندوق خانے موجود ہیں۔ افغان سرحد پر خوشبودار سبز چائے کی پیالی پیتے ہوئے اسے مسکراتے ہوئے روسیوں کا ایک گروہ مل جاتا ہے جو وسط ایشیا کی اونچی اونچی سمور دار ٹوپیاں پہنے ہوئے کسی نامعلوم کام کاج کے لئے افغانستان سے پاکستان جا رہا ہے۔

وزیرستان میں جب مسافر مضبوط، قلعہ بند چھاؤنیوں سے

باہر پولیٹیکل ایجنٹ کے ساتھ سیر بینی کے لئے نکلتا ہے تو مرنے مارنے پر تیار، رائفل بدوش سکاؤٹوں کا ایک محافظ دستہ ساعت کے آگے پیچھے اور پہلوؤں پر چلتا ہے۔ گروہ کی نقل و حرکت مقررہ اوقات کے مطابق ہوتی ہے تاکہ تاریکی سے پہلے پہلے اسے کسی قلعہ کی چار دیواری میں لایا جا سکے اور دیہات اور چھاؤنیوں کے دروازے بند نہ ہو جائیں۔

پورے سفر کے دوران خطرہ اور جوش و خروش کی فضا قائم رہتی ہے لیکن آج کل حفاظتی تدابیر اتنی وافر ہیں کہ بزدل ترین سیاح کے سوا آدمی نامناسب خطرۂ جان کے بغیر اپنے تجربات سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ رومان اور مہم جوئی سے لطف اندوز ہونے کا اس سے بہتر طریقہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرا مرحلہ بھی ہے جو آج کل کی سماجی و اقتصادی شعور یافتہ دنیا کے اکثر سیاحوں کو تھوڑی دیر کے بعد پیش آتا ہے (رطب اللسان غیر ملکی کو شدت سے تصویر کے دوسرے رُخ کا احساس ہوتا ہے اور اسے اکثر لوگوں میں فلاکت و جہالت نظر آتی ہے جو دُور دُور تک پھیلی ہوئی تپ دق، گلوکوما (آنکھ کی ایک بیماری) اور اموات نوزائیدگان، سخت پردے کی وجہ سے عورت پر عائد کردہ جان لیوا اور غیر معقول پابندیوں اور اکثر مردوں کی لالچ اور برائیوں ان کی شیخیوں اور مبالغہ آمیز قول و قرار اور دھمکیوں اور وحشیانہ

اور بے سود خونیں جھگڑوں میں ظاہر ہوتی ہیں ۔

اس مرحلے میں پٹھانوں کا مبصر اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہے۔ کہ اس نے اپنی گلابی عینکیں اتار لی ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ پٹھان کسی قدر گندم نما اور جَو فروش ہیں ۔ وہ اپنی انگلی ناگزیر طور پر اقتصادی مسئلے پر رکھتا ہے جو اس علاقے کا واقعی اہم عامل ہے ۔ وہ ان لوگوں کی مدد کرنے کا سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے جو اپنے بے آب رومانوی رنگ وروغن کے رُوپ میں دنیا کے بدقسمت ترین لوگوں میں شامل ہیں ۔ اگلا قدم منصوبہ سازی ہے تاکہ بہتر شادابی طریقے جاری کئے جائیں ۔ گھریلو دستکاریوں کو ترقی دی جائے۔ قبائل کو غیر مسلح کیا جائے اور انہیں میدانوں کی نوسیراب زمینوں پر آباد کیا جائے ۔ پٹھانوں کا غیر دلکش پہلو بھی ہے جس پر نگاہ ڈالنا کافی حد تک قابل تعریف بھی ہے اور دیرینہ ضرورت بھی ۔ پٹھانوں کی مدد کرنے کا خیال برطانوی حکومت کے دور عروج میں قریباً مکمل طور پر نظرانداز کر دیا گیا۔ بہت سے برطانوی افسر اور منتظمین سطح سے نیچے کبھی نہ دیکھ سکے اور سرحد میں اپنی پوری ملازمت کے دوران پٹھانوں سے صرف تلوار بازی اور تدبیر آزمائی ہی کرتے رہے اور پٹھانوں کو شکست و موت کا سامنا کرنے پر مجبور کرتے رہے اور خود بھی قریباً اتنی ہی خوشی سے شکست و موت کا سامنا کرتے رہے ۔ بعد کے برطانوی جیسے بارٹن اور فریزر ٹٹلر پٹھانوں کی قابلِ رحم اقتصادی حالت سے بخوبی آگاہ تھے اور

وہ حکومتِ ہند کو اکثر اس کا مداوا کرنے پر ابھارتے رہے۔ بہت سے پاکستانی افسر بھی اسی نظریئے کے ہیں کہ قبائلی مسئلہ کی کلید اقتصادی ہے اور پچھلے چند سالوں کے بیرونی امدادی پروگراموں کے بل پر انہوں نے پٹھانوں کی تقدیر بدلنے میں کافی پیش رفت کی ہے بالخصوص صحت اور تعلیم کے میدانوں میں۔

پٹھانوں کے اکثر مبصرین انہی دو مراحل پر رک جاتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ان کی اخذ کردہ تصویر متوازن ہے۔ قدیم دھوم دھڑکا کی ایک باریک سی سطحی تہہ جو ایک اناڑی مبصر کو تو بہلا پھسلا سکتی ہے لیکن جس کے نیچے فلاکت و جہالت کا ایک بڑا اور مہیب دھارا بہہ رہا ہے جسے جدید طریقوں سے ہی زیر کیا جا سکتا ہے۔

پہلے اور دوسرے مرحلے پر غور کرتے ہوئے راقم الحروف کو ایک تیسرے مرحلے کا احساس ہوا جو ہنوز قائم ہے۔ آخری مرحلہ پہلے مرحلے سے بہت مشابہ ہے۔ پٹھان بالآخر ایک حقیقت ہے اور اس کی روائتی تشبیہ کچھ زیادہ غلط نہیں ہے۔ طویل و عمیق معائنہ کے تحت بھی پٹھان غیر معمولی حد تک اپنے ذاتی وقار کا ایک شدید احساس اور آزادی سے بے پناہ محبت رکھتا ہے۔ یہ خوبیاں جدید معیار کے مطابق بھی احسن ترین ہیں اور انتقام اور مہمان نوازی جیسے تصورات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ بیرونی دنیا انہیں کتنا بھی از کار رفتہ

اور رومانوی سمجھے یہ سرحد میں ایک قائم و دائم قبائلی معاشرے کا قدرتی اظہار ہیں جو کم از کم اپنی موجودہ ہیئت میں ان سے زیادہ تقویت حاصل کرتا ہے بجائے اس صورتیت کے جو دنیا کے دوسروں حصّوں میں زیادہ مرغوب ہے۔ یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ پٹھان کی خوبیاں اس کی فلاکت کی وجہ سے ہیں لیکن یہ ضرور قابلِ تخمین ہے کہ وہ اسے دُور کرنے کے لئے انسانی وقار و حریّت کے آدرشوں کا ہرگز سودا نہیں کرتا۔

پختون ولی کی صحت کے لئے شاید آج کل بھی قولِ فیصل یہی ہے کہ اس کے اکثر پیروکار حیرت انگیز طور پر وقت کے رُخ کے ساتھ بدل سکتے ہیں۔ ایشیائی جس کا مغرب سے بہت گہرا ربط ہُوا ہو اور وہ اپنی ثقافت سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ بلکہ یتیم المعالین بن کر رہ گیا۔ ایک بہت عام منظر ہے۔ لیکن پٹھان ایسا کوئی شاید ہی ملے گا۔ وہ دونوں دنیاؤں سے متمتع ہونے کا جوہر رکھتے ہیں۔ نوجوان پٹھان جو ڈگری یافتہ ہے اور آکسفورڈ یا کیمرج میں سماجی امتیاز حاصل کر چکا ہے اپنے گاؤں میں واپس آئے گا تو اپنے خاندان کا خونیں جھگڑا چکائے گا۔ اگر اس عمل کے دوران اسے نفسیاتی دھچکے لگیں تو وہ شاذونادر ہی منظرِ عام پر آئیں گے۔ یہ غالباً حادثی نہیں تھا کہ کپلنگ نے اپنی " مشرق و مغرب کی داستان " میں اپنے اصُول .... " تو ام ہرگز آپس میں نہ ملیں گے " سے پٹھانوں کو مستثنیٰ

قرار دیا۔

"لیکن وہاں نہ مشرق ہے نہ مغرب
نہ سرحد نہ تربیت ، نہ پیدائش
جب دو مضبوط انسان رُوبرو کھڑے ہوتے ہیں
خواہ وہ کرّہ ارض کے سِروں سے تعلق رکھتے ہوں!"

باب اوّل

سرزمین

الف - جغرافیہ

پٹھانوں کی پُرمنظر سرزمین نے ان کی تاریخ اور طرزِ حیات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان کا علاقہ ہمالیہ کے مغربی سرے سے شروع ہوتا ہے جہاں یہ سلسلۂ عظیم بڑی بڑی چوٹیوں اور گڈمڈ سلسلوں میں بکھر جاتا ہے یعنی قراقورم، پامیر اور ہندوکش۔ ہندوکش کا بڑا سلسلہ رفعت اور آب و تاب میں کم ہوئے بغیر جنوب اور مغرب میں جاری رہتا ہے اور افغانستان کو دو حصوں میں بانٹ دیتا ہے اس کی ایک اور شاخ سیدھی جنوب کی طرف چلتی ہوئی کوہِ سفید بن جاتی ہے جو کوہِ سلیمان سے مل جاتی ہے۔ مزید جنوب میں چاغی کی پہاڑیاں مغرب کی طرف چلتی رہتی ہیں حتیٰ کہ صحرائے ہلمند کے ریگزاروں میں گم ہو جاتی ہیں۔ پہاڑی رکاوٹ وسط ایشیا کے مرکز اور بحیرہ عرب کے ساحلی ریگزاروں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر محیط ہے۔ ۱۸۹۳ء میں سر مارٹیمر ڈیورنڈ نے برطانوی حکومت کے ایما پر اس چٹانی سلسلہ کے ساتھ ساتھ ایک خط فاصل

کھینچنا تاکہ ہندوستان کو افغانستان سے ممیز کیا جا سکے۔ ڈیورنڈ لائن
اب بھی افغانستان اور پاکستان کے درمیان خط فاصل ہے۔

پاکستان کا شمالی مغربی سرحدی علاقہ زیادہ تر مغرب میں ڈیورنڈ
لائن اور مشرق میں دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے۔ یہ اندازاً ۳۱ء
سے ۵۷ء ۳۶ شمالی عرض بلد اور ۱۴ء ۶۹ سے ۲ء ۷۲ مشرق
طول بلد میں واقع ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۴۰۰ میل سے
ذرا زیادہ اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی قریباً ۲۸۰ میل ہے۔ گو عین
مرکزی حصے میں پہاڑ اور سندھ بمشکل ۱۰۰ میل کے فاصلے پر ہیں۔ اس
کا کل رقبہ قریباً ۳۹،۲۵۹ مربع میل ہے۔

شمالی سرحد ہمالیہ کا گنجان سلسلہ ہے جہاں افغانستان کی واخان
کی پٹی چھ میل سے بھی کم فاصلے سے ہندوکش کو پامیر سے اور پاکستان
کو روس سے جدا کرتی ہے۔ جنوب میں یہ علاقہ صحرائے بلوچستان میں
کھلتا اور ختم ہو جاتا ہے جس پر تخت سلیمان کی اونچی اور آخری چوٹی
ایستادہ ہے۔ مشرق کی طرف کشمیر اور پاکستانی پنجاب ہے اور مغرب میں
افغانستان واقع ہے۔

سیاسی طور پر یہ علاقہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ۱۔ قبائلی علاقہ
جس میں مالاکنڈ، مہمند، کرم، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان
کی ایجنسیاں شامل ہیں۔ ۲۔ چھ زیر قانون اضلاع یعنی ہزارہ، مردان
پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان۔ قبائلی علاقہ جو

ڈیونڈ لائن کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔ ۲۵،۱۰ مربع میل پر محیط ہے
اور اضلاع جو سندھ سے منفصل ہیں ۱۹،۱۲۱ مربع میل پر[1]۔

جغرافیائی لحاظ سے یہ علاقہ تین قدرے مختلف حصوں میں
تقسیم ہے۔

۱۔ ضلع ہزارہ واحد حصہ جو دریائے سندھ کے مشرق
میں واقع ہے۔

۲۔ دریائے سندھ اور پہاڑیوں کے درمیان کی نسبتاً
تنگ پٹی جو اضلاع مردان، پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ
اسماعیل خان پر مشتمل ہے۔

۳۔ ڈیورنڈ لائن کے ساتھ ساتھ شمال اور مغرب کے
پہاڑی علاقے جو قبائلی ایجنسیوں پر محیط ہیں۔

ہزارہ

ضلع ہزارہ کے مغرب میں دریائے سندھ اور مشرق میں
پنجاب کا ضلع اٹک ہے۔ یہ ایک اچھے خاصے چوڑے قاعدے

۱۔ دیر، سوات اور چترال کی ریاستیں مالاکنڈ ایجنسی کا حصہ ہیں۔ قبائلی
علاقہ میں وہ چھ پٹیاں بھی شامل ہیں جو انتظامی ضروریات کے تحت
زیرِ قانون اضلاع سے منسلک ہیں۔

سے ایک پانہ کی صورت میں شمال کی طرف اٹھتا ہے اور کوہ ہمالیہ کے کافی اندر تک چلا جاتا ہے۔ یہ پانہ وادی کاغان کے سرے تک جاتا ہے جہاں ۱۳ ہزار فٹ اونچا درہ بابوسر گلگت میں کھلتا ہے۔ ضلع کے شمالی حصہ میں وادی کاغان چٹانی پہاڑی دیواروں کے درمیان بس ایک گھاٹی ہی بن جاتی ہے۔ مزید جنوب میں پہاڑ جدا ہو کر پست اور جنگلات سے بھرپور شاخوں میں بٹ جاتے ہیں اور علاقے کو چھوٹے چھوٹے الگ تھلگ قطعات میں کاٹ دیتے ہیں۔ پانہ کے عین قاعدے پر پہاڑیاں کھل جاتی ہیں اور پنجاب کے میدان شروع ہو جاتے ہیں۔

ہزارہ کی پنجاب کی دیرینہ زرخیزی سے قربت اور اس کے شرق سندھ محل وقوع نے اس ضلع کو سرحد کے دیگر حصوں سے ممیز کر دیا ہے۔ لیکن یہ علیحدہ تشخص جغرافیائی سے زیادہ سیاسی و نسلیاتی ہے۔

سندھ پار کے اضلاع

سندھ کے مغرب کی طرف کے پانچ اضلاع مغربی سرحدی پہاڑیوں سے متصل ہیں لیکن ان کے جغرافیائی خصائص کافی مختلف ہیں۔ شمال کے پشاور اور مردان ایک کشادہ وادی میں واقع ہیں۔ وادی پشاور پہاڑیوں میں محصور ہے جن سے مغرب میں درہ خیبر اور دریائے کابل اور شمال میں درہ مالاکنڈ اور دریائے سوات

گذرتے ہیں۔

ایک ہلکی سی، مسامدار سطح کی مٹی قدرے ریت اور ملگیر چکنی مٹی کے ساتھ دس تا پچیس انچ سالانہ بارش اور نسبتاً باافراط آبپاشی کی سہولت نے مل کر وادیٔ پشاور کو پورے علاقے کے لئے خوردنی پیداوار کا اہم ترین ذریعہ بنا دیا ہے۔ ایک لمبا، گرم اُگائی کا موسم اور کبھی کبھار کی، ہلکی سی کہر بھی پھلوں، گندم، جوار، مکئی، دالوں، گنا اور تمباکو کی اچھی فصلوں کے لئے ممد و معاون ہیں۔

جنوب کا ضلع کوہاٹ کوہ جواکی کی وجہ سے پشاور سے جدا ہوتا ہے۔ جس میں سے چھوٹا سا لیکن نظر افروز درّہ کوہاٹ گزرتا ہے۔ ضلع ایک سنگلاخ سطح مرتفع ہے جو پہاڑیوں کے پست سلسلوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان میں سے بعض میں نسبتاً زرخیز وادیاں ہیں جہاں پیداوارگارے کے ذخائر ہیں لیکن اکثر پہاڑی زمین بنجر ہے اور زراعت زیادہ تر تقریباً پندرہ انچ سالانہ بارش پر ہی منحصر ہے۔ کوہ نمک ضلع کے جنوبی اور مشرقی حصوں میں در آیا ہے جس سے اندرونی رسل و رسائل مشکل ہو گئے ہیں۔ اس سے پرے ایک ریتلا میدان ہے۔

مزید جنوب میں بنّوں کے ارد گرد دریائے کرّم کے زیریں حصّوں کے ساتھ ساتھ ایک نسبتاً زرخیز اور کشادہ میدان ہے۔ آبپاشی اور باری باری کی فصل کاری کی بدولت زرعی پیداوار خوب

ہوتی ہے۔ گوارد گرد کا علاقہ خشک ہے جسے میدان مسوات کہا جاتا ہے۔ اگر بارش کافی ہو جائے تو اس میدان کے کچھ حصے میں بھی گندم بافراط ہو جاتی ہے ۔

سرحد کا جنوبی ترین ضلع ڈیرہ اسماعیل خان زیادہ تر ایک خشک اور پتھریلے میدان پر مشتمل ہے جو دریائے سندھ اور مغربی کوہ سلیمان کے درمیان محدود ہے۔ یہاں پانچ تا آٹھ انچ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ سندھ کے ساتھ ساتھ گاد کی ایک زرخیز پٹی ہے اور زیریں ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ چکنی مٹی کا ایک ذخیرہ ہے جسے دامان کہتے ہیں۔ پورا میدان جو پنجاب تک پھیلا ہوا ہے ڈیرہ جات کہلاتا ہے۔

سرحدی پہاڑیاں

شمالی اور مغربی پہاڑی خطوں کی نوعیت جس میں قبائلی ایجنسیاں واقع ہیں۔ اضلاع کی نسبت زیادہ متنوع ہے۔ مالاکنڈ ایجنسی میں ریاست ہائے دیر، سوات اور چترال واقع ہیں اور یہ ضلع ہزارہ سے بھی زیادہ ہمالیہ کے اندر چلی جاتی ہے جو سندھ کے دوسری طرف واقع ہے۔ مالاکنڈ کی چوٹی کے قریب بارہ ہزار فٹ اونچا درّہ بروغل ہے۔ جو واخان پٹی سے گذرتا ہوا چین اور روس تک چلا جاتا ہے۔ شمالی ترین ریاست، چترال گہری وادیوں

اور اونچی چوٹیوں کی سرزمین ہے۔ اسے دس ہزار فٹ سے زیادہ اونچا درّہ لواری باقی ایجنسی سے جُدا کرتا ہے۔ درّے میں جیپ کا راستہ ہے لیکن یہ سال کا بیشتر حصہ برف آلُود ہوتا ہے۔ چترال کے جنوبی حصے میں گھنے جنگلات سے بھرپور پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں جو دیر، سوات اور باجوڑ تک چلی جاتی ہیں جہاں سوات اور پنجکورہ دریاؤں نے خوب کشادہ اور زرخیز وادیاں پیدا کر دی ہیں۔ دیر ابھی تک الگ تھلگ اور پسماندہ ہے لیکن سوات میں ایک ترقی پسند حکومت سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے ہیں مشمول یہ ۳۶۰ میل لمبی موٹر کے لائق سڑک۔

دیر سے نیچے مہمند علاقہ ہے جو قریبًا سب کا سب چھوٹی چھوٹی، ٹوٹی پھوٹی اور چٹیل پہاڑیوں پر مشتمل ہے جو افغانستان کے اندر تک چلی جاتی ہیں اور کاشت کاری یا رسل و رسائل کا کوئی موقع نہیں دیتیں۔ یہ پست پہاڑ جو اس مقام پر خیبر کی پہاڑیاں کہلاتے ہیں جنوب کی طرف چلتے رہتے ہیں اور صرف مشہور درّہ ہی انہیں کاٹتا ہے جو کابل دریا کی تنگ گھاٹی کے جنوب میں چند میل تک ان میں بل کھاتا ہے۔ اس سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی طرطرّہ ہے جو قریبًا ۶۸۰۰ فٹ بلند ہے۔

درّہ خیبر کے جنوب اور مغرب میں تیراہ کی چھوٹی چھوٹی زرخیز وادیاں کوہ سفید کی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ پہاڑیوں اور

گھاٹیوں کے ایک دشوار گزار جال میں پھیلی ہوئی ہیں اور کوہِ سفید
افغان سرحد کے عین مغرب کی طرف واقع ہے۔ سرے پر ۱۵۶۰۰
فٹ اونچا کوہ سفید نیچے درّہ پیوار کوتل کا نگہبان ہے جو افغان سطح
مرتفع سے زرخیز وادئ کرّم میں داخلے کا راستہ ہے۔ کرّم ایجنسی دریا
کے ساتھ ساتھ جنوب مشرق کی طرف چلتی ہے اور اسے پہاڑیوں
کی ایک شاخ بالائی اور زیریں وادی میں تقسیم کر دیتی ہے حتیٰ کہ دریا
بنّوں کے میدان میں داخل ہو جاتا ہے۔ کرّم قبائلی علاقے میں زرخیز
زمین ہے اور پھل اور طبی فوائد کے پودے، آرٹیمیسیا کی بھرپور فصلوں
کا گھر ہے۔

کرّم سے نیچے وزیرستان کی پہاڑیاں ہیں۔ ان میں سے صرف
چند چوٹیاں ہی ۸ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہیں لیکن وزیر پہاڑیاں اتنی
سخت اور ٹوٹی پھوٹی ہیں کہ علاقے کے بہت سے حصے صرف پیدل
ہی طے کئے جا سکتے ہیں۔ دریائے ٹوچی افغان سرحد سے شمالی
وزیرستان میں واقع بنّوں شہر کے درمیان ایک خاصی سیدھی رَو
کی صورت میں بہتا ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ دَوَر آباد ہیں اور تنگ
وادی انہی کے نام سے موسوم ہے۔ کرّم کی طرح یہ وادی بھی پہاڑیوں
کی ایک شاخ کی بدولت بالائی اور زیریں حصّوں میں تقسیم ہے جو
دریا کے پاٹ تک آ جاتی ہے۔

مزید جنوب میں ڈھلوان گھاٹیوں کا ایک سلسلہ کنی گورم سے

جوالجھی ہوئی پہاڑیوں کے وسط میں واقع ہے، وانا کے میدان تک

جاتا ہے۔ جس کے ارد گرد جنوبی وزیرستان ایجنسی مرکوز ہے دریائے

گومل بھی وقفے وقفے سے جنوبی علاقے کی پہاڑیوں کو کاٹتا ہے۔

اور یوں افغانستان سے ڈیرہ اسماعیل خان، بلوچستان اور زیریں

پنجاب کو جانے والا ناہموار لیکن کثیر السفر راستہ مہیا کرتا ہے

بعض اونچی اونچی پہاڑیوں پر جنگلات ہیں اور کنی گورم کے

ارد گرد کا نیم سطح مرتفع کا علاقہ کاشت کاری کے لئے کچھ جگہ

دے دیتا ہے لیکن وزیر پہاڑیاں وادی کرم کے جنوبی پہلو میں اپنی

ابتدا سے لے کر مشہور تخت سلیمان کے قریب کوہ سلیمان کے ساتھ

انضمام تک زیادہ تر بنجر اور چٹیل ہیں اور صرف تخت سلیمان ہی

ڈیرہ جات میں ایک نظر افروز مقام ہے۔ وزیر پہاڑیوں میں بارش

برائے نام ہوتی ہے اور درجات حرارت ۱۳ سے لے کر ۱۲۲ تک

ہوتے ہیں۔

حمل ونقل اور رسل ورسائل

ایک اچھی پختہ شاہراہ مالاکنڈ سے جنوب کی طرف سب

ضلعوں سے گزرتی ہوئی دریائے سندھ پر واقع ڈیرہ اسماعیل خان

تک جاتی ہے لیکن یہ شمالاً جنوباً سڑک اس لئے نہیں بنائی گئی

تھی کہ زمین کے قدرتی رسل ورسائل اور حمل ونقل کے راستوں سے

فائدہ اٹھا سکے جو شر قاً غرباً چلتے ہیں بلکہ انہیں کاٹنا اور قابو کرنا
مقصود تھا۔ اس طرح یہ سڑک برطانوی ہند کے سامراجی دفاع کے
تقاضے پوری کرتی تھی جو مستقل نگرانی رکھتا تھا مبادا کوئی خطرناک یا
ناخوشگوار عنصر سرحد سے داخل ہو کر کسی قدرتی راستے سے گزرتا
ہوا (جو سرزمین کی ڈھلان کے مطابق ہیں) سندھ اور ہندوستان
تک پہنچ جائے۔ چونکہ یہ درّے اور دریائی وادیاں تاریخ میں اتنا
اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں اور وحشیانہ پہاڑی رکاوٹ (جن سے یہ
گزرتے ہیں) یہ زندگی کی بقا کے لئے اتنے ضروری ہیں لہٰذا وہ
اب بھی اپنی اہمیت کے مالک ہیں۔

خیبر

ان میں سے تاریخی ترین بلکہ شاید دنیا بھر کے تمام درّوں
میں تاریخی ترین خیبر ہے جو پہاڑیوں کو بتیس میل تک کاٹتے ہوئے
پشاور اور کابل کے درمیان قریباً ایک خطِ مستقیم کی طرح گذرتا ہے
اب ایک جدید دوہری سڑک اس کی پوری لمبائی سے گزرتی ہے
لیکن پھر بھی خیبر پُر جوش ترین، رومان پسند کے لئے بہت صبر آزما
اور قلعہ بند ہے۔ لیکن اس کے اعداد و شمار غیر مؤثر ہیں۔ یہ اپنی چوٹی
پر ۳۳۷۳ فٹ اونچا، مشرقی دروازے پر ۱۶۷۰ فٹ اور مغربی
دروازے پر ۲۴۰۲ فٹ اونچا ہے۔ آسان رسائی کی وجہ سے خیبر

ہمیشہ وسط ایشیا سے ہندوستان کی شاہراہ رہا ہے۔ آج کل بھی ہر قسم کی تجارت و مواصلات مابین پاکستان و افغانستان کے لئے یہ بیحد اہم ہے۔

اس علاقے کی پہاڑیوں میں ایک اور متبادل لیکن قلیل السفر راستہ ملاگوری روڈ بھی ہے جو خیبر سے قریباً دس میل شمال میں پہاڑیوں کی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔

دریائے کابل خیبر سے چند میل شمال میں پہاڑیوں سے نکلتا ہوا میدان پشاور کو جاتا ہے لیکن یہ رسل و رسائل کا ذریعہ اس لئے نہیں بن سکتا کہ اس کی رَو بہت تیز اور گھاٹی بہت تنگ ہے لیکن دریائے کابل کو جلال آباد (افغانستان) میں چھوڑ کر شمال اور مشرق میں دریائے کنُر کے راستے دیر اور مہمند علاقے کے مقابل پہنچا جا سکتا ہے جہاں سے متعدد تراشیدہ راستوں کے ذریعے سرحدی پہاڑیوں میں سے گزرا جا سکتا ہے۔ سکندر نے ہندوستان میں آمد کے لئے یہی راستہ اختیار کیا۔ اسے اب بھی بعض پوندے استعمال کرتے ہیں جو ہر سال سرحد سے پاکستان میں ٹڈی دل کی طرح آتے ہیں۔

کرّم

مزید جنوب میں وادی کرّم کی چوٹی پر واقع پیوار کوتل ایک اور متبادل راستہ ہے۔ اسی راستے سے افغانستان کا نادر خان ۱۹۱۹ء

ہیں اپنے لشکروں کے ساتھ تیسری جنگ افغان میں تھل پر قبضہ کے لئے آیا تھا۔ گو یہ قبضہ بہت مختصر ثابت ہُوا۔ کرم نسبتاً آسان راستہ ہے لیکن یہ وسط ایشیا سے برصغیر کی شاہراہ سے دُور ہے لہٰذا صرف مقامی ٹریفک کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ٹوچی

دریائے ٹوچی (جسے گمبیلا بھی کہتے ہیں) شمالی وزیرستان میں واقع دُور وادی میں سے بہتا ہے۔ وادی کے نچلے حصّے میں بنوں اور میرانشاہ کے درمیان موٹر کی سڑک ہے اور پوندوں کا یہ مقبول ترین راستہ ہے۔ ایک اور پختہ سڑک میرانشاہ سے جنوب کی طرف رزمک کو جاتی ہے جو وزیرستان کے وسط میں واقع ہے اور یہاں سے جنوبی وزیرستان ایجنسی میں واقع جنڈولا کو چلی جاتی ہے۔ یہ سڑک انگریزوں نے چوتھے عشرے میں بہت سے مصائب و نوائب اور اخراجات کے بعد بنائی تھی تاکہ وزیرستان کو فوجی کارروائی کے لئے کھولا جا سکے۔ اسے ۱۹۷۷ء کے بعد استعمال نہیں کیا گیا جب پاکستان نے رزمک میں متعینہ فوج کو واپس بلا لیا۔

گومل

دریائے گومل یا لوُنی میں شاذونادر ہی پانی ہوتا ہے گو اس

کی گزرگاہ افغان سرحد کے پرے سے شروع ہو کر ڈیرہ اسماعیل خان کے قریب دریائے سندھ تک آتی ہے۔ سرحدی پہاڑیوں میں یہ سب سے الگ تھلگ اور خطرناک راستہ ہے تاہم ہزاروں پوندے اسی سے سندھ اور زیریں پنجاب میں آتے ہیں۔

سرحد بحیثیت ایک رکاوٹ

سرحدی پہاڑیوں کے متعلق غالباً اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ رکاوٹ ہونے کے باوجود یہ بہت سی صفات کی حامل ہیں۔ اولاً یہ آباد ہیں اور ڈھائی ملین لوگ صرف قبائلی علاقے میں ہی بستے ہیں ثانیاً ان میں سے بہت سے قدرتی راستے ہیں جن میں سے ایک خیبر بھی ہے۔ ثالثاً کوئی طاقت مشمولہ برطانوی حکومت اپنے عروج پر بھی ان پہاڑیوں کے درّوں اور لوگوں پر کبھی اپنا مکمل تسلط نہیں جما سکی۔ بیسویں صدی کے اوائل کے ہندوستانی وائسرائے، لارڈ کرزن نے ان حقائق کو تسلیم کیا اور باقاعدہ طور پر قبائلی علاقے کو باقی ہندوستان سے کاٹ دیا تاکہ یہ سرحدی علاقہ ہی رہے جو پوری تاریخ میں اس کا کردار رہا ہے۔

ب۔ خلاصۂ تاریخ

گندھارا یا بوستان پہلی دفعہ تاریخ میں چھٹی صدی قم میں

نمودار ہوتا ہے۔ جب یہ داریوش ہس ٹیٹس کی ایرانی سلطنت کے صوبہ اراکوشیا کا ایک حصہ تھا۔ اس میں پشاور اور مردان کے موجودہ اضلاع کوہاٹ کا حصہ، مہمند علاقہ، سوات، باجوڑ اور بنیر شامل تھے۔ اس کا دارالحکومت مختلف اوقات میں پرشس پورہ یا پشاور اور پشکالاوتی رہا جو پشاور کے شمال میں چند میل کے فاصلہ پر تھا۔ گندھارا کے لشکر زرکیسز کے حملہ یونان میں شامل تھے اور ہیروڈوٹس، ٹالمی (بطلیموس) اور سٹرابو اس کے لوگوں کو گندھارزئی یا گندھاری پکارتے ہیں[1]۔

یونانی

سکندر اعظم نے ہندوکش کے بڑے سلسلے کو ۳۲۷ ق م کے موسم بہار میں عبور کیا اور اپنی فوجوں کو تقسیم کر کے سرحدی پہاڑیوں میں داخل ہوا۔ وہ خود ایک دستے کے ساتھ دریائے کنڑ سے اوپر گیا اور مہمند علاقہ اور دیر سے گزرنے والے کسی درے سے سوات میں داخل ہوا۔ دیگر دستے خیبر سے گزرے اور مزید کچھ اور دریائے کابل کی گھاٹی سے' دوسری طرف سکندر نے پانچ چھ سخت معرکے لڑے اور علاقے کو

۱۔ خلاصۂ تاریخ مختلف ذرائع پر مبنی ہے لیکن زیادہ تر استفادہ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، چھ جلد سے کیا گیا ہے (کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۹۳۷) اور بیان ہٰذا عموماً اسی کے عین مطابق ہے۔

فتح کرکے اس نے میکاٹور (نکاٹور) کو بطور خشتراپون چھوڑا اور اٹک کے قریب سندھ کو عبور کرکے ہندوستان کی طرف بڑھنے لگا۔

دس سال کے اندر اندر گندھارا سکندر کے نائبین سے آزاد ہوگیا گو بالائی وادئ کابل سلیوکس کے قائم کردہ یونانی خاندان کے ماتحت رہی۔ ہندوستان کے پہلے عظیم مقامی حکمران چندر گپت موریا نے گندھارا کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اور اس کے پوتے اشوک نے بدھ مت کو لوگوں کا اکثریتی مذہب بنا دیا۔

اشوک کی موت کے بعد یونانی ایک دفعہ پھر باختر (موجودہ افغان شہر بلخ) سے یہاں وارد ہوئے اور پہلے ڈیمیٹروس اور پھر یوکریٹائیڈز نے گندھارا پر حکومت کی۔ دوسری صدی قم کے وسط کے قریب باختریوں کی حکومت ملوک الطوائف میں بٹ گئی جن کے یونانی نقوش اور نام اب بھی وادئ پشاور میں بکثرت پائے جانے والے بے شمار ہر وضع کے سکوں پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ان باختریوں پر جلد ہی وسط ایشیا سے آنے والے پارتھیوں اور ساکوں نے حملہ کر دیا۔ باختری بالآخر سن عیسوی کے اوائل کے قریب کشانوں سے مغلوب ہوگئے جو وسط ایشیائی خانہ بدوشوں کی ایک سخت جان نسل یوچی کا طاقتور ترین طائفہ تھے اور جن کے مشہور ترین بادشاہ کنشک نے شمال مغربی ہندوستان میں ایک سلطنت قائم کی جو وادی پشاور میں مرکوز تھی۔ یوچی کے مختلف طائفے اس

وادی پر بالادست رہے حتیٰ کہ غالباً چھٹی صدی عیسوی میں ایپھتے لائٹ یا سفید ہنوں نے ایران کے ساسانیوں کے ساتھ جنگ کے دوران یہاں بھی یوچی کا صفایا کردیا۔

سفید ہنوں نے یونانی و بدھ ثقافت کو تہ و بالا کردیا جو سکندر، موریوں، باختریوں اور کشانوں کی آویزش و آمیزش سے ظہور پذیر ہوئی تھی۔ اس ثقافت کو عموماً "گندھارا" کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور اس کے تعمیر کردہ وہارو انصار سینکڑوں سال تک اس علاقے میں پھلتے پھولتے رہے۔ چینی بدھ یاتری، فاہین ۴۰۰ء میں گندھارا آیا تو وہ یہاں کے وہاروں (خانقاہوں) کی دولت و ثروت اور ترقی و ترفع دیکھ کر ششدر رہ گیا لیکن جب ایک اور چینی سیاح ہیون سانگ آٹھویں صدی کے وسط میں گندھارا سے گزرا تو اسے صرف ویران کھنڈرات ہی نظر آئے۔

اگلے تین سو سال کے دوران جب اسلام کی بنیاد ڈالی گئی اور یہ مشرق کی طرف پھیلنے لگا تو سرحد چھوٹے چھوٹے ہندو راجوں اور وسط ایشیائی خانہ بدوشوں کے سرداروں کے درمیان میدانِ جنگ بنا رہا۔

آٹھویں صدی کے آخر تک اسلام نے بحیرہ عرب کے ساحل سے سندھ پر اپنا اثرورسوخ قائم کرلیا تھا لیکن دسویں صدی میں مسلمانوں کے ایک ترک خاندان نے جس نے شاہانِ سامانی کی خدمت

کی تھی۔ غزنی (افغانستان) میں اپنا اڈہ جما لیا جو سرحدی پہاڑیوں
سے دیکھا جا سکتا ہے۔

محمودؒ غزنوی

اسی خاندان کا ایک چشم و چراغ محمود ۹۹۸ء میں سلطان
غزنی بنا۔ جس کا باپ اس سلطنت کی توسیع کے لئے ایک سلسلۂ
فتوحات شروع کر چکا تھا۔ محمود نے بغداد کے خلیفۃ المسلمین سے
سندِ سلطنت حاصل کر لی اور اس کے فوراً ہی بعد اس نے ہندوستان
پر یکے بعد دیگرے اپنے حملے شروع کئے جن کی بنا پر وہ "بُت شکن"
مشہور ہوا۔ محمود کی پہلی بڑی لڑائی ۱۰۰۱ء کے موسم خزاں میں پشاور
کے قریب ہی ہوئی۔ جس میں اس نے راجہ جے پال کو شکست دی۔
پانچ سال بعد اس نے اس کے جانشین انند پال کو اسی مقام پر
شکست دی اور سرحد کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔

محمود کے دور میں ہی افغانوں کا نام من حیث القوم پہلی
دفعہ منظرِ تاریخ پر آیا جو غزنی اور کوہِ سلیمان کے درمیان کی پہاڑیوں
میں آباد تھے۔ اسلام پہلے ہی ان پہاڑیوں میں کسی حد تک نفوذ کر
چکا تھا اور گو وہ پہلے محمود کے خلاف تھے تاہم قبائل جلد ہی "بُت
شکن" کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور اسلام کے نام پر خوشی خوشی
اس کے ہندوستانی حملوں میں شریک ہو گئے۔

محمد غوری

جب دریائے کابل کے شمال میں غزنی سے چند سو میل دور واقع غور کے جنگجو سردار محمد نے ۱۱۷۳ء میں غزنوی سلطنت کے بچے کھچے حصوں پر قبضہ جما لیا تو پہاڑی قبائل نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ بعض مصنفین کے مطابق محمد غوری خود بھی ایک افغان تھا لیکن عام طور پر اسے ایک مشرقی ترک سمجھا جاتا ہے۔ محمد نے ۱۱۷۹ء میں پشاور پر تصرف جمایا اور اہل کوہ نے شہر کی لوٹ مار میں بھی یقیناً حصہ لیا اور ہندوستان پر محمد کے دیگر حملوں میں بھی۔

محمد غوری کے وفات کے بعد اس کا جانشین تاج الدین یلدوز وادی کرم سے غوری سلطنت پر حکومت کرتا رہا۔ ۱۲۱۵ء میں خیوا کے ترک سلطان نے تاج الدین کو ہندوستان میں دھکیل دیا۔ لیکن وہ سرحد میں بھی چنگیز خان کے سامنے نہ ٹھہر سکا جس نے ۱۲۲۱ء میں اپنے منگولوں کے ساتھ ہندوستان پر پہلی یورش کی۔ اگلی دو صدیوں میں زور آور افغان قبائل نے اپنے سنگلاخ علاقے سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے منگول لشکروں کو آتے جاتے خوب تنگ کیا اور سرحد پر قبضہ جمانے کے لئے ترک سلاطین دہلی کی کوششوں کو ناکام بنا دیا جو محمد غوری کی سلطنت کے مشرقی حصوں کے وارث بنے تھے۔

تیمور

تیمور لنگ ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے سمرقند سے نکلا۔ اس نے چترال کو تہ و بالا کیا اور پنجاب میں سے دندناتا ہوا دہلی پہنچا اور اسے لوٹا۔ وہ ۱۳۹۹ء میں بنوں کے راستے واپس ہوا۔ افغان جو اب اپنے پہاڑی اڈوں سے نکل کر کوہاٹ اور بنوں کے اردگرد قلعے بنا چکے تھے تیمور کے سفر واپسی میں بڑی طرح حائل ہوئے۔

تیمور نے شمالی ہندوستان کو انتشار و خلفشار میں چھوڑا۔ بعد کے سالوں میں کئی سرداروں نے علاقے کے مختلف حصوں میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں۔ انہی میں سے ایک مشہور ترین سردار افغان بہلول لودھی تھا۔ ۱۴۵۱ء میں بہلول نے دلّی پر قبضہ کیا۔ اور ایک افغان خاندان کی بنیاد ڈالی جو ۷۵ سال تک حکمران رہا پوری افغان نسل اس کے وقار میں شریک رہی اور زیادہ سے زیادہ افغان افغانستان کی سطوح مرتفع سے سرحدی پہاڑیوں اور پھر یہاں سے ہندوستان میں وارد ہوتے رہے۔ اس نقل مکانی کو اس وجہ سے مزید تقویت ملی کہ تیموری خاندان کا ایک نمائندہ الغ بیگ کابل پر حکمران تھا اور یوں مغرب سے دباؤ بڑھ گیا تھا۔

بابر

تیمور کے اخلاف میں سے ایک اور فرغانہ سے وسط ایشیا میں
نمودار ہوا۔ یہ بابر تھا، ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کا بانی، جو کابل
میں مدفون ہے۔ بابر نے ۱۵۰۴ء میں کابل پر قبضہ کیا اور جنوری
۱۵۰۵ء میں اس نے ہندوستان پر پہلا حملہ کیا۔ وہ درہ خیبر، کوہاٹ
اور بنوں سے ڈیرہ جات میں آیا۔ کوہاٹ سے باہر اس نے ایک
قبائلی کیمپ گاہ کو تباہ کیا اور یہاں بھی اور ہانگو میں بھی اس نے
اپنے لوگوں کی رسم کے مطابق شکست خوردہ دشمنوں کے سروں کے
مینار بنائے۔ بنوں میں ایک اور خونیں مینار کھڑا کیا گیا لیکن
یہاں بابر نے اپنے بعض دشمنوں کو معاف کر دیا جو اپنے دانتوں
میں گھاس لے کر اس کے سامنے حاضر ہوئے گویا وہ اس کی
گائیں تھیں۔ روز روشن میں افغانوں کو مارتے ہوئے اور
تاریکیٔ شب میں ان سے مار کھاتے ہوئے اس نے عید الفطر گومل
کے کناروں پر منائی۔ اپنے بابر نامہ میں وہ اپنی فوج پر ان سر بکف
افغانوں کے انفرادی حملوں کا بہت احترام سے ذکر کرتا ہے۔ ✮

✮ ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ، بابر نامہ، مترجمہ اے ایس بیورج، ۴ جلدیں،
ایک جلد میں مکمل (لندن، لوزاک ۱۹۲۲ء) ص ص ۲۲۹ تا ۲۴۰

مئی ۱۵۰۵ء تک بابر کابل واپس چلا گیا اور اپنے آباؤ اجداد کی شکستہ و ریختہ سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کرنے لگا۔ اکتوبر ۱۵۱۱ء میں اُس نے سمرقند میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور اس کی حکومت بخارا، تاشقند، فرغانہ اور کابل پر قائم ہو گئی۔

جنوری ۱۵۱۹ء میں بابر سرحدی پہاڑیوں سے گزرتا ہوا باجوڑ پہنچا۔ اپنی بندوقوں کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے جنہیں افغانوں نے کبھی نہ دیکھا تھا اس نے علاقے کے بڑے قلعے پر حملہ کیا اور اس کے اپنے اندازے کے مطابق اس نے تین ہزار مرد باشندے موت کے گھاٹ اتار دیئے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔ بابر نے ایک یوسفزئی سردار کی بیٹی بی بی مبارکہ سے شادی کی، صوابی میں گینڈوں کا شکار کیا، اٹک کے قریب ایک شیر مارا، سندھ پار کر کے ایک چھوٹا سا حملہ کیا اور اپریل میں واپس کابل چلا گیا[1]

اس نے بعد میں کئی حملے کئے جن کے دوران اس نے پنجاب پر نیا تسلط جمایا اور ۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء کو دہلی کے قریب پانی پت کے میدان پر لودھی سلطان کے لشکر کو شکست دے کر ہندوستان کی عظیم سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔

---

[1] بابر، مذکورہ بالا کتاب، ص ص ۳۶۷ تا ۳۹۵

۱۵۳۰ء میں اس کی وفات تک سرحد پہ بابر کا قبضہ برائے نام ہی تھا۔ پھر افغانوں نے فوراً ہی بغاوت کر دی اور یہ علاقہ کبھی ایک اور کبھی دوسرے افغان سردار کے تحت رہا سوائے ۱۵۵۲ء تا ۱۵۵۶ء کے مختصر عرصہ کے جب بابر کا بیٹا ہمایوں پشاور پہ قابض رہا۔

شیر شاہ سوری

ان افغان سرداروں میں عظیم ترین، شیر شاہ تھا، سور قبیلے کا جو بہار کے ایک گمنام ضلعے کی جاگیرداری سے اٹھ کر قریباً پورے شمالی ہند کا شہنشاہ بن گیا۔ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ نے جس کا دادا پشاور کے قریب سے ہجرت کر کے دہلی کے لودھی سلاطین کے صیغۂ ملازمت میں چلا گیا تھا۔ ہمایوں کو گنگا کے کنارے پر شکست فاش دی اس کے بعد وہ پانچ مختصر سالوں کے لئے حکمران رہا حتےٰ کہ ایک بارودی دھماکے میں مارا گیا۔ ان پانچ سالوں میں اس نے اپنی براہ راست نگرانی میں ایک بے حد کارگزار افسر شاہی قائم کی جیسی اس کے بعد کبھی نہ دیکھی گئی حتےٰ کہ برطانوی حکومت کے عروج پر پھر نظر آ سکی۔ محصولاتی نظام اس طرح ترتیب دیا گیا کہ تجارت کو فروغ حاصل ہو۔ زمینی لگان کے نظام کی اصلاح کی گئی۔ پولیس اور عدالتی نظام از سر نو منظم کئے گئے۔ ٹیکس سختی لیکن انصاف

سے وصول کئے جانے لگے۔ سڑکوں کا ایک حیرت انگیز جال بچھا دیا گیا اور ہندوستان پشاور تا بنگال اپنی مشہور جرنیلی سڑک کیلئے شیر شاہ کا ہی مرہونِ منت ہے۔

مُغل

شیر شاہ کی موت کے بعد اس کی سلطنت کا شیرازہ بہت جلد ہی بکھر گیا کیونکہ اس کے متعلقین و نائبین مالِ غنیمت پر لڑتے رہے ۱۵۶۰ء میں عظیم ترین مغل، اکبر اپنے والد ہمایوں کا جانشین ہوا۔ لیکن اکبر بھی ۱۵۸۵ء سے پہلے پشاور پر اپنی شاہی گرفت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا جب اس نے اپنے راجپوت جرنیل کنور مان سنگھ کو وہاں گورنر لگایا۔ اگلے ہی سال قبائلیوں نے پیر روشن کی تعلیمات سے مشتعل ہو کر جس نے کوئی چالیس سال پہلے سرحد میں ایک ملحدانہ فرقے کی بنیاد ڈالی تھی علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ مہمند جنوب کی طرف بڑھے، خیبر کو بند کر دیا اور مان سنگھ اور اس کے راجپوتوں کو پشاور سے نکال باہر کیا۔ ۱۵۸۷ء میں اکبر خود ایک لشکرِ جرار کے ساتھ سرحد آیا تاکہ باغیوں کی سرکوبی کر سکے۔ اس نے ایک فوج اپنے قابل اور با اعتماد مشیر، بیربل کے تحت سوات اور باجوڑ میں بھیجی جسے یوسفزئیوں نے تباہ کر دیا اور آٹھ ہزار مغل مارے گئے۔ بالآخر ٹوڈرمل نے جو

اکبر کا ایک عظیم ہندو جرنیل تھا، کسی نہ کسی حد تک امن وامان قائم کیا جس نے ناکہ بندی مؤثر ہتھیار سے قبائلیوں کے خلاف جوابی کارروائی کی لیکن پھر بھی قبائل نظم ونسق کے مضبوط رشتہ میں نہ پروئے جا سکے۔

اس کے بعد قبائلی مغلوں سے تقریباً مسلسل برسرِ پیکار رہے ۱۶۲۰ء میں انہوں نے ایک اور مغل لشکر کو تباہ کر دیا جو تیراہ پر حملہ کی کوشش کر رہا تھا جہاں پر روشن کے مرید جمع ہو گئے تھے۔ ۱۶۲۷ء میں شہنشاہ جہانگیر کی موت پر ایک عام بغاوت ہو گئی ۱۶۳۰ء میں پشاور کی شاہی فوج کئی مہینے محصور رہی۔ ۱۶۳۲ء اور ۱۶۶۰ء میں مغل افواج نے تیراہ پر قبضے کی ناکام کوششیں کیں۔ ۱۶۶۷ء میں یوسفزیوں نے شرق سندھ کے ضلع ہزارہ پر حملہ کیا اور مغلوں کے مرکز رسل ورسائل کو خطرہ پیدا ہو گیا۔
۱۷ ویں صدی میں پہاڑیوں میں آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور شاید ہی کوئی ایسا سال گزرا کہ مغلوں کو ہندوستان میں اپنی سلطنت کے استحکام سے نظر ہٹا کر سرحدی پہاڑیوں میں کسی نہ کسی بغاوت کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ انہوں نے وہ تمام طریقے استعمال کئے جنہیں انگریزوں نے ۲۵۰ سال بعد اختیار کیا یعنی وظائف ناکہ بندی، متحرک دستے، بڑی بڑی قلعہ بند افواج* ان میں

*۔ دور اورنگزیب (۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷) میں قبائل کے لئے سالانہ وظائف تقریباً ۶ لاکھ روپے سالانہ تھے

کوئی بھی کامیاب نہ ہوا اور جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ مغل سلطنت اسی وقت مرجھانے لگی جب یہ اپنے مضبوط وسط ایشیائی سرچشموں سے کٹ گئی تو اس صورت میں سرحدی قبائلیوں نے اسے موت کی نیند سلانے میں اہم کردار ادا کیا۔

برسبیلِ تذکرہ یہ قابلِ ذکر ہے کہ پٹھانوں نے اپنی سرگرمیاں صرف اپنے ہی علاقے تک محدود نہیں رکھیں۔ محمود غزنوی کے زمانے سے پٹھان افراد اور خاندان ہندوستان کی طرف ہجرت کرتے رہے تھے۔ دہلی کے افغان سلاطین کے تحت بشمولہ بہ دورِ شیر شاہ سوری اسے ایک تازیانہ لگا۔ مغل دور میں بھی یہ جاری رہی اور اٹھارھویں صدی میں نادر شاہ اور احمد شاہ کی مختصر لیکن بسیط فتوحات سے پیدا ہونے والے انتشار و خلفشار میں یہ اور بھی بڑھ گئی۔ اپنی سرحدوں سے باہر پٹھانوں کی کامیابی کی نمایاں مثالیں ٹونک اور روہیل کھنڈ کی ریاستیں تھیں جن کے حکمران اپنے پٹھان مآخذ کی روایات کو سختی سے برقرار رکھتے تھے آج بھی لبدکے ہندوستان کے متعدد چھوٹے چھوٹے اشراف و اکابر اپنے پٹھان حسب و نسب پر فخر کرتے ہیں۔ لیکن ان تارکِ وطن پٹھانوں کی سرگرمیاں اس کتاب کے احاطہ سے باہر ہیں۔

عظیم بغاوت

۱۶۷۲ء کے موسمِ بہار میں کابل کا مغل گورنر روانہ ہُوا تاکہ پایۂ تخت دہلی کے ساتھ رسل و رسائل کو یقینی بناسکے، اس نے خیبر سے اپنی فوج گزاری جہاں آفریدی بار بار شاہی حقِ آمد و رفت کو سلب کر رہے تھے۔ ان قبائلیوں نے اس فوج کو یکم مئی کو علی مسجد پر محصور کر لیا، فراہمی آب بند کر دی اور پھر پہاڑوں سے اس پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے دس ہزار مغل سپاہی مار دیئے، ۲۰۰ ہزار آدمی اور عورتیں قید کر لئے جن میں گورنر کی والدہ، بیوی اور بیٹی بھی تھیں اور دو کروڑ روپے کا مالِ غنیمت لوٹا۔ ان کے ممتاز سردار ایمل خان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور مغلوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ اٹک سے قندھار تک پورا علاقہ ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہُوا۔ (ایمل کے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ مغل اس وقت قبائلیوں کی نسبت بہتر مسلمان تھے!)

صاحبِ سیف و قلم، خوشحال خان خٹک، جو عظیم خٹک قبیلہ کا سردار تھا جس کی زمینیں سندھ کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ مردان تا بنوں محیط تھیں، ایمل سے جا ملا اور مُغلوں کے خلاف قبائل کو متحد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگا۔

۱۶۷۳ء میں قبائلیوں نے ایک اور مغل لشکر کو گنداب

پر شکست دی۔ مارچ ۱۶۷۴ء میں انہوں نے درہ کرپا میں ایک اور فوج کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور باقی ماندہ مغلوں کو باجوڑ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

اس صورت حال میں شہنشاہ اورنگزیب خود سرحد آیا جیسے کہ اس کا پڑدادا اکبر ایک سو سال پہلے آیا تھا۔ اورنگزیب نے حسن ابدال میں اپنا ڈیرہ جمایا جو سندھ سے اکتیس میل مشرق میں ہے اور شیواجی کے تحت مرہٹوں کی طرف سے اس کی سلطنت کو متوسط ہند میں درپیش خطرے کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ڈیڑھ سال یہاں ٹھہرا تاکہ قبائلیوں کے خلاف کارروائیوں کی ذاتی طور پر نگرانی کر سکے۔

اورنگزیب کے ترک جرنیل، اولیغور خان نے غلزئیوں، شیرانیوں، یوسفزئیوں اور مہمندوں پر چھاپے مارے، ان کے علاقوں کو لوٹا اور ان کے گاؤں جلا دیئے حتیٰ کہ وہ ایک علامتِ دہشت بن گیا جیسے ۱۵۰ سال بعد ہری سنگھ کو بنیا تھا۔ تھوڑے عرصے کے لئے قبائل دم بخود رہے۔ اولیغور خیبر نہ کھول سکا اور علی مسجد کے قریب ایک لڑائی میں شکست کھا گیا۔ جون ۱۶۷۵ء میں ایک اور مغل فوج کو باجوڑ میں شکست ہوئی۔ مغلوں کو جنوب میں درہ جگداک سے بھی پسپا ہونا پڑا جسے اورنگزیب خیبر بند ہونے کے بعد کابل سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔

اورنگزیب کی قبائلی پالیسی

پھر بھی ۱۶۷۵ء کے اواخر تک اورنگزیب نے اتنا قابو پالیا تھا کہ وہ دہلی واپس جا سکا۔ اس نے یہ زورِ شمشیر سے زیادہ حُسنِ تدبیر سے حاصل کیا بہت سے قبائل وظائف کے ذریعے جیت لئے گئے۔ قبائلی سرداری کے مخالف دعویداروں کی سرپرستی کی گئی۔ غیر مختتم باہمی الگروہی حسد وبداعتمادی کو خوب ہوا دی گئی۔ شاہی جاسوس جرگوں میں نفوذ کر گئے۔ بھائی کو بھائی کے خلاف رشوت دی گئی اور بیٹے کو ابھارا گیا کہ وہ باپ کو محرومِ اقتدار کر دے۔ اورنگزیب کی روانگی تک صرف آفریدیوں اور خٹکوں کا اتحاد ہی قائم رہ سکا۔

اورنگزیب کی پالیسی کو کابل کے فطین گورنر، امین خان نے جاری رکھا جو ۱۶۷۷ تا ۱۶۹۸ء اس منصب پر رہا۔ امین خان قبائلیوں کے اندرونی معاملات میں بھی دخیل ہوا اور نہایت پُرکاری سے ان کی قوتوں کو بین الاقوامی مناقشات کی راہوں پر ڈالتا رہا اور وظائف بھی پانی کی طرح بہاتا رہا۔ اس نے قبائلی وفاق منظم کرنے کے سلسلہ میں ایمل خان کی آخری کوشش کو بھی یوں ناکام بنا دیا کہ قبائلی سردار لڑائی سے پہلے لوٹ مار کی تقسیم کا مقابلہ کرنے پر اڑ گئے۔ وہ آفریدیوں اور خٹکوں کے درمیان تفرقہ اندازی

کے لئے انتھک کام کرتا رہا اور جب ایمل خان مرا تو آفریدیوں نے مغلوں کے خلاف جنگ کو خیر باد کہہ دیا۔ خوشحال خان اکیلا بیٹوں کی غداری، اتحادیوں کی علیحدگی اور مغلوں کے مسلسل تعاقب کے باوجود کئی سال تک لڑتا رہا حتیٰ کہ ۱۶۹۱ء میں وہ قابلِ فخر اور خوددار موت کی آغوش میں چلا گیا۔

اورنگزیب کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی نہ طبعزاد تھی نہ بے مثال لیکن برف مزاج مغل نے اسے اپنے پیشروؤں اور جانشینوں کی نسبت حتیٰ کہ انگریزوں کے مقابلے پر بھی زیادہ ثابت قدمی اور سائنسی طریقے سے لاگو کیا۔ اس پالیسی نے سرحد پر تو لاقانونی پھیلا دی لیکن مغل سلطنت کو تحفظ حاصل ہو گیا۔ کابل کے مواصلاتی راستے کھلے رکھے گئے اور قبائلی کبھی اتنے متحد نہ ہو سکے کہ وہ ایک مہیب بغاوت کر سکتے اور ہندوستان کے زرخیز صوبوں کے لئے خطرہ بن جاتے۔ لہٰذا یہ پالیسی بعد کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ایک دقیانوسی پس منظر سے ابھرتے ہوئے قبائلی لوگوں کے درمیان قدرتی داخلی شبہات و اختلافات کو دیدہ و دانستہ ہوا دیکر اس پالیسی نے اس امکان کو بہت حد تک ختم کر دیا جو قبائلیوں میں قومی روح پیدا کرنے کے سلسلے میں موہوم طور پر موجود ہو سکتا تھا۔ ارد گرد کے نسبتاً ترقی یافتہ علاقوں سے سرحد کا الگ تھلگ پن دائمی بنا کر اور رنگ برنگے ایک

قسم کے ملک یے مالک کا وجود یقینی بنا دیا جو آج تک قائم ہے ۔
ایک ایسی سرزمین جس کے لوگ خرف کسی بھی اور تمام غیر ملکیوں
کے خلاف مشترکہ مخاصمت سے ہی متحد ہیں ۔

۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کی وفات کے بعد مغل حکومت
ہندوستان بھر میں بہت تیزی سے انحطاط پذیر ہو گئی ۔ اٹھارہویں
صدی کے پہلے ربع تک شرق سندھ پر قبائلی چھاپے بھر عام ہو
گئے ۔

نادر شاہ

مغرب سے ایک اور فاتح کی آمد کے لئے وقت سازگار
تھا ۔ یہ نادر شاہ ترکستان کا ایک افشار ترک تھا ۔ ۱۷۳۰ء کے بعد
نادر شاہ نے محمود شاہ غلزئی کو تخت ایران سے دھکیل دیا ۔ محمود
نے اسے اٹھارہویں صدی کے شروع میں آخری صفوی بادشاہ
سے چھینا تھا ۔ ۱۷۳۶ء میں نادر نے شہنشاہ ایران ہونے کا
اعلان کیا اور اگلے سال محمود کی سرزنش کے لئے مشرق کی طرف
روانہ ہوا جو ایک قندھاری افغان قبائلی تھا ۔ ایک لمبے محاصرے
کے بعد نادر نے شہر پر قبضہ کیا اور جون ۱۷۳۸ء میں کابل فتح
کر لیا ۔ کابل میں پہنچا تو وہ اپنا اصلی مقصد بھول گیا اور فتوحات
کی روایتی شاہی سڑک پر چل پڑا ۔ وہ نومبر ۱۷۳۸ء کے آخر

میں خیبر پہنچا اور ۲۶ کو کابل کے پناہ گزین مغل والی کو مغلوب کر لیا، جس نے قلعہ جمرود پر ۲۰ ہزار افغان تنخواہ دار فوج کے ساتھ نادر کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ نادر نے پشاور پر قبضہ کیا اور سندھ پار کرنے کے لئے اٹک کی طرف چلا۔ شمالی ہندوستان میں غیر منظم مغل اس کے سامنے تتر بتر ہوتے گئے۔ اور اس نے دہلی میں مارچ تا مئی ۱۷۳۹ء ڈیرے جمائے رکھے۔ اس نے مغل دارالحکومت سے ناقابلِ یقین مالِ غنیمت لیا جس میں تختِ طاؤس بھی شامل تھا اور یہ بھی اعلان کیا کہ وہ غرب سندھ کے مغل صوبہ کا الحاق کر رہا تھا۔ بے آبرو مغل شہنشاہ کو حکومت کرنے کے ڈھنگ پر ایک ناصحانہ لیکچر پلانے کے بعد اس نے دارالسلطنت پر قبضہ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا، اور واپس ایران روانہ ہوا۔ واپسی پر آفریدیوں نے خیبر بند کر دیا اور فاتح دہلی کو ایک مفرور اورکزئی نے تیراہ کے چور راستوں سے نکالا۔

احمد شاہ

نادر کی سلطنت ۱۷۴۷ء میں اس کی موت کے فوراً ہی بعد ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اس کے ایک احمد نامی نائب نے جو ابدالی قبیلہ کے سدوزئی طائفہ کا افغان تھا، ایک چھوٹی سی فوج اکٹھی کی اور اپنے ملک میں واپس چلا گیا۔ احمد نے قندھار پر قبضہ کیا اور

اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ ۱۷۴۸ء میں وہ شاہِ افغانستان بنا اور
دُرِ دُرّان کا لقب اختیار کیا۔ جس کی بناء پر ابدالی قبیلہ دُرّانی کہلانے
لگا۔ احمد شاہ نے ہندوستان پر حملوں کی تاریخی رِیت قائم رکھی اور جنوری
۱۷۶۱ء میں تیسری جنگ پانی پت میں اس نے مرہٹہ وفاقیہ کو تباہ کر
دیا، جو ہندوستان میں غالب طاقت کی حیثیت سے مُغلوں کے
جانشین بن گئے تھے۔

لیکن احمد شاہ کی اصل دلچسپی غرب سندھ میں واقع اپنے ہی
ملک میں تھی۔ اس نے کئی سو سال کے دوران وادیٔ پشاور کو پہلی
دفعہ قدرے دیرپا نظم و نسق دیا۔ اس نے دُرّانیوں کو افغانستان کا
مضبوط حاکم قبیلہ بھی بنا دیا۔ اس کے بیٹے تیمور شاہ کے تحت دُرّانی
طاقتوں اور سرداروں کے درمیان خانہ جنگی نے ایک دفعہ پھر زاجی
کیفیت پیدا کر دی، ۱۷۹۱ء میں پشاور میں تیمور پر قاتلانہ حملہ کیا
گیا اور بعد کی انتقامی کارروائیوں میں بہت سے سرحدی سردار
بالخصوص مہمند مستقل طور پر منحرف ہو گئے۔ تیمور دو سال بعد
فوت ہو گیا، اور اس کے تین بیٹوں نے جنگ تخت نشینی کی بناء
پر دُرّانی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

محمد زئی عروج ہر

سدوزئی کا خاندانی جھگڑا ۱۸۱۸ء میں ختم ہوا جب دُرّانیوں

کے برکزئی طائفہ کے محمدزئی خاندان نے بغاوت کردی ۔ اس بغاوت کے سرغنے تین بھائی تھے ، فتح خان، محمد عظیم اور دوست محمد جو خاندان کے مورث پائندہ خان کے بیٹے تھے جسے چند سال پہلے ایک سدوزئی حکمران نے تختۂ دار پر لٹکا دیا تھا۔ محمدزئیوں نے سالہا سال کی لڑائی کے بعد کشمیر اور پشاور تک اپنی سلطنت کو وسعت دی. گو سدوزئی ڈیرہ اسماعیل خان میں جمے رہے تاہم دوست محمد ۱۸۲۶ء میں تختِ کابل پر متمکن ہو گیا. پائندہ خان کے چار اور بیٹے سلطان محمد خان، یار محمد خان، سید محمد خان اور پیر محمد خان پشاور کے بالاشتراک وائسرائے بنے اور سرحدی دارالحکومت درانی سلطنت کا ایک جزو لاینفک بن گیا .

سکھ دور

دریں اثناء سکھ رنجیت سنگھ کے تحت پنجاب پر قابض ہو چکے تھے اور بہت تیزی سے شمال اور مغرب کی طرف اصلی درانی سلطنت کے دیگر حصوں کو قبضا رہے تھے . ۱۸۱۳ء میں سکھوں نے اٹک پر قبضہ کیا اور سندھ پار اضلاع پر چھاپے مارنے لگے ۔ ۱۸۱۸ء میں رنجیت ایک فوج کے ساتھ پشاور میں داخل ہوا لیکن قبضہ قائم رکھے بغیر واپس چلا گیا ، اسی سال ڈیرہ اسماعیل خان پر بھی مختصر سا قبضہ جمایا گیا' ۱۸۲۳ء میں سکھوں نے میدانِ بنوں پر اپنی سالانہ

یورشیں شروع کیں۔

رنجیت خود ۱۸۲۳ء میں سرحد واپس آیا اور نوشہرہ کے قریب ایک لڑائی میں متحدہ افغان و قبائلی فوج کو شکست دے کر پشاور پر باقاعدہ قابض ہوا، لیکن اس نے درّانی سرداروں کو ہی اپنے وائسرائے رہنے دیا۔ سات سال کی بدنظمی کے بعد مقامی قبائل برطانوی ہند کے ایک کٹر مسلمان سید احمد کی تبلیغ سے مشتعل ہو کر ایک دفعہ پھر سکھوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ۱۸۳۰ء میں سید احمد اور ان کے پیروؤں نے قبائل کی پشت پناہی کی بناء پر پشاور پر قبضہ کر لیا جو کئی ماہ تک قائم رہا۔

مئی ۱۸۳۴ء میں سکھوں کا ایک بڑا لشکر پشاور میں داخل ہوا، سرداروں کو نکال باہر کیا اور ہری سنگھ کے تحت ایک مستقل فوج قائم کی گئی۔ اس پر مئی ۱۸۳۵ء میں دوست محمد ایک فوج کے ساتھ کابل سے آیا۔ سکھوں نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ۸۰ ہزار آدمی خیبر کے مشرقی سرے پر بھیج دئیے۔ مقامی قبائل غیر جانبدار رہے۔ کوئی لڑائی نہ ہوئی جو سیاپرلان پنسلوینیا کا ایک معزز مہم جُو تھا جو رنجیت سنگھ کے ہاں ملازم تھا۔ اس نے ریشہ دوانی اور رشوت بازی کا ایسا جال بچھایا کہ دوست محمد دام میں پھنس گیا اس کی تدبیریں الٹا ہو گئیں اور وہ نرغے میں آ گیا لہٰذا وہ فوراً ہی پسپا ہو کر کابل

چلا گیا ×

۱۸۳۶ء میں سکھوں نے ڈیرہ اسماعیل خان کا باقاعدہ الحاق کر لیا اور سدوزئی نوابوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو پشاور میں محمد زئیوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ کوہاٹ میں بھی فوج تعینات کی گئی لیکن جونہی دوست محمد کی فوج اس کے بڑے بیٹے اکبر خان کے تحت اپریل ۱۸۳۷ء میں خیبر میں نمودار ہوئی اسے فوراً خالی کر دیا گیا۔ اس دفعہ قبائل نے کابلی لشکر کا ساتھ دیا اور ہری سنگھ جمرود کے قریب ایک گھمسان کی جنگ میں مارا گیا گو قلعہ پر قبضہ نہ ہو سکا۔

رنجیت سنگھ جون ۱۸۳۹ء میں مرا تو اس کی سلطنت میں قوت اور نظم و نسق باقی نہ رہا۔ لیکن پشاور میں اطالوی جرنیل ایوی ٹیبل کے تحت ایک فوج رہی اور وہ ۱۸۳۸ء تا ۱۸۴۲ء یہاں سکھوں کی طرف سے گورنر رہا۔ وہ مقامی طور پر "ابو طبیلہ"

× ہولان کے کارنامے اس کی اپنی کتاب "اے میموائرز آف انڈیا اینڈ افغانستان" فلیڈ بلفیا سے۔ ڈولیمن ۱۸۴۲ء ص ص ۱۶۲ تا ۱۶۴ اور چارلس میسن کی "نیرے ٹو آف ویر ئیس جرنیز ان بلوچستان، افغانستان اینڈ دی پنجاب" ۴ جلدیں (لندن آر۔ بینٹلی، ۱۸۴۲ء) جلد سوم ص ص ۲۳۵ تا ۲۴۵ میں پڑھے جا سکتے ہیں۔

مشہور تھا اور اس نے ایسے جبر و تشدد سے حکومت کی کہ سرحد میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ لوگ ہری سنگھ سے بھی زیادہ اس سے نفرت کرتے تھے اور دہشت کھاتے تھے۔ جابرانہ اقدامات کے باوجود اپوی ٹبیل پہاڑی قبائل کو مسخر نہ کر سکا اور علاقہ جات متعلقہ سرداروں کو بطور جاگیرات بانٹ دیا گیا یا اپنی ہی قسمت پر چھوڑ دیا گیا اور سکھ فوجیں جب بھی موقع پاتیں محصولات وصول کرنے کے لئے چھاپے مارتیں۔

۴۰ - ۱۸۳۹ء میں سکھوں نے برطانوی حکومت کا ساتھ دیا جو کلکتہ اور بمبئی سے اٹھ کر پہلی جنگ افغان کے لئے آئی اور دوست محمد کو تخت کابل سے محروم کر دیا۔ سرحد کا مستقبل جنگ کا ایک اہم مسئلہ تھا، لیکن خود اس علاقے پر لڑائی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ سکھوں کی بے ہنگم حکومت ۱۸۴۷ء تک سرحد پر قائم رہی جب سکھ سلطنت برطانوی حاکمیت کے ماتحت چلی گئی۔ اگلے دو سال تک سکھ انگریز باجگزاروں کی حیثیت سے حکومت کرتے رہے اور انگریز منتظمین ان کی مدد کرتے رہے۔ بالآخر ۳۰ مارچ ۱۸۴۹ء کے لاہور دربار میں انگریزوں نے براہ راست سرحد کا انتظام سنبھال لیا۔

باب دوم

لوگ

تعارف

پچھلے باب میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ ۱۸۴۹ء تک سرحد اور اہل سرحد پر اثر انداز ہونے والے تاریخی واقعات کا خلاصہ تحریر کر دیا جائے لیکن یہ ابھی تک مکمل طور پر واضح نہیں ہو سکا کہ یہ لوگ کون اور کیا ہیں؟ خالص سائنسی لحاظ سے یہ شاید کبھی نہ ہو سکے[1] لیکن ہمارے موجودہ مقصد کے تحت یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اہل سرحد واضح طور پر مختلف الماخذ ہیں۔ غالباً اُن کے آباؤ اجداد میں اس علاقے کے ابتدائی آریا فاتحین شامل ہیں۔ مرورِ زمان

---

[1] سرحد کے نسلیاتی مسئلہ پر ایک اچھا مختصر تبصرہ سی۔ کولن۔ ڈیویس کی کتاب "دی پرابلم آف دی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر ۱۸۹۰ء تا ۱۹۰۸ء کیمبرج دی یونیورسٹی پریس ۱۹۳۲ء کے صفحات ۳۷ تا ۴۷ پر مل سکتا ہے۔ اسی کتاب کے ضمیمہ سی میں کچھ بشریاتی اعداد و شمار بھی ملتے ہیں۔

کے ساتھ یونانی، ایرانی، ترک اور منگول حملہ آور جو سرحد سے
گزرتے رہے اپنے خون کا اضافہ کرتے رہے[1]۔ اہل سرحد پہلی دفعہ
بطور "افغان" تاریخ میں محمود کے دور میں ظاہر ہوتے ہیں جو شرق
غزنی میں کوہ سلیمان میں رہنے والے بیتاآفریں لوگ تھے۔ جیسے
جیسے ان کی تعداد بڑھی اور وہ زور پکڑنے لگے تو ان کے اہم حصے بھی
منظر عام پر آنے لگے۔ مثلاً پہلے باب کے تاریخی خلاصہ سے یہ ظاہر ہو
جاتا ہے کہ لودھی اور درّانی شرفا جو دہلی اور کابل کے تختوں پر
جلوہ گر ہوئے سفید کوہ اور سلسلۂ سلیمان کے اہلِ کوہ سے قدرے
مختلف تھے۔

---

[1] یہ نظریہ کہ سرحدی قبائل بنو اسرائیل کے گمشدہ قبائل تھے اور پشتو ایک
سامی زبان ہے بعض برطانوی مصنفین کے ہاں بیسویں صدی تک قائم رہا حالانکہ
علما فضلا نے بہت پہلے تصدیق کر دی تھی کہ زبان انڈو ایرانی ہے اور لوگ
غیر سامی نسل کے ہیں مثلاً برنارڈ ڈورن کی کتاب "اے کریسٹو میتھی آف دی
پشتو اور افغان لینگویج" (سینٹ پیٹرز برگ۔ دی امپیریل اکیڈمی آف سائنسز
۱۸۴۷ء) ، ص ۱۱ (۲) اولف کیرو اپنی کتاب "دی پٹھانز۔ ۵۵۰ ق م
تا ۱۹۵۷ء" (لندن، سینٹ مارٹنز پریس، ۱۹۵۸ء) میں یہ دلیل دیتا ہے
کہ ایتھنے لائٹ۔ یا سفید جلد پٹھان ملغوبے میں خصوصی طور پر اہم عنصر ہیں۔
ص ص ۸۱ تا ۹۰۔

پوری جمعیت کے ناموں میں اختلافات بھی تصویر کو پیچیدہ کر دیتے ہیں۔ سرحدی قبائلی اب بھی صحیح طور پر افغان کہلاتے ہیں گو یہ لفظ افغانستان کے تمام باشندوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جن میں سے اکثر اہل سرحد کے ساتھ کوئی نسلی تعلق نہیں رکھتے۔ مغرب میں مانوس ترین لفظ پٹھان ہے جو ایک ہندی اصطلاح ہے جسے اہل برطانیہ نے اختیار کر لیا اور جس سے مراد عموماً ڈیورنڈ لائن کے مشرق کی طرف رہنے والے لوگ ہیں۔ سرحد کے دونوں طرف کے اکثر لوگ اپنے کو پختون، پختون، پشتون یا پشتون کہتے ہیں۔ پہلے دونو نام شمال کی سخت زبان اور آخری دونوں جنوب کی نرم قندھاری زبان میں استعمال ہوتے ہیں، لیکن بعض جیسے یوسفزئی لفظ افغان کو ترجیح دیتے ہیں۔ آسانی کے لئے اس پوری کتاب میں لفظ پٹھان ہی استعمال کیا گیا ہے سوائے ان مواقع کے جہاں سیاق و سباق کسی دوسرے نام کا متقاضی ہو۔

جیسا کہ لوگوں کے اپنے پسندیدہ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ تشخص کا عملی ترین معیار زبان ہے۔ تقریباً تمام لوگ پشتو بولتے ہیں (انگریزی میں جنوبی لفظ زیادہ استعمال ہوتا ہے بجائے شمالی پختو کے) یہ ایک مشرقی ایرانی زبان ہے۔ جو حتمی طور پر اس کے مغرب اور مشرق میں مستعمل فارسی اور اردو زبانوں سے مختلف ہے۔ پٹھان خود اپنے ماخذ کے متعلق ایک قطعی نظریہ رکھتے ہیں جو اپنی موجودہ شکل میں

موجود تھا۔ جب پہلا انگریز آنریبل ماؤنٹ سٹوارٹ ایلفنسٹن ۱۸۰۹ء
میں سرحد میں آیا اور اس نے ان سے ربط و ضبط پیدا کیا[x1]۔ یہ ایک
قریباً یقینی افسانوی لیکن نمایاں طور پر مسلسل شجرۂ نسب پر مشتمل ہے۔
جو پہلے اسرائیلی بادشاہ طالوت تک جاتا ہے۔ ہر صحیح پٹھان اپنے
کو اور اپنے آباؤاجداد کو اسی عظیم شجرہ سے ماخوذ قرار دیتا ہے۔ ایسے
آثار موجود ہیں کہ یہ شجرۂ نسب کوئی ۴۰۰ سال پہلے ترتیب دیا گیا۔
تاہم یہ اس لحاظ سے گراں بہا ہے کہ اس کے ڈھانچے میں اس وقت
کے اس گروہ مردماں کے حقیقی حصے منعکس ہوتے ہیں اور اس
وقت سے نسلاً بعد نسلاً کے حسب و نسب محفوظ ہیں[x2]۔ ان وجوہات
کی بناء پر اور اس لئے بھی کہ پٹھان اپنے شجرہ کے متعلق بہت
سنجیدہ ہے۔ قبائل کی روایتی کہانی یہاں خلاصۃً پیش کی جا رہی
ہے۔

پٹھانوں کا ماخذ:۔

نسل کے بانی قیس ہیں جو اسرائیلی طالوت کے سینتیسویں جانشین

[x1] دیکھیے ماؤنٹ سٹوارٹ ایلفنسٹن "این اکاؤنٹ آف دی کنگڈم
آف کابل اینڈ اٹس ڈی پینڈینسیز ان پرشیا، تارتاری اینڈ انڈیا" لندن لونگ مین رسٹ
پریس اوورمے براؤن اور جے مرے (۱۸۱۵ء)۔ ص ص ۱۵۸ تا ۱۶۰

[x2] دیکھیے ہیوگ۔ آر۔ جیمز "رپورٹ آن دی سٹلمنٹ آف دی پشاور (باقی اگلے صفحہ پر)

میں وہ ایک عابد و زاہد اور مجاہد انسان تھے جو ساتویں صدی کے افغانستان میں غور کے پاس رہتے تھے۔ وہ ایک اوّلین مبلّغ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے اور بعد میں عرب گئے اور آنحضور نے ان کے لئے دُعا فرمائی۔ قیس کے انتقال کے بعد ان کی اُولاد قندھار منتقل ہو گئی۔ قندھار میں اہلِ غور گندھاریوں سے ملے اور ان سے رشتے ناطے کئے جو وادی پشاور کے اصلی باشندوں میں سے تھے، اور پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں سفید ہُنوں سے بھاگ کر یہاں آ گئے تھے۔ نئے قبیلے نے اپنی زبان پشتو گندھاریوں سے لی اور اپنا مذہب اسلام غوریوں سے لیا۔ اگلے چند سو سالوں میں اس کی روز افزوں آبادی شمال مشرق اور واپس وادی پشاور میں پھیل گئی۔ یہاں دوسرے مقامی گروہ۔ جو گندھاریوں کے برعکس سفید ہُنوں کی آمد پر بھاگے نہیں تھے جذب کئے گئے۔ یہ کہانی کی بعض روایتوں کے مطابق آفریدی اور خٹک بن گئے۔

قبائل کے پورے ارتقاء میں مختلف حملہ آور ایک دوسرے

(بقیہ حاشیہ)

ڈسٹرکٹ، سلیکشنز۔ فرام دی ریکارڈز آف دی گورنمنٹ آف انڈیا، ۱۸۶۵ء، نمبر ۴۷ (کلکتہ، گورنمنٹ آف انڈیا) این۔ ڈی)، ص ص ۴۷ تا ۴۸۔

قبیلہ کی تشکیل میں سماتے چلے گئے اور یوں ایک گروہ میں ترک عنصر غالب ہوا تو دوسرے میں ایرانی اثر نمایاں ہو گیا۔

نسل کی تینوں بڑی شاخیں اپنی اپنی جگہ قیس کے کسی بیٹے سے اپنا ماخذ منسوب کرتی ہیں۔ سڑبنی پٹھان جن میں درانی، غوری خیل، خاغائی خیل، شنواری، یوسفزئی، محمدزئی، اور مہمند شامل ہیں۔ سڑبن کو اپنا مورث اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ غلزئی پٹھان جن میں سلیمان خیل اور اکا خیل کے بڑے بڑے خانہ بدوش قبائل شامل ہیں۔ بیطان کی بیٹی اور ایک ایرانی شہزادے کی اولاد ہیں۔ غور غشت پٹھان جیسے آفریدی، خٹک، وزیر، محسود، دور، توری، جاجی اور اور بنگش غور غشت کے اخلاف ہیں۔

قبائلی تنظیم

بڑے بڑے قبائل کے بیان سے پہلے چند عمومی باتیں ضروری ہیں۔ ہر پٹھان گروہ کسی نہ کسی طریقے سے ہر دوسرے گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور پشتو بولنے والے لوگ ایک بہت حقیقی، ثقافتی اور سماجی وجود کے مالک ہیں۔ لیکن ایک ایسا ڈھانچہ ترتیب دینا قریباً ناممکن ہے۔ جس میں ہر گروہ اپنا مقام پا سکے۔ ہر بڑے قبیلے کے دو یا زیادہ خیل یا طائفے ہیں۔ خیل مختلف درجوں کی وسعت کے مالک توسیع شدہ خاندانی نظاموں میں بٹ جاتے ہیں۔ ان

ضمنی حصّوں میں سے بعض بھی خیل کہلاتے ہیں ، اور بعض کور یا کہول۔

لیکن عین ممکن ہے کہ ایک خیل اپنے ولدیتی قبیلے سے قطعاً لاتعلق ہو چکا ہو اور تعداد میں بعض دوسرے قبائل سے بھی بڑا ہو بلکہ وہ جسامت اور اہمیت میں ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہوں ایک ہی نام کے مالک ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً سپاہ خیل آفریدیوں میں بھی ہے اور شنواریوں میں بھی اور عثمان خیل مہمندوں میں بھی ہے ، اور محسودوں میں بھی ، لہٰذا جب تک کسی بڑے قبیلہ کا حوالہ نہ دیا جائے ایک مخصوص گروہی نام اپنے سیاق و سباق کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ہر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے گروہ کی بنیاد خونی رشتہ ہے ، اصلی ہو یا فرضی۔ یہ کوہ باش قبائل میں تو ناگزیر ہے جہاں مثلاً ایک آدمی سب سے پہلے اپنے متعلق سوچے گا کہ وہ "آدم خیل آفریدیوں کے گالیہ ڈویژن کے سب سیکشن شہباز خیل کے ملک شہباز خان کا دوسرا بیٹا ہے از کردہ "خیبر ایجنسی کے گاؤں جمرود کا جمشید خان" ہے مدتوں سے میدانوں میں آباد قبائل میں جغرافیائی کوائف زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور یہاں ذاتی شناخت اس طرح ہوگی "تنخال گاؤں کا جہانگیر ولد عیسٰے خان ۔ ایک خلیل جو ضلع پشاور کی تحصیل پشاور میں آباد ہے" یہ امتیاز اکثر یتی نہیں رہتا۔

کیونکہ بہت سے قبائل کے افراد پہاڑیوں میں بھی ہیں اور زیر قانون اضلاع میں بھی اور کچھ قبائل تو سرحد پار افغانستان میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔

خونی گروہ بندی سے مستثنیٰ صرف سامل اور گار فرقے ہیں جو کم و بیش حد تک اکثر قبائل میں موجود ہیں۔ یہ فرقے جن کا دیگر قبائلی گروپ بندیوں سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان کی کوئی متحدہ پالیسی یا مقاصد ہیں، بعض علاقوں میں سپین (سفید) اور تور (سیاہ) کہلاتے ہیں۔ یہ مبہم طور پر سیاسی پارٹیوں سے مشابہ ہیں اور غالباً ان کا ابتدائی مقصد یہ ہے کہ ایک آدمی ایسے گروہ میں شامل ہو سکے جو اس کے ہمسائے کا مخالف ہو جس کے ساتھ وہ خونی رشتے سے بندھا ہوا ہے۔ ان فرقوں کی ابتداء قدامت میں روپوش ہے اور اہلِ مغرب شاذونادر ہی ان کی اصل حقیقت کو سمجھ سکے ہیں۔ شاید مغرب میں اس کی واحد متوازی مثال "نیلے" اور "سبز" فرقے ہیں۔ جنھوں نے مشرقی سلطنت روما کو اس کے آخری ایام میں بہت دق کیا تھا۔

اکثر قبائل جن میں یہ فرقے اہم رہے ہیں تقریباً برابر برابر ان میں تقسیم تھے۔ مثلاً آفریدیوں میں کمبر خیل، آدم خیل اور ادا کا خیل گار تھے اور ملک دین خیل، زکا خیل، قمر خیل اور سپاہ شامل تھے۔ فرقے سے عقیدت عموماً موروثی تھی لیکن ایک فرد اپنی وفاداریاں

بدل بھی سکتا تھا گو وہ خیل کو ایسا کرنے پر مجبور یا لازماً آمادہ نہ کر ا،
سکتا تھا۔ پچھلے چند سالوں سے ان کی اہمیت کم ہو گئی ہے اور قبائلیوں
کی تراز لوا انکو عملاً فراموش کر چکی ہے۔

اس پیچیدہ و ژولیدہ صورتحال میں بہتر یہی ہے کہ ہم ڈیورنڈ
لائن کے ساتھ ساتھ پٹھان کے شمال ترین نقطے سے شروع کریں اور
جنوب اور مشرق کی طرف بڑھتے جائیں اور اہم ترین قبائل کے
خصائص کا ذکر کرتے ہوئے ان قبائل کو نظر انداز کرتے جائیں
جو اپنی معمولی جسامت یا الگ تھلگ محل وقوع کی وجہ سے سرحد پر
خاص اثر نہ ڈال سکے۔[1]

یوسفزئی ؛ یوسفزئی سب سے بڑے قدیم ترین اور مہذب ترین
قبائل میں سے ایک ہیں۔ ان کے خیلوں اور شاخوں کی تعداد بھی شاید
سب سے زیادہ ہے اور ارتقاء کا تنوع بھی۔ وہ دیرا ور سوات کے
سنگلاخ پہاڑوں میں بھی آباد ہیں اور مردان کے زرخیز میدانوں میں
بھی۔ ٹولے ٹالے وہ غالباً ایک ملین کے قریب ہیں۔

---

[1] ابھی تک قبائل کا کوئی صحیح شمار نہیں کیا جا سکا۔ سرکاری پاکستانی مردم شماری کی
رپورٹیں صرف قبائلی ایجنسیوں کے اندازے بتا دیتی ہیں۔ لہٰذا آئندہ صفحات میں ہر قبیلہ
کے دیئے گئے اعداد و شمار صرف قریب اً صحیح ہیں اور مختلف ذرائع سے اکٹھے کئے گئے ہیں۔

مجموعی طور پر قبیلہ میدانی اور پہاڑی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
پہاڑی دیر، سوات، بنیر اور باجوڑ کے کچھ حصوں کے علاوہ سندھ پار کے
کوہ سیاہ کے علاقے میں بھی رہتے ہیں۔ زیادہ صحیح طور پر یہی اصلی
یوسفزئی ہیں لیکن وہ عام طور پر اپنے مختلف قبائلی ناموں سے ہی
پہچانے جاتے ہیں جیسے دیر اور سوات کے اکوزئی اور ملیزئی، بنیر کے
الیاس زئی یا محض بنیروال اور کوہ سیاہ کے علیٰ زئی۔ وہ سب سڑبنی
پٹھانوں کے خاخائی خیل کی اولاد ہیں جو پندرھویں اور سولہویں صدیوں
میں دریائے کابل کی وادی کے بالائی حصوں سے مشرق کی طرف آئے
تھے۔ انہوں نے سواتیوں کو سندھ پار دھکیل دیا اور عرصے سے
ریاست ہائے دیر و سوات میں توازن اقتدار قائم رکھے ہوئے ہیں۔
خان یا نواب دیر پائندہ خیل ملیزئیوں کے سب سیکشن اخوند خیل کا
ہی ایک فرد ہے۔[1]

میدانی یوسفزئیوں کو بعض اوقات مردان کہا جاتا ہے لیکن لوگ
اپنے آپ کو زیادہ باوقار نام یوسفزئی سے پکارنا زیادہ پسند کرتے
ہیں۔ ان کے تین بڑے گروہ ہیں کمالزئی، اماز‌ئی اور رزڑ(بائیزئی) وہ ضلع

---

[1] - سوات کا موجودہ والی اخوند صاحب کا پڑپوتا جو نسبتاً کم اہم قبیلہ
صافی سے تھا اور جنہوں نے پچھلی صدی میں ایک ولی کی حیثیت سے اپنا اقتدار
قائم کیا۔ والی کا مضبوط اور ترقی پسند نظم و نسق نواب دیر کے پسماندہ جاگیردارانہ
نظام کا تضاد ہے جسے حکومت پاکستان نے بالآخر ۱۹۶۰ء میں محروم اقتدار کر دیا۔

مردان کے یوسفزئی میدان پر رہتے ہیں جہاں کہیں کہیں خٹک، اماں خیل داؤدزئی اور رنگیا نیوں کی بھی آبادیاں ہیں۔

یوسفزئی بالخصوص میدانی دلکش، جفاکش زراعت کار، خوش وضع، نسبتاً صاف ستھرے اور اپنے قبیلے پر بے حد نازاں ہیں۔ جسے وہ پٹھانوں کا نجیب ترین اشرافیہ سمجھتے ہیں۔ زمین کا روایتی نظام جس کے تحت ہر فرد کا ایک دفتر یعنی اس کا اپنا قطعۂ زمین بھی ہوتا ہے، اور قبائلی شاملات میں اس کا حصہ بھی، کافی حد تک بدستور قائم ہے۔ نتیجتہً چھوٹے چھوٹے زمینداروں کا ایک بڑا طبقہ موجود ہے لیکن انیسویں صدی میں برطانوی بندوبست اراضی کے تحت برپا ہونے والے نظام خانی کی وجہ سے بعض انفرادی زمینی املاک ۲۰ ہزار ایکڑ تک جا پہنچی ہیں۔

کئی لحاظ سے یوسفزئی پٹھانوں کا نمائندہ ترین قبیلہ ہیں۔ اس کا ایک حصہ میدانوں کی قانون پذیر زندگی اور سرکاری نظم ونسق سے مانوس ہے۔ اس کا دوسرا حصہ سرزمین "بے آئین" میں رہتا ہے، جہاں زندگی روایتی قبائلی تورہ کے مطابق ہی گزاری جاتی ہے اور ان دونوں گروہوں کے درمیان رابطہ قریباً قریباً مفقود ومعدوم ہے۔

باجوڑی :ر

باجوڑ ایک وحشیانہ پہاڑی علاقہ ہے، دیر کے جنوب میں افغان

سرحد کے ساتھ ساتھ اور مہمند علاقے کے متصل۔ اس کے لوگ بھی اتنے ہی متنوع اور خود سر ہیں، جتنا ان کا علاقہ۔ بڑے قبائل سالارزئی اتمان خیل اور مامند ہیں۔

اتمان خیل سڑبنی پٹھان ہیں جو پندرھویں اور سولھویں صدی میں یوسفزئیوں کے جلو میں مشرق کی طرف آئے، ان میں سے بعض میدانی یوسفزئیوں میں گھل مل گئے ہیں لیکن باجوڑ میں وہ نسبتاً اپنی جداگانہ ہستی قائم رکھے ہوئے ہیں اور پٹھانوں کی بعض قدیم ترین اور غیر واضح رسمیں بھی اُن میں محفوظ ہیں۔ اتمان خیل باجوڑ میں سب سے بڑا گروہ ہے یعنی قریباً ۱۵،۰۰۰ الاکھ، لیکن باجوڑ کا غالب قبیلہ سالارزئی ہے جن کے پانچ ضمنی حصے ایک دوسرے کے حریف خوانین خار، نواگئی پشت اور کوہ ٹکئی کے وفادار ہیں۔ ان وفاداریوں کو اُتھل پتھل کرنے کی کوششوں نے باجوڑ کو فتنہ وفساد کا روایتی گڑھ بنا دیا ہے۔

مہمند

مہمند جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے باجوڑ کے قبائل کے ساتھ بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی نسبت کثیر التعداد اور ہم آہنگ ہیں۔ مہمند قریباً ۴ لاکھ ہیں جن میں سے نصف کے قریب ڈیورنڈ لائن کی دوسری طرف رہتے ہیں۔

قبیلہ سڑبنی پٹھانوں کے غوریہ خیل سے ماخوذ ہے۔ غوریہ خیل

افغانستان سے خاخائی خیل کے ساتھ ہی ہجرت پذیر ہوا جس سے
یوسفزئی نکلے ہیں۔ ڈیورنڈلائن کے مشرق میں رہنے والے مہمند شروع
میں ہی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ "کوز (زیریں) مہمند
دریائے کابل کے شمال میں زیرِ قانون اضلاع کے متصل رہتا ہے،
کچھ نے کوہستانی زندگی کو خیرباد کہہ دیا اور محنتی اور زمین کے بھوکے
کسانوں کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلی ہے۔ کوز مہمندوں کی
پانچ بڑی شاخیں ہیں، تارکزئی، حلیم زئی، اتمان زئی، داوے زئی
اور مندی خیل۔ انہیں "قولی قبائل" کہا جاتا ہے کیونکہ ۱۸۹۵ء میں
جب انہوں نے برطانوی راج کو قبول کر لیا تو انگریزوں نے انہیں
قول دیا کہ انہیں وہ تمام وظائف اور تحفظ ملتا رہے گا جو امیرِ افغانستان
سے انہیں ملتا تھا۔

بار (پہاڑی) مہمند ایک چٹیل اور ناقابلِ رسائی خطہ کوہی
میں رہتے ہیں جو کوئی بارہ سو مربع میل کے رقبہ پر محیط ہے اور
مغرب میں ڈیورنڈ لائن سے مل جاتا ہے جنوب میں دریائے کابل
سے اور شمال میں باجوڑ سے۔ وہ مسلم، تغیر ناپذیر قبائل میں
سے ایک ہیں۔ مہمند علاقے کے نیچے ملا گوری ہیں۔ جو خیبر کے شمال میں
طرطرہ سلسلہ تک پھیلے ہوئے ہیں اور مقامی طور پر ملا گوری ابن
بایزید "پیر روشن" کی اولاد بتائے جاتے ہیں جو
روشنی فرقہ کا بانی تھا۔ لہذا وہ باقاعدہ شجرات نسب

میں موجود نہیں ہیں۔[1] مہمند علاقے کا بڑا مرکز لالپورہ ہے جو افغان سرحد کے پار ہے جہاں پہاڑیاں ٹوٹ پھوٹ کر وادی کابل بن جاتی ہیں پاکستانی مہمند ہمیشہ اپنے سرحد پار رشتہ داروں سے مربوط رہے ہیں اور اپنے ملک میں زیر پابندی ہونے کی صورت میں فوراً انکے پاس بھاگ جاتے ہیں۔ لہٰذا برطانوی حکومت سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے میں وہ کبھی پیچھے نہیں رہے۔ یہ صورتحال اب بھی کسی حد تک باقی ہے اور آزاد پختونستان" کی افغان تحریک نے مہمندوں میں اکثر دیگر قبائل کے مقابلے پر زیادہ جوش و خروش پیدا کیا ہے۔

عمومی طور پر مہمندوں کا رسم و رواج یوسفزئیوں جیسا ہے، لیکن وہ دو اہم باتوں میں ان سے مختلف ہیں۔ مہمند خوانین و ملوک روایتی طور پر جمہوریت پسند یوسفزئیوں کے مقابل زیادہ با اثر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قبیلے میں داخلی کش مکش بہت شدید ہے اور کبھی کبھار ملوک اور ملاؤں میں سخت جھڑپیں ہوئی ہیں۔ آخرالذکر بھی دیگر قبائل کی نسبت مہمندوں میں زیادہ با اثر ہیں۔

دوسرا فرق گو کوئی سیاسی اہمیت نہیں رکھتا تاہم اکثر پٹھان مہمندوں کو بربریت پسند سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ

---

[1] — سر رچرڈ وار برٹن "ایٹین ایئرز ان دی خیبر" (لندن۔ جے مرے ۱۹۰۰ء) ص ص ۷ تا ۸۔

یا رمہمندوں کے ہاں حجرے یا مہمان خانے سرے سے معدوم ہیں جس کا مطلب دوسرے قبائل یہ لیتے ہیں کہ مہمند مبلمستیا مہمان نوازی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے جسے ہر پٹھان اپنا روایتی فرض سمجھتا ہے۔

آفریدی :۔

آفریدیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ خالص پٹھان حسب و نسب کے مالک ہیں، کئی مورخین کے نزدیک مشکوک ہے[1] لیکن مستم طریقہ طور پر وہی پٹھانوں کے اصل نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ وہ متضاد صفات کا ایک مجموعہ ہیں۔ بہادر، محتاط، قابلِ عزت، دغا باز، ظالم جانباز، توہم پرست، بامروت، شکی مزاج اور خوددار۔

قبیلہ کوئی ۲/۱ ۲ لاکھ افراد پر مشتمل ہے اور آٹھ واضح طائفوں میں تقسیم ہے۔ آدم خیل، اکا خیل، قمر خیل، قمبر خیل، کوکی خیل، ملک دین خیل، زکا خیل اور سپاہ، یہ پشاور کے جنوب اور مغرب میں کوئی ایک ہزار مربع میل رقبے پر آباد ہے۔ درہ خیبر اسی پہاڑی علاقے سے گزرتا ہے۔ درے کے جنوب میں تیراہ ہے جو

---

[1] مثلاً ڈیولیس، مذکورہ بالا کتاب میں، ص ۶۲ + میجر آر۔ ٹی۔ آئی رجوے "پٹھان" دکلکتہ، گورنمنٹ پریس، ۱۹۱۸ء، ص ۵۰، مذکورہ بالا کتاب میں ص ۶۴ + سر مارک آرل سٹین جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۲۵ء، ص ص ۴۰۲ تا ۴۰۳۔

آفریدیوں کی جنم بھومی ہے۔ تیراہ میں داخلے کا راستہ نجوری میدان اور چورا وادی میں سے ہے۔ جنوب مغرب میں کئی چھوٹے چھوٹے درے وادیٔ کرم میں جاتے ہیں۔ شمال کی طرف تیراہ سے کئی تنگ پہاڑی گھاٹیوں کے ذریعے خیبر پہنچا جا سکتا ہے۔

تمام آفریدی طائفے تیراہ میں اپنے اپنے علاقوں کے مالک ہیں جن میں سے اکثر خیبر تک پھیلے ہوئے ہیں جس پر انہوں نے ہمیشہ حقِ محصول استعمال کیا ہے۔[1] ملک دین خیل تیراہ کے وسط میں رہتے ہیں اور باغ پر قابض ہیں جو آفریدی جرگوں کی روایتی جائے انعقاد ہے۔ اکا خیل جمرود کی جنوبی پہاڑیوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ سارا علاقہ خیبر ایجنسی میں شامل ہے۔ آدم خیل پشاور اور کوہاٹ کی درمیانی

---

[1] سولہویں صدی میں آفریدی مغل سلطنت سے ۱½ لاکھ روپے سالانہ وصول کرتے تھے اور ہر مسافر سے لیا جانیوالا محصول اس کے علاوہ تھا۔ ۱۸۹۵ء تک ان کی آمدنی امیر افغانستان سے صرف ۹۰۰،۲۲ روپے رہ گئی تھی لیکن اس کے علاوہ وہ ہر لدے ہوئے اونٹ پر ۵ روپے (اشیائے خوردنی کی صورت میں ۳ روپے) ہر گھوڑ سوار سے ۲ روپے اور ہر اَن لدے ہوئے اونٹ یا پیادہ سے ۱½ روپیہ وصول کرتے تھے۔ برطانوی ہند اور پاکستان کی طرف سے دیئے جانے والے وظائف کے مستند اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں لیکن اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ مغل اعداد و شمار سے کہیں زیادہ ہیں۔

پہاڑیوں میں رہتے ہیں۔ ان کا محافظ خانہ درہ کوہاٹ ہے جس میں ان کی اہم ترین اسلحہ ساز فیکٹریاں واقع ہیں۔ یہ علاقہ ایک علیحدہ بے آئین پٹی کی حیثیت سے ضلع کوہاٹ سے منسلک ہے آدم خیل کے سوا آفریدی طائفے ہجرت پذیر ہیں اور سردی میں بلند تیراہ سے نکل کر پست پہاڑیوں اور خجوری میدان میں چلے جاتے ہیں۔

گو سارا قبیلہ مغلوں اور انگریزوں کے خلاف متحدہ اقدام کا اہل ثابت ہوا تاہم آفریدی باہمی جنگ وجدل کے اس بری طرح عادی ہیں کہ ہمسایہ قبائل کے ساتھ کسی بڑے معرکے کا انہیں وقت ہی نہیں مل سکا۔ آدم خیل، اور اکاخیل کے درمیان اور کوکی خیل اور زکا خیل کے مابین جھگڑے بہت مشہور ہیں۔ برسبیل تذکرہ آخرالذکر طائفہ آفریدیوں کا اصلی نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اتنا ناقابل اعتبار سمجھا جاتا ہے کہ دوسرے طائفے جرگہ میں کسی زکا خیلی قسم کا روایتاً اعتبار نہیں کرتے جب تک یرغمال ساتھ نہ ہو۔ خانہ جنگی اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ آفریدیوں پر ملاؤں کا بہت اثر ہے اور مختلف طائفے سامل اور گار فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

آفریدی نازک اندام اور خوش نما لوگ ہیں اور قد کاٹھ میں یوسفزئیوں سے ذرا کم ہیں۔ عبرانی خدوخال اور پوری داڑھیاں

رکھنے کا رواج اکثر سفید ریش لوگوں کے لہراتے ہوئے ملبوسات کی آن بان سے مل کر انہیں توراتی پیغمبروں کے ایک مجمع کا تاثر دے دیتا ہے۔

آفریدی بالخصوص آدم خیل اور ملک دین خیل اکثر دیگر قبائل کے خلاف برطانوی ہندی فوج میں کثیر تعداد میں بھرتی ہوتے تھے۔ مشہور خیبر رائفلز جس کا صدر مقام لنڈی کوتل (خیبر) ہے زیادہ تر ایک آفریدی تنظیم رہی ہے سوائے ان اوقات کے کہ جب انگریز بغاوت یا سازش کی وجہ سے آفریدیوں کی ملازمت پر پابندی لگا دیتے تھے۔ پچھلے سالوں میں آفریدیوں نے سرحد کے مختلف مقامات کے درمیان اور پشاور اور افغانستان کے مابین نفع بخش ٹرک حمل و نقل کا کاروبار قائم کر لیا ہے۔ ہندوستان میں سکھوں کی مانند آفریدی شمال مغربی پاکستان میں موٹر مکینک بھی ہیں، اور بیکار ترین گاڑیوں کو غیر معینہ مدت تک ایک نئی زندگی دے سکتے ہیں۔

سنز جھنڈے کی نمود پر آفریدیوں کی آمادگیٔ جہاد کے باوجود دیگر پٹھان ان کے مذہبی لا اُبالی پن پر سخت متفکر رہتے ہیں۔ سترھویں صدی میں پشتو کے عظیم شاعر اور آخر دم تک آفریدیوں کے اتحادی نے افسوس کا یوں اظہار کیا۔

"تیراہ میں مؤذن کی آواز سنائی نہیں دی اور وقتِ فجر صرف

مرغ ہی اذانیں دیتے ہیں:

سولھویں صدی کے روشنیہ ملحدین دیگر قدامت پسند قبائل کے ٹھکرانے کے بعد تیراہ میں پناہ گزین ہوئے اور مشہور ہے کہ فرقے کا بانی، پیر روشن اب بھی وہاں محترم سمجھا جاتا ہے۔

لیکن لامذہبیت کے الزامات کا بہترین جواب شاید آفریدیوں کی اپنی ہی اپنے متعلق ایک کہانی ہے۔ ایک دفعہ بہت عرصہ پہلے ایک بزرگ پیر قبیلے کے پاس آگیا۔ انہوں نے اس کی تعظیم کی اور دُعا کے لئے درخواست کی۔ اس نے انہیں ان کے فقدان خیر و برکت پر تساڑا اور لعن طعن کی کہ ان کے پورے علاقے میں کسی بزرگ کا ایک بھی مزار نہ تھا جس سے وہ شفاعت کے امیدوار ہو سکتے تھے۔ اس دلیل سے متاثر ہو کر آفریدیوں نے پیر کو موقع پر ہی قتل کر دیا اور اس کا ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا جہاں وہ زہد و ریاضت کرنے لگے۔ [1]

---

[1] اس کہانی کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے لیکن اس کا ماخذ زیادہ تر کسی انگریز مصنف سے منسوب کیا جاتا ہے، جو ایک پختہ حسِ مزاح کا مالک تھا لیکن یہ قابلِ ذکر ہے کہ جیمز نے ۱۸۶۵ء میں لکھی گئی اپنی بندوبست رپورٹ میں اس واقعہ کو یوسفزئیوں میں مشہور و معروف بنایا جبکہ آفریدی آج بھی اسے اپنے سے منسوب کرتے ہیں۔

شنواری :-

سٹرنبی پٹھانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ شنواری بھی ہے جو خیبر کے انتہائی مغربی سرے پر بھی رہتے ہیں اور افغانستان کی وادی جلال آباد کے زیریں حصہ کی پہاڑیوں میں بھی قبیلے کی نفری کوئی ۵۰ ہزار ہے۔ یہ منڈ یزئی، سنگو خیل، سپاہ اور علی شیر خیل شاخوں میں تقسیم ہے۔ صرف آخر الذکر کے کوئی بارہ ہزار افراد سرحد میں رہتے ہیں۔ گو یہ قبیلہ ایران افغانستان کے لئے کافی دردِ سر بنا رہا ہے تاہم ڈیورنڈ لائن کے مشرق میں یہ کبھی اہم نہیں رہا۔

اورکزئی :-

اورکزئی قریباً ۱۲ سو میل رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں جو سفید کوہ کی ایک جنوبی گھاٹی یعنی سامانہ چوٹی پر مرکوز ہے۔ وہ تیراہ کی جنوبی وادیوں اور وادئ کرم کی شمالی پست پہاڑیوں میں بھی آباد ہیں۔ پٹھان شجرۂ نسب میں وہ سب غورغشت کی اولاد بتائے گئے ہیں لیکن ان کے مختلف حصے اصل میں قریباً علیحدہ علیحدہ قبائل معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اسماعیل زئی، مستوزئی، دولت زئی، محمد خیل ستوری خیل اور لشکر زئی ہیں۔ آخر الذکر سب سے بڑے اور طاقتور ترین ہیں۔ ان کا ایک طائفہ ماموں زئی سالہا سال تک کرم

اور کوہاٹ میں انگریز منتظمین کے پہلو کا کانٹا بنا رہا۔ چار ماتحت
قبیلے، علی خیل، ملا خیل، مشتی اور شیخان بھی اورکزئیوں سے
منسلک ہیں اور ان میں مزید تنوع کا باعث بنتے ہیں۔ ان کی
مجموعی تعداد تقریباً ۹۵ ہزار ہے۔ اورکزئی علاقے میں جھگڑے عام
ہیں۔ گار اور سامل فرقے طائفوں اور ان کے اجزاء کو باہمی
طور پر متصادم رکھتے ہیں۔ مذہبی اختلافات رقابت کو بڑھا
دیتے ہیں۔ محمد خیل، نصف ستوری خیل اور غلام طائفوں کے مختلف
اجزا شیعہ ہیں جبکہ باقی اورکزئی سنی ہیں۔ یہ اندرونی تضادات
زیمشت، آفریدیوں، بنگش اور توریوں کے ساتھ مزید جھگڑوں کا
موجب بنتے ہیں۔

زیمشت

زیمشت وادی کرم کے دہانہ کے ارد گرد کی پہاڑی ڈھلانوں
پر رہتے ہیں اور میدانوں میں بھی چند دیہات کے مالک ہیں۔ بعض
فضلاء کے مطابق وہ بھی اورکزئیوں کا ایک طائفہ ہیں[۱] لیکن
وہ اپنے کو سٹربنی پٹھان کہتے ہیں اور اورکزئیوں سے مختلف
معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ۷۰ ہزار کے قریب ہیں اور چنارک کے سرور
خان عرف چخئی کی وجہ سے بہت مشہور ہیں جو بدنام لیکن کامیاب

۱۔ مثلاً سر ولیم بارٹن "انڈیاز نارتھ ویسٹ فرنٹیئر" (لندن جے مرے ۱۹۳۹ء)
ص ۸۴۔

ڈاکو تھا اور ایک وقت زیریں وادی کرّم کا بے تاج بادشاہ تھا۔[1]

توری ،ر

توری وادی کرّم کا اہم ترین قبیلہ ہیں۔ شجرۂ نسب کے مطابق وہ غورغشت پٹھان ہیں لیکن مذہباً شیعہ ہیں۔ ان کے خدوخال قطعی منگول ہیں اور وہ غالباً ابتدائی تاتاری فاتحین کی اولاد ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ طوغانی کی سرکردگی میں ایران سے مشرق کی طرف آنیوالا ایک تاتاری خاندان تھا جو ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے قیام سے پہلے یہاں وارد ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں اس نے بنگش کو وادیٔ کرّم سے باہر دھکیل دیا۔

ایک ترقی یافتہ سماجی، مذہبی اور قانونی ڈھانچہ جو دیگر قبائل سے مختلف تھا انیسویں صدی تک موجود تھا ان کا روایتی قانون المعروف بہ توری رِمونا ہیئتا پختون ولی سے مشابہ تھا۔ لیکن یہ قبیلہ کے شیعہ مذہب کا ضامن تھا اور اپنے افراد کے اس حق کا بھی کہ وہ علاقے میں آباد پیروں یا سادات کے چار عظیم خاندانوں

---

[1]- چمنی وزیروں کے ساتھ ایک لڑائی میں ۱۹۰۳ء میں مارا گیا۔ اس کے کارناموں کے لئے دیکھئے "بارٹن مذکورہ بالا" ص ۳۰۔ نیز ہیتھوڈ ورلا مٹن۔ "بیٹیل دوم اَمنگ دی وائلڈ امیز آف دی افغان فرنٹیئر" دلنڈن ایسلی، سروس، ۱۹۲۷ء ص ص ۲۷۷ تا ۲۸۶

میں سے کسی کے بھی عقیدت مند ہو سکتے ہیں۔ یوسفزئیوں کی طرح ان میں زمینی املاک بے حد منظم تقیں اور ہر اصلی توری اب بھی بیوار اور رلاما کے موروثی دیہات کی قبائلی زمینات میں کم از کم رسمی حصہ دار ضرور ہوتا ہے۔

شیعہ ہونے کی وجہ سے توریوں کو اکثر اپنے ہمسایہ سنی قبائل کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا۔ قبائلی علاقے کی زرخیز ترین زمین پر قابض ہونے کی بدولت وہ واقعی ایک قابلِ حفاظت اثاثہ کے مالک تھے، لہٰذا انہوں نے انگریزوں کو خوش آمدید کہا اور شروع میں ہی ان سے اتحاد کر لیا۔ چنانچہ وہ عرصے سے کوہاٹ اور بنوں کے زیر انتظام ضلعوں سے بہت گہرا رابطہ رکھتے ہیں اس لئے ان کے جداگانہ قبائلی نظریات و رسومات دیگر سرحدی قبائل کی نسبت بہت حد تک بدل گئے ہیں۔ توری حمزہ خیل، مستو خیل، گنڈی خیل، علیزئی اور دویرزئی میں تقسیم ہیں۔ چند چھوٹے چھوٹے غلام قبائل کو ملا کر ان کی مجموعی تعداد تقریباً ۲۰ ہزار ہے۔ ساحل اور رگار فرقے بھی توریوں میں موجود ہیں لیکن بیین اور تور کے ناموں کے تحت عقیدتاً بھی وہ چار سید خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں سے تین کے مرید روایتی طور پر سست غنڈی کہلاتے ہیں جبکہ چوتھے خاندان کے مرادت مند مقابلے پر ٹبنگ غنڈی مشہور ہیں۔

بنگش ؛ ر

بنگش وادیٔ کرم کے سابقہ باشندے تھے اور ان میں سے بہت سے وادی کے نچلے حصّوں میں اب بھی آباد ہیں۔ باقی ایک تنگ پٹی پر رہتے ہیں، جو وادیٔ کرم کے دہانے پر دریائے سندھ تک محیط ہے۔ ان کا صدر مقام ہانگو ہے۔ قبیلہ کوئی ۱۰ ہزار افراد پر مشتمل ہے اور یہ میرانزئی، بائیزئی اور سامل زئی میں تقسیم ہے اور کرزئیوں کی طرح ان میں سے کچھ شیعہ ہیں اور کچھ سُنّی تقریباً سب کے سب گار فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قبائلی پُرامن، کم آمیز اور جفاکش ہیں۔ بہت سے برطانوی ہندوستانی اور پاکستانی افواج میں ملازم رہ چکے ہیں۔

وزیر ؛ ر

وزیر پہاڑوں کے اس پیچیدہ سلسلہ کا اہم ترین قبیلہ ہیں جو کرم سے ایک سو میل سے زیادہ فاصلے تک جنوب کی طرف چلتا ہے۔ یہ علاقہ شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان کی قبائلی ایجنسیوں میں تقسیم ہے جس میں اول الذکر کا صدر مقام میران شاہ ہے اور جنوبی وزیرستان کا صدر مقام سردی میں ٹانک اور گرمی میں وانا ہے۔ وزیر غور غشت کی اولاد ہیں۔ وہ اپنے موجودہ علاقے میں چودھویں صدی کے اوائل میں نمودار ہوئے اور آج ان کی آبادی

قریباً ۲ لاکھ ہے جن میں سے تھوڑے سے افغانستان رہتے ہیں۔

قبیلے کو اکثر درویش خیل کہا جاتا ہے تاکہ اسے محسودوں سے ممیز کیا جا سکے جو خود بھی ماخذ کے اعتبار سے وزیر ہیں۔ اس کی دو بڑی شاخیں ہیں اتمانزئی اور احمدزئی جو ڈیورنڈ لائن کے ساتھ ایک قوس کی صورت میں گومل کے دہانے سے وادی کرم کے دہانے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سرحد کی پاکستانی طرف اتمانزئی شمالی وزیرستان اور احمدزئی عموماً جنوبی وزیرستان میں مرکوز ہیں گو ان میں کچھ پورے وزیرستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

دونوں شاخیں کم از کم چار جُداگانہ حصّوں میں تقسیم ہیں جن کے قریباً تین سو الگ الگ حصّے بخرے ہیں۔ اہم ترین گروہ جن میں ہر ایک کئی کئی ذیلی گروہوں پر مشتمل ہے مدا خیل، کابل خیل اسپرکا، ناصر الدین، ہاتھی خیل اور توری خیل ہیں۔ پچھلے چند سالوں کا مشہور ترین حریف فقیر ایپی توری خیل تھا۔

کسی حد تک وزیر ہجرت پذیر ہیں۔ وہ موسموں کے مطابق اپنے بھیڑوں بکریوں کے ریوڑوں کے ساتھ ساتھ پہاڑیوں کے نشیب و فراز میں پھرتے رہتے ہیں۔ وزیر اپنے مخصوص لہجے میں پشتو بولتے ہیں اور زیادہ تر سیاہ اور رنگیا لباس پہنتے ہیں جبکہ ان کے شمالی ہمسائے ہلکے رنگوں کے کپڑوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ انگریزوں نے انہیں اپنے ترلینی رابطے پر پُرامن اور

دوستانہ پایا۔[1] لیکن بعد میں انہوں نے کسی بھی دوسرے قبیلہ کی نسبت حکومت ہند کو سب
سے زیادہ دق کیا۔ ۳۸ - ۱۹۳۷ء تک بھی کئی برطانوی ہندوستانی
ڈویژن وزیرستان میں ایک بھرپور جنگ میں الجھے ہوئے تھے۔

نتیجتاً وہ دغابازی اور بے رحمی کے لئے مشہور ہیں تاہم وہ
بہادر اور قوی لوگ ہیں اور اپنی بے آب و گیاہ پہاڑیوں پر عاشق
ہیں اور انہوں نے بہت سے پاکستانی پولیٹیکل افسروں کے دل جیت
لئے ہیں جن کا ان سے سابقہ پڑا ہے۔ لیکن یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ
غیر ملکیوں سے وہ ذاتی توقیر اور انسیت حاصل نہیں کر سکے جو وہ آفریدیوں
بلکہ محسودوں سے بھی روا رکھتے ہیں جو وزیروں کے سخت تر بھائی
ہیں۔

عمل ہجرت جو سرحد کے دوسرے علاقوں میں کافی حد تک
برسرکار رہا ہے وزیروں کے سلسلے میں ہنوز نامکمل ہے۔ اپنے دورا
بنوچی اور بنگش ہمسایوں سے زیادہ خونخوار اور کثیر التعداد ہونے
کی وجہ سے وزیروں سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی غیر دلکش
پہاڑیوں میں محدود رہنے کی بجائے ان قبائل کی نسبتاً زرخیز زمینوں
پر قبضہ جما لیتے۔ اسے کم از کم کسی حد تک انگریزوں کے ساتھ سخت

---

[1]- ایلفنسٹن، محولہ بالا، ص ۴۸۵۔ ایلفنسٹن کی رائے کی تائید ایڈورڈز نے
۱۸۴۷ء، ٹیلر نے ۱۸۵۲ء، ٹمپل نے ۱۸۵۴ء اور میک گریگر نے ۱۸۶۳ء میں کی۔

جھڑپوں نے روکے رکھا، جو زیادہ اطاعت پذیر قبائل کو تحفظ فراہم کرتے تھے۔ برطانوی طاقت کو تباہ کرنے میں ناکام ہو کر وہ اپنی پہاڑیوں میں ہی محدود رہے اور کبھی کبھار میدانوں پر چھاپے مارتے رہے اور پہاڑیوں میں شاہی قوت قائم کرنے کے سلسلے میں برطانیہ کی پے در پے کوششوں کو ناکام بناتے رہے۔

قیام پاکستان سے وزیر اپنی پہاڑیوں سے بتدریج نیچے اتر رہے ہیں۔ کچھ فوج اور سکاؤٹوں میں بھرتی ہوئے ہیں تاہم جب تک بڑے بڑے نئے قطعات زمین ترقی آشنا نہ ہوں اور ڈیرہ جات یا بنوں میدان کے موجودہ ناقابل کاشت حصوں میں انہیں دستیاب نہ ہوں اس وقت تک وزیروں کی اکثریت غالباً پہاڑیوں میں ہی رہے گی اور نان ونفقہ کے لئے بنیادی طور پر سرکاری وظائف پر ہی انحصار کرتی رہے گی۔

وزیروں نے امان اللہ کے اخراج کے بعد ۱۹۲۹ء میں نادر خان کو تخت افغانستان پر بٹھانے کے لئے بہت بڑا کردار ادا کیا اور اب بھی وہ کابل کے ساتھ کافی گہرا رابطہ رکھتے ہیں جو جزواً دوستانہ اور جزواً حریفانہ ہے۔

محسود ہار

محسود تین طرف سے وزیروں اور چوتھی یعنی مشرقی طرف

سے ہتھیاروں میں محصور ہیں۔ ان کے اپنے دونوں ہمسایوں سے
دیرینہ جھگڑے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سکھوں اور انگریزوں کے
خلاف بغاوتوں کی ایک لمبی تاریخ کے مالک ہیں، اور اپنی وجوہات
کی بنا پر وہ وحشی ترین پٹھان مشہور ہیں۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا
محسود اصل میں وزیروں کا ایک ڈویژن ہیں لیکن کسی محسود سے
یہ کہنا ایسے ہی ہے جیسے علیحدگی کو ایک اچانک اور پرتشدد خاتمے
کی دعوت دینا۔ محسود قریباً ایک لاکھ ہیں اور تین شاخوں بہلولزئی،
علیزئی اور شمن خیل میں تقسیم ہیں۔ وزیروں کی طرح یہ بڑی شاخیں
دوسرے اور تیسرے درجے کی مزید شاخوں میں تقسیم در تقسیم ہیں۔ اہم
ترین ذیلی حصے بشی خیل، منزئی، نانا خیل اور رامیل خیل ہیں۔

محسود علاقہ کنی گرم اور ماکن پر مرکوز ہے۔ یہ گومل کے
حصوں، ٹانک زم اور وانا میدان کے سرے تک پھیلا ہوا ہے۔
محسود وزیروں سے بھی زیادہ متحرک اور جارحانہ ہیں۔ ان پر ایک
تیز افزوں آبادی کا بھی دباؤ ہے۔ پچھلے سالوں میں ان میں سے
بہت سے اپنا علاقہ چھوڑ کر نیم فوجی مزدور بٹالینوں میں بھرتی
ہو گئے ہیں اور سرحد کے دوسرے حصوں میں سڑکیں بنا رہے
ہیں۔ کئی دوسرے بعض غیر متوقع پیشوں میں بھی نظر آتے ہیں جیسے
کراچی میں گھریلو ملازم۔ ساحلی سٹیمر کے عرشے پر ملازم یا کہیں بھی
ٹرک ڈرائیور۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں کے فرار کے بعد محسودوں نے

ٹانک بازار کی اکثر دکانوں کو سنبھال لیا جو ابھی تک خانہ گزیں ہیں
وہ وزیروں کی زمینوں پر قدم بہ قدم دست درازی جاری رکھے ہوئے
ہیں اور وانا میدان کے سرے پر زمین کے ایسے متنازعہ قطعے بھی ہیں
جن پر سالانہ اتنا ہی خون بہایا جاتا ہے جتنا پانی۔

محسود علاقے کے وسط میں، زیادہ تر کنی گورم کے اندر اور اردگرد
اُرمُڑ رہتے ہیں۔ اس چھوٹے سے قبیلہ کی اپنی زبان ہے جسے برگستہ کہا
جاتا ہے اور اس کی اپنی روایات ورواجات ہیں لیکن یہ گردوپیش
کی پٹھان ثقافت میں جذب ہو چکے ہیں۔ شجرۂ نسب میں اُرمڑ سڑبنی
پٹھان دکھائے جاتے ہیں لیکن ان کا پٹھان ماخذ مشکوک ہے۔
ظاہر ہے کہ وہ مکمل طور پر محسودوں پر منحصر ہیں۔ لیکن ان دونوں
قبائل کے درمیان ایک قابلِ ذکر حسن رفاقت اور مساوات موجود
ہے اور اُرمڑ وزیروں کے ساتھ جنگ میں اپنے زیادہ طاقتور
ہمسایوں کی پُرجوش مدد کرتے ہیں۔ سارا قبیلہ صرف چند ہزار
نفوس پر مشتمل ہے۔

بھٹانی : ر

بھٹانی ایک خاصے بڑے علاقے پر پھیلے ہوئے ہیں جو وزیرستان
کے مشرق میں میدان مروت سے جنوب میں گومل تک محیط ہے۔
کچھ قبائلی علاقے میں مرکوز ہیں جبکہ دوسرے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

میں رہتے ہیں۔ ان کی آبادی قریباً ۴۳ ہزار ہے اور وہ تین شاخوں
ٹاٹا، دھانا اور ارگیان میں تقسیم ہیں۔

قبیلہ بیطان (قیس کا تیسرا بیٹا) کو اپنا مورث بتاتا ہے لیکن
غلزئیوں سے ان کی کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ بھٹانی کبھی کبھار اپنے
ہمسایوں کے اتحادی یا حریف بنے ہیں لیکن عموماً وہ ایک پست حوصلہ
لوگ ہیں اور وزیروں اور محسودوں کی متحرک صفات سے محروم ہیں
مقامی طور پر وہ "وزیروں کے گیدڑ" مشہور ہیں۔

دوَر

وزیرستان کا چوتھا قبیلہ دوَر ہے۔ انہیں ان کے ہمسائے
اوّل تو پٹھان ہی نہیں سمجھتے لیکن اگر بفرضِ محال سمجھتے ہیں تو پھر
انہیں پٹھانوں کی بدترین مثالیں قرار دیتے ہیں۔ روایت کے مطابق
وہ ابتدائی غور نشت معتبرین میں سے کسی کمتر معتبر کی ایک لونڈی
کی اولاد ہیں اور دوسرے قبائل پختگی سے اس نظریہ پر قائم ہیں
کہ دوَر ناجائز یا نصف النسل قسم کے پٹھان ہیں۔

دوَر قریباً ۵۰ ہزار ہیں اور وہ ٹپی زاد، عیدک اور ملّی زاد
میں تقسیم ہیں۔ یہ کئی درجن ذیلی حصّوں میں تقسیم در تقسیم ہیں۔ دوَر
یا ٹوچی وادی وزیرستان کے معدودے چند زرخیز علاقوں میں سے
ہے اور تعجب ہے کہ وہ اس پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکے حتیٰ کہ

انگریز اتنے طاقتور ہو گئے کہ وہ اُس کو تحفظ دے سکے۔

ہر قابلِ تصوّر برائی جیسے بُزدلی، غلاظت، افیون خوری اور غیر فطری اخلاق یا خنگی دَوروں سے منسوب کی جاتی ہے۔ خواہ ان کے ہم ملک ہوں یا غیر ملکی[1] لیکن راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ اگر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنی چھوٹی سی وادی میں نہایت عرق ریزی سے کاشتکاری کرتے ہیں اور اپنی جوتوں اور چمڑے کی دیگر اشیاء کی مختصر سی پیداوار کو بیرانشاہ بازار میں لاکر خرید و فروخت کرتے ہیں۔

زیرِ انتظام قبائل

مذکورہ بالا تمام یا اکثر قبیلے قبائلی علاقوں میں رہتے ہیں یا اس کے ساتھ بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ بہت سے دیگر قبائل اور قبیلے جو ہیں تو اصلی پٹھان لیکن پہاڑیوں سے ان کا رابطہ مختلف حدود تک ٹوٹ چکا ہے۔ جو زیر انتظام ضلعوں میں رہتے ہیں۔ یہ گروہ اپنے پٹھان ورثہ اور رسم و رواج کو تو قائم رکھے ہوئے ہے

---

[1] - دیکھئے - ای - ای - آلیورز "ایکروس دی بارڈر آف پٹھان اینڈ بلوچ" (لندن، چیپ مین اینڈ ہال، ۱۸۹۰ء) ص ۱۲۱، ڈیوس مذکورہ بالا، ص ۶۶ + بارٹن محولہ بالا، ص ۵۳ + برجرے محولہ بالا، ص ۸۳۔

لیکن ایک مرکوز الزراعت زندگی اور حکومتی نظم ونسق کو تسلیم کرنے کی ضرورت نے اس کے قبائلی ڈھانچے کو بہت حد تک کمزور کر دیا ہے۔

داؤدزئی، محمدزئی اور خلیل وادئ پشاور کی جفاکش کسان برادری کی ریڑھ کی ہڈی ہیں، ہر گروہ کا اپنا اپنا مخصوص علاقہ ہے لیکن گڈمڈ دیہات بھی موجود ہیں۔ اگرچہ قبیلے کا اثر اب بھی مضبوط ہے پھر بھی یہ خارجی اقتصادی و سیاسی اثرات کے پیش نظر جو اس کے افراد کو متاثر کرتے ہیں اپنا کوئی مجموعی کردار ادا نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ عزت و غیرت میدانی و کوہی پٹھان کے لئے ایک ہی جیسی عزیز ہونے کے باوجود اول الذکر اسے صرف انفرادی بنیاد پر ہی قائم رکھ سکتا ہے کیونکہ وہ قبائلی اقدام کا سہارا نہیں لے سکتا۔ اس کا ایک جزوی نتیجہ یہ ہے کہ زرخیز وادی کے پیچھے پیچھے پر آباد پُرامن زرعی دیہات میں قتل کی وارداتیں اتنی زیادہ ہیں،

مزید جنوب کی طرف دو میدانی قبیلے کافی کثیر التعداد ہیں۔ وہ اس بات کے بھی غماز ہیں کہ پٹھان کردار مختلف سمتیں اختیار کر سکتا ہے اور قابلِ ذکر ہو سکتا ہے۔

بنّوچی :۔

بنوچی جو بنّوں شہر اور راس کے ارد گرد کے میدان میں رہتے ہیں زیر انتظام پٹھانوں کے لئے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو اہلِ کوہ کے لئے دَور۔ وہ غورغشت کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن مُغل، دُرّانی، پنجابی اور ہندوستانی خون کا امتزاج ہیں، جس میں غالباً ترک، ایرانی اور قدیم خون کا شائبہ بھی موجود ہے۔ وہ سات علیحدہ علیحدہ طائفوں میں منقسم ہیں۔ بنّوں بازار پورے سرحد کی اشیائے تجارت کی منڈی ہے اور شہر کے ارد گرد کے کھیت اور باغات قریبی پہاڑیوں کو خوراک مہیا کرتے ہیں۔

خٹک :۔

خٹکوں کو ایک مستند بیرونی عالم نے پورے سرحد میں پٹھانوں کے احسن ترین نمونے[1] قرار دیا ہے اور ان کے بہت سے ہمسائے بھی اسی رائے کے مالک ہیں۔ قبیلہ اہلِ کوہ کی ساری ہمّت و جارحیّت کا بھی حامل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے افراد آپس میں بھی اور دوسروں کے ساتھ معاملات میں بھی

---

[1]۔ ڈیوس، محولہ بالا، ص ۴۷۔

کافی حد تک صاف گوئی اور تحمل سے کام لیتے ہیں۔ وضع قطع میں وہ ایک مضبوط اور لطیف اندام لوگ ہیں اور اپنی صفائی کے لئے مشہور ہیں۔ وہ اپنے اختیار کردہ دوگونہ پیشیوں جنگجوئی اور کاشتکاری کے اہل بھی ہیں اور ان پر مطمئن بھی۔

قبیلہ غورغشت کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور زیادہ تر جغرافیائی بنیاد پر تین حصوں، یعنی خٹک، اکوڑہ خٹک اور ساغری خٹک میں منقسم ہے۔ جن میں سے آخر الذکر شرق سندھ میں رہتے ہیں۔ خٹک زمینیں دریائے سندھ کے ساتھ اٹک کے اوپر سے لے کر کوئی پندرہ میل تک کالا باغ کے شمال تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جنوبی حصہ مغرب کی طرف وادئ کرم کے دہانے تک چلا جاتا ہے ستی خٹک ضلع کوہاٹ اور اکوڑہ خٹک مردان کے شمالی حصہ میں آباد ہیں۔ قبائلی علاقہ میں کوئی خٹک نہیں، تاریخی لحاظ سے خٹک دیگر قبائل کی نسبت قریباً ایک قوم کہلا سکتے ہیں۔ جب سے وہ تیرھویں اور چودھویں صدی سے اپنے موجودہ علاقے میں آئے ہیں پورا قبیلہ کم و بیش ایک ہی سردار کے ماتحت رہا ہے اور مساوات جس کا ہر آدمی طلبگار تھا، یہاں نیم نراجی کیفیت نہ پیدا کر سکی جو دوسرے قبائل پر مسلط رہی[1]

---

[1]۔ خٹک روایت کے مطابق قبیلہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے۔ چار (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خٹک مہذب مغلوں سے ہی بڑے قریبی تعلقات رکھتے تھے ایک خٹک سردار اکوڑ نے اٹک گھاٹ اور پشاور کے راستے کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کی اور شہنشاہ اکبر نے جاگیر عطا کی۔ خوشحال خان نے مغلوں سے قطع تعلق سے پہلے اجمیر میں ایک قلعہ پر قبضہ کیا جو کئی مغل جرنیلوں کے لئے دردِ سر بنا رہا تھا۔[2]

(بقیہ حاشیہ)
پٹھان بھائی، لقمان، عثمان، اتمان اور جدران اکٹھے شکار کھیل رہے تھے۔ انہیں چار برقعہ پوش لڑکیاں ملیں، عثمان، اتمان اور جدران قرعہ ڈالنا چاہتے تھے لیکن لقمان نے سب سے بڑا ہونے کی بنا پر حق اولیت مانگا، اس نے بہترین ملبوس کی لڑکی پسند کی جب پردے ہٹائے گئے تو وہ بدصورت ترین نکلی۔ دوسروں نے طعنہ دیا "لقمان خٹ یعنی کیچڑ میں چلا گیا" اور اس کی اولاد خٹک کہلائی۔ عثمان نو فرا در بدنما تھا۔ کچھ مہمانوں نے اس کے نوکروں سے پوچھا "وہ کیا یا کون ہے؟" نوکروں نے جواب دیا "وہ بھی آفریدہ یعنی خدا کی مخلوق ہے" لہٰذا عثمان کی اولاد آفریدی کہلائی۔ برسبیل تذکرہ اتمان کی اولاد اتمان خیل کہلاتی ہے۔ دیکھئے "تاریخ مرصع" از افضل خان، تحریر کردہ قریباً ۱۷۹۰ء "خالد افغانی" کے ترجمہ ٹریور چیپل پلاؤڈن (لاہور، منشی گلاب سنگھ ۱۸۹۳ء) ص ص ۱۸۷ تا ۱۸۸

---

[2] ایف۔ ایچ پولک "رف نوٹس آن خٹکس آف دی تیری کنٹری اینڈ دی خود آن دی رائٹ بینک آف دی انڈس بیلو اٹک"، سیلیکشنز فرام دی پبلک کارسپانڈنس آف دی ایڈمنسٹریشن فار دی افیئرز آف دی پنجاب، (لاہور ۱۸۵۷ء)، I، ۴۱۔

خٹکوں نے بہت ابتداء میں ہی سماجی تنظیم اور ثقافت کا ایک نسبتاً اعلیٰ معیار حاصل کر لیا۔ قبیلے کے ذیلی حصّے دیگر پٹھان گروہوں کے مقابلے پر زیادہ مخلوط ہیں اور ایک قسم کی خونی اشرافیہ موجود ہے۔ مشہور ترین طائفے خان خیل جن سے ینی اور اکوڑہ خٹکوں کے تمام سردار ماخوذ ہیں اور فقیر خیل ہیں جو خوشحال خان خٹک کے ایک بھائی کی اولاد ہیں۔

پوئندے :۔

سرحد کے بعض متصل پہاڑی قبائل کی موسمی ہجرت کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے لیکن سب سے بڑی اور اہم ترین ہجرت پوئندوں میں وقوع پذیر ہوتی ہے جنہیں افغانستان میں کوچی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ موسم خزاں میں افغان سطوح مرتفع سے آتے ہیں۔ وہ خیبر، کرم، ٹوچی، گومل اور سینکڑوں چھوٹے چھوٹے گمنام راستوں سے سرحد عبور کرتے ہیں اور سرحد اور سرحد کے پار سندھ اور پنجاب تک پھیل جاتے ہیں، موسم بہار میں وہ افغانستان واپس جاتے ہیں اور اکثر

ہزارہ جات میں سے گزرتے ہیں، جہاں وسطی افغانستان کی بلند سطح مرتفع پر ہزاروں سے ان کی جھڑپیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ نقل مکانی ہر سال ہوتی ہے اور اس میں ایک تا تین لاکھ لوگ شامل ہوتے ہیں۔

پوئندہ کا معنی محض خانہ بدوش ہے جیسا کہ یہ سرحد میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اکثر خانہ بدوش پٹھان ہوتے ہیں اور وہ قریباً سبھی پشتو بولتے ہیں۔ وہ پٹھانوں کی غلزئی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا تاریخی وطن قندھار اور میدان غزنی ہے۔ ان کے اہم تر قبائل سلیمان خیل، علی خیل، اکا خیل، ترکئی، ناصر، لوحانی، ہوتک اور خروٹی ہیں۔

اس ہجرت میں بظاہر کوئی تنظیم اور یکسانیت نہیں ہوتی بعض حالتوں میں پورے کے پورے گاؤں یکمشت حرکت کرتے ہیں اور اپنے گلوں کو ساتھ لیے ہوئے سرحدی پہاڑی کی مشرقی اطراف میں اپنے گرمائی خیمے لگا لیتے ہیں۔ دوسرے گروہوں میں ایسے افراد شامل ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے اہل و عیال راستے میں کہیں چھوڑ دیے ہیں اور وہ پاکستان میں صرف اشیائے تجارت لانا چاہتے ہیں۔ کسی وقت پوئندے وسط ایشیا اور ہندوستان کے درمیان کاروانی تجارت کے اہم حمال و نقال تھے لیکن موجودہ ایام میں ان کی اکثر درآمدات خام اور بعض طور پر کمائی ہوئی کھالیں اور رال ٹپکاتی ہوئی عماراتی لکڑی پر مشتمل ہوتی ہیں جو افغان سطوح مرتفع میں ملتی ہے۔

کچھ گروہ خوشحال ہوتے ہیں اور وسط ایشیا کے تمام تعیش کے

ساتھ سفر کرتے ہیں۔ مویشیوں اور اونٹوں کے ریوڑ، فرنیچر، خدام اور با افراط غذائی ذخائر۔ کچھ اور فلاکت زدہ ہوتے ہیں اور وہ سخت ترین زرعی مزدوری کے بدلے اپنے چند جانوروں کے لئے خوراک اور چارہ حاصل کرتے ہیں۔ چند کے پاس جانور ہوتے ہی نہیں اور وہ حتی الوسع بنجر علاقے سے دُور دُور رہ کر پیدل سفر کرتے ہیں۔ معدودے چند ساہوکار ہوتے ہیں جنہیں سندھ اور پنجاب کے دیہات میں روایتی لیکن غلط طور پر "کابلی" کہا جاتا ہے، جہاں وہ چند روپے اصل زر پر سینکڑوں گنا منافع کماتے ہیں۔

ڈیورنڈ لائن جس نے تاریخ پر اتنا طویل اور خونی نشان چھوڑا ہے۔ سابقہ ایام میں پوندوں کے لئے کوئی مسئلہ پیش نہ کرتی تھی۔ روایتاً وہ نادانستہ طور پر اس سے گزر کر کسی دور افتادہ پہاڑی علاقے کی طرف آتے اور جاتے رہے ہیں یا باقاعدہ سرحدی ناکوں پر محافظوں کی رسمی کارروائیوں کے بغیر ہی گزرتے رہے ہیں۔ پاکستان میں انہیں چینی اور گندم کے راشن کارڈ اور دیگر مراعات بھی دی جاتی ہیں جو یہاں کے مستقل باشندوں کو حاصل ہیں[1]۔

---

[1]- یہ اصل میں انگریزوں کے جاری کردہ طریقہ کار کا ہی تسلسل ہے جو انہوں نے سرحد پر قبضہ کرتے ہی شروع کیا تھا۔ دیکھئے میمورنڈم "ڈیرہ اسماعیل خان" سیلیکشنز فرام دی ریکارڈز آف دی گورنمنٹ آف انڈیا، ۱۸۵۲ء (کلکتہ، گورنمنٹ آف انڈیا)

سالہا سال تک حکومت پاکستان نے ہجرت کو روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ پوندے مطلوبہ موسمی زرعی مزدوری بہت سستے داموں مہیا کرتے تھے اور پھر واپس جاتے ہوئے سرحد کی پاکستانی طرف کے رہنے والے لوگوں کی نسبتاً خوشحالی کے قصے افغانستان لے جاتے تھے[1]۔ پچھلے سالوں میں اسلحہ میں اضافہ کی وجہ سے (جو غالباً ان میں بڑھتی ہوئی خوشحالی کا بھی غماز ہے) خانہ بدوش اب لوٹ مار کرنے والے قبائلیوں کے حملوں کا بھی بہتر طور پر مقابلہ کر سکتے ہیں (زیادہ تر وزیر اور محسود)

سادات اور میاں ہر

علاقے پہاڑی قبائل کے ہوں یا زیر انتظام قبائل کے، ان میں سادات اور میاں خاندان پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا دیہی زندگی پر بہت اثر ہے جو عموماً بانی خاندان کے تقدس کی بدولت ہوتا ہے۔ سادات آنحضور ؐ کے براہ راست اخلاف ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہ عموماً کچھ موروثی مذہبی فرائض ادا کرتے ہیں۔ یہ زیادہ تر قانونی

---

[1] - اس باب کے پریس میں چلے جانے کے بعد حکومت پاکستان نے نئی پالیسی کے تحت ۶۲ - ۱۹۶۱ء کی سردی میں پوندوں کے لئے سرحد بندی کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمی لوگوں کی یہ آخری بڑی (سالانہ) ہجرت بالآخر ختم ہو گئی ہے۔

اور تقریباً اتی ہوتے ہیں سادات قبائل کے درمیان بہت فتنہ و فساد

کا موجب بنتے رہے ہیں پھر بھی سید اتنا مؤثر نہ ہوتا جتنا ملا یا

پیر جو اپنے اختیار کردہ مذہبی کردار کے علاوہ قبیلے کے جنگجو طبقات

کا جزوِ لاینفک ہے۔ سادات قریباً آپس میں رشتے ناطے کرتے ہیں

لیکن دیگر ہر لحاظ سے وہ اپنے ہمسایوں جیسے ہی ہیں ان میں سے بہت

کم ہی عربی جانتے ہیں اور وہ ثقافت کے اعتبار سے مکمل پٹھان

ہی ہیں۔ سادات خاندان سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی لیکن آخر الذکر

اول الذکر کی نسبت اپنے لوگوں پر زیادہ گرفت رکھتے ہیں۔ انیسویں

صدی میں امیران افغانستان نے برطانوی اثر و رسوخ کو زائل کرنے

کے لئے اکثر و بیشتر سادات کو قبائل کے درمیان فرقہ وارانہ منافرت

پھیلانے کے لئے استعمال کیا۔

میاں بھی موروثی خاندان ہیں۔ وہ ایک لحاظ سے ہندو

بھارت کے برہمنوں سے ملتے ہیں گو ان کا برہمن یا سید کی طرح

کوئی براہ راست مذہبی کردار نہیں ہے۔ خاندان عموماً اپنے بانی

کے علم و حکمت کی بدولت اعزاز حاصل کرتا ہے، اگرچہ ان پڑھ

"میاں" بہت سے ہیں پھر بھی اکثر خاندان اوسط سے زیادہ تعلیم یافتہ

ہوتے ہیں اور مختلف عالمانہ پیشے اختیار کرتے ہیں جیسے معلمی،

طب وغیرہ۔ میاں بھی عموماً آپس میں ہی رشتے ناطے کرتے ہیں لیکن

وہ سادات کی نسبت قبیلے کے نظام سے زیادہ مربوط ہوتے ہیں۔

پشاوری:

سرحد کے دارالحکومت کے لوگ محض پشاوری کہلاتے ہیں۔ وہ پٹھان علاقوں کے وسیع المشرب لوگ ہیں۔ شجرۂ نسب میں ان کی کوئی جگہ نہیں حالانکہ وہ ثقافتاً مکمل طور پر پٹھان ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک علیحدہ نسل ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نسل کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، نمایاں ترین عنصر غالباً کشمیری ہے۔

پہلا انگریز جو ۱۸۰۹ء میں شہر پشاور میں آیا تھا اس نے اس کے باشندوں کی تعداد قریباً ایک لاکھ بتائی اور ان کے متعلق لکھا:
"تمام اقوام والسنہ کے لوگ، ہر قسم کے لباس اور شکل وشباہت کے، شہر کے سفید پگڑیاں پہنے ہوئے ملے جلے لوگ کچھ سفید یا نیلے چغے اور دوسرے پوستینوں میں ملبوس.... ایرانی اور افغان بھورے اونی لبادے اور کالی پوستینیں یا رنگین ریشم کی ٹوپیاں اوڑھے ہوئے۔ خیبری اپنے مزری کے چپلوں اور بے ہنگم لباس میں اپنے پہاڑوں کی سربلندی لئے ہوئے... ہزارے اپنی پوستین کی مخروطی ٹوپیوں کی وجہ سے ممتاز نہیں جن کی اون سرے کی تجاف معلوم ہوتی ہے اور نہ ہی اپنے چوڑے چہروں اور چھوٹی آنکھوں کی وجہ سے بلکہ داڑھی کے فقدان کی وجہ سے نمایاں ہیں جو شہر کے ہر دوسرے چہرے کی زینت ہے۔ چند عورتیں اپنے لمبے لمبے سفید برقعوں میں ملبوس جو

ان کے پاؤں کو چھوتے ہیں [1]......"

بیس سال بعد جب عظیم سیاح چارلس میسن ہاتھی پر سوار اس شہر سے گزرا جس پر اس نے درہ کوہاٹ عبور کیا تھا تو اس نے مخلوط نسلوں کا ایک عجیب و غریب امتزاج "تاجیک، ہندکی، پنجابی، کشمیری وغیرہ المعروف بہ بدقماش و مقدمہ باز دیکھے [2]۔

مزید پچیس سال بعد ہربرٹ ایڈورڈز نے، جو سرحد میں رہائش رکھنے والے اولین برطانوی منتظمین میں سے تھا، شہر کے متعلق لکھا "یہ وحشی اور جنگجو لوگوں کی ایک بڑی، معروف اور روز افزوں آبادی کا شہر ہے جو سب چاقوؤں اور خنجروں سے مسلح ہیں اور قدرتی طور پر اپنے دلائل بشوکِ شمشیر منوانے کی طرف مائل ہیں [3]...."

شہر کے مخلوط کردار کا تسلسل ۱۸۶۸ء کی پہلی مردم شماری میں بھی ظاہر ہوا۔ اس نے شہر میں کم از کم اکتیس بڑی ذاتیں، قبائل اور نسلیں شمار کیں جن میں تعجب خیز طور پر ستره امریکی بھی تھے۔ پشتون

۱- ایلفنسٹن، ایضاً، ص ص ۵۶ تا ۵۷

۲- میسن، ایضاً، جلد اول، ۱۳۴،

۳- ہربرٹ بی ایڈورڈز "میموریلز آف دی لائف اینڈ لیٹرز آف میجر جنرل سر ہربرٹ بی ایڈورڈز" ۲ جلدیں (لندن، کیگن پال، ٹرینچ اینڈ کمپنی ۱۸۸۶ء) جلد اول، ۲۲،

کے لحاظ سے اس کی تقسیم کچھ یوں تھی ۔ ۲،۶۶۷ سرکاری ملازم ۱۴۵۲ پولیس ملازمین، ۲۱۵ ملا، ۴ طابع، ۱ جراحی ۵، منشیات فروش، ۱۱۴۲ آہنگر، ۱۷۰۱ صراف، ۸۰۶ بھکاری، ۱۲۰۱ گلوکارائیں، ۱۴۷ رقاصائیں اور ۳۰۷ طوائفیں[1]

بعد کے بیانات میں بھی غیر ملکی چاشنی موجود ہے اور پشاور آج بھی سیاح کے دل کو گدگداتا ہے اور اسے صاف شفاف قلم آزمائی پر ابھارتا ہے۔ یہ شہر کبھی منڈی یا صنعتی مرکز کی وجہ سے مشہور نہیں رہا۔ اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ بین الاقوامی تجارت کی شاہراہوں کا سنگھم اور پورے سرحد کا اعصابی مرکز ہے۔ یہ انتظامی اور فوجی صدر مقام بھی ہے اس کا جادوئی اثر (خواہ دھیما ہی سہی) قبائلی ایجنسیوں کے دور دراز ترین کونوں تک پہنچتا ہے اور اس کے بازار اور مساجد قریباً ہر پٹھان کو اس کی زندگی میں ایک دفعہ مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں تاکہ وہ اس کے مناظر دیکھ سکے اور اس کی آوازیں

---

[1] ۔ گورنمنٹ آف انڈیا، سنٹرل ایشیا، پارٹ ون ''اے کنٹری بیوشن ٹوورڈز بیٹر نالج آف دی ٹوپوگرافی، ایتھنوگرافی سٹیٹکس اینڈ ہسٹری آف دی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر آف برٹش انڈیا'' مؤلفہ سی ایم میک گریگر ۳ جلدیں (کلکتہ سپرنٹنڈنٹ آف گورنمنٹ پرنٹنگ ۱۸۷۳ء) جلد دوم، ۵۸۵ ،

سن سکے [1] شہر وادی کا جگمگاتا ہوا گھنا ہے اور پڑیا کی سیاح کو بہت سی خوشیاں دینے کے علاوہ اہلِ کوہ کے نشکرے کم از کم خواب و خیال کا ہمیشہ سے ایک مرکزِ نگاہ رہا ہے۔

پرانے شہر کے مغرب میں ایک صاف ستھری چھاؤنی ابھری ہے جس کی سڑکیں کشادہ اور پُر اشجار ہیں اور جس کے باغات پُر بہار ہیں۔ یہاں اہلِ مغرب اور پاکستانی افسروں کے دفاتر اور کاشانے ہیں جو سرحد کے دروبست کے ذمہ دار ہیں۔ غروبِ آفتاب پر شہر اور چھاؤنی کے دروازے اب بھی بند ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر پُرامن لوگ اندھیرے کے بعد بھی کسی رسمی پابندی کے بغیر آ جا سکتے ہیں لیکن خال خال ہی ایسا کرتے ہیں اور وہ بھی مبہم جوئی کی ایک ہلکی سی تھرتھری اور اس تلخ یاد کے ساتھ کہ آفریدیوں نے ۱۹۳۰ء میں شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

---

[1] - پشاور کی نئی اور تیز افزوں یونیورسٹی اسے ایک دفعہ پھر ایک تعلیمی مرکز بنا رہی ہے۔ ایلفنسٹن نے (ایلفنسٹن ایضاً، ص ۱۸۹) انیسویں صدی کے اوائل میں دیکھا تھا کہ پشاور میں بخارا کے طلباء بخارا میں پشاوری طلباء سے زیادہ تھے۔ ہشت نگر کے ملاؤں کا علم و فضل اور زہد و اتقاء انیسویں صدی کے اواخر تک عالم اسلام کے طلباء کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

دیگر لوگ ہر

پٹھان جب سے سرحد میں آئے ہیں وہ اس علاقے پر غالب رہے ہیں۔ پھر بھی کچھ غیر پٹھان عناصر اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھے ہوئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے غیر مسلم قبیلے اور ذاتیں جو ۱۹۴۷ء سے پہلے سرحد (مشمولہ وحشی ترین قبائلی علاقوں) میں بکھرے ہوئے تھے ہندوستان ہجرت کر گئے ہیں گو تھوڑے سے ہندو اور بقول بعض سکھ بھی مختلف پٹھان قبیلوں کے تحفظ میں بحیثیت افراد موجود ہیں۔

بلوچ قبائلی جو پاک افغان سرحد کے ساتھ ساتھ جنوب میں رہتے ہیں ڈیرہ جات کے حصوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس قبیل کے چند گروہ اپنی مخصوص زبان اور رسومات قائم رکھے ہوئے ہیں لیکن اکثر پشتو قبول کر چکے ہیں، اور پٹھان قبیلوں میں گھل مل گئے ہیں۔ سرحد کے وسطی حصے میں مختلف ہندی الاصل مسلمان گروہ بکھرے ہوئے ہیں ان تمام کو ہندکی کہا جاتا ہے ان میں اہم ترین گوجر ہیں جو یوسفزئیوں میں مرکوز ہیں اور ان کے کاریگر اور مزارع ہیں۔ گوجر اور انہی جیسا گروہ اعوان ہر لحاظ سے پٹھانوں سے ملتے جلتے ہیں اور سرحد کے باہر یا دور وہ یوسفزئی کہلاتے ہیں، لیکن قبائلی ہیئت میں ان کی کوئی جگہ نہیں اندرون سرحد انہیں سماجی طور پر گھٹیا سمجھا جاتا ہے گو وفادار اور محنتی طفیلی سیاروں کے طور پر۔

شرقی سندھ کے ضلع ہزارہ کے باشندے مخلوط النسل ہیں۔ ان کی ثقافت اور حسب و نسب پٹھانوں کی نسبت زیادہ تر پنجابی اور کشمیری ہے لیکن ہزارہ کے قریباً بیس فی صدی لوگ پشتو بولتے ہیں اور کئی جداگانہ قبائلی گروہ بندیاں ہیں۔ ان میں اہم ترین جدون، ترین، دلازک، ترخیلی اور مشوانی ہیں۔

جدونوں کا علاقہ ہری پور کے عین اوپر سے شروع ہو کر مانسہرہ کے عین جنوب تک جاتا ہے اور اس میں ضلعی صدر مقام ایبٹ آباد بھی شامل ہے۔ وہ غورغشت کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور سترہویں صدی میں غرب سندھ سے موجودہ علاقے میں آئے۔ قبیلہ کے تین بڑے حصے ہیں۔ حسن زئی، سالار اور منصورہ۔ ترین ہری پور کے جنوب اور مغرب کے میدان پر قابض ہیں۔ وہ سٹر بنی پٹھان ہیں اور انگریزوں اور سکھوں کے خلاف بہت عرصہ لڑتے رہے ہیں اور اس پر بہت فخر کرتے ہیں۔ ان کا ممتاز ترین چشم و چراغ آج کل محمد ایوب خان، صدر پاکستان ہے۔

دلازک کا کہنا ہے کہ انہیں افغانستان سے مغل شہنشاہ نے بابر نے نکالا۔ وہ تعداد میں تھوڑے ہیں لیکن اپنا جداگانہ وجود قائم رکھے ہوئے ہیں۔ وہ زیادہ تر ہری پور میدان کے مشرقی سرے پر رہتے ہیں۔ ترخیلی ضلع ہزارہ کے انتہائی جنوب مغربی کونے میں رہتے ہیں، سندھ کے ساتھ ساتھ اور راٹک سے کچھ زیادہ اوپر نہیں۔ وہ صرف چند

ہزارہیں، مشوانی ترخیلیوں کے شمالی ہمسائے ہیں۔ ان میں سے بہت سے دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سید بھی ہیں اور پٹھان بھی۔ وہ بھی سکھوں کی مزاحمت کرتے رہے ہیں۔ ضلع ہزارہ کے شمالی حصہ گلگت اور شمال مشرق کی طرف پھیلی ہوئی ایک بڑی قوس میں جو ہمالیہ کے بیچ میں سے سندھی کوہستان، بالائی سوات اور چترال کو جاتی ہے۔ ایسے لوگ رہتے ہیں جنہیں پٹھان کوہستانی کہتے ہیں۔ اس ملغوبہ میں بہت سے مختلف زبانیں اور نسلی گروہ ہیں لیکن سب کے سب ایک دوسرے سے ایک خاص مشابہت بھی رکھتے ہیں۔ وہ مرور زمان کے دوران منگول، چینی، ایرانی اور پٹھان خون کا برصغیر کے ابتدائی آریہ حملہ آوروں کے خون سے امتزاج کا ثمرہ معلوم دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض جیسے ہُنزہ کا شاہی خاندان سکندری یونانیوں کی براہ راست اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اس علاقے میں شیعہ فرقہ غالب ہے جس کے ماورائے ہمالیہ سنکیانگ میں کاشغر کے اردگرد کے علاقے کے ساتھ گہرے ثقافتی تعلقات ہیں۔ ایک گروہ کافر، جو جنوبی چترال کی تین چھوٹی چھوٹی وادیوں میں رہتا ہے، کبھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوا اور ابھی تک ایک قسم کی فطرت پرستی کا قائل ہے۔ سواتی نامی ایک، بڑا گروہ پٹھان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور سندھ کے دونوں طرف بالائی حصوں میں رہتا ہے۔ یہ لوگ بظاہر وادئ سوات کے اصلی باشندے تھے اور

یہی ان کی وجہ تسمیہ ہے ۔ انہیں یوسفزئیوں نے سترہویں صدی میں نکال باہر کیا ۔ اگر وہ پٹھان جمعیت کا حصہ بھی تھے تو بھی وہ دورِ حاضر میں اس سے بہت حد تک کٹے ہوئے ہیں اور انہیں سوات کے موجودہ باشندوں سے منسوب نہیں کرنا چاہیئے جن میں سے اکثر یوسفزئی پٹھان ہیں جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ۔

ہمالوی گروہوں میں اہم ترین چترالی ہیں ۔ یہ لوگ سرحد کے انتہائی شمال مغربی کونے میں رہتے ہیں ۔ ان کی زبان خوار یا کھوار ہے اور اس میں ان کا علاقہ کھو کہلاتا ہے ۔ وہ قریباً ایک لاکھ ہیں اور ۱۱ ہزار فٹ اونچے درہ لواری کے ذریعے دیر اور سوات سے علیحدہ ہو جاتے ہیں ۔ جو جنوب کی طرف سے ریاست میں داخل ہونے کا واحد قابلِ گزر راستہ ہے ۔

چترالیوں کے تین بڑے حصے ہیں (۱) آدم زادہ جو شرفاء کا طبقہ ہے اور جس کا سربراہ مہتر چترال کا خانوادہ ہے (۲) اربا زادہ جو چھوٹے چھوٹے اہلکار اور تجارت پیشہ لوگ ہیں اور (۳) فقیر، مساکین جو غرباء ہیں ٭

٭ ۔ اکثر لوگ محنتی اور بے ضرر ہیں لیکن آدم زادہ کی خاندانی تاریخ اتنی ہی خونریز ہے جتنی کہ دنیا میں کسی حکمران گروہ کی ہو سکتی ہے ۱۸۹۲ء میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)

جب مہتر اعظم امان الملک مرا تو ۱۷ میں سے اس کے ۱۶ بیٹے جنگ تخت نشینی میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ یہ مسئلہ بالآخر اس وقت حل ہوا جب انگریز آدھمکے اور انہوں نے باقی ماندہ بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔ شجاع الملک ایک ذہین، قابلِ اعتبار، چھوٹا سا لڑکا، نو یا دس سال کا۔" دیکھئے مری فرنیک اور جارج جان ینگ ہسبینڈ "دی ریلیف آف چترال" (لندن، میکملن، ۱۸۹۵ء) ص ۱۷

باب سوم

سماجی تنظیم

تعارف :

اپنی خونخواری اور ناقابلِ رسائیت کی وجہ سے پٹھان دنیا کے دیگر بہت سے "قدامت پیوستگان" کے مقابلے پر ایک بلاٹ یعنی سیاہی کے دھبوں کے جائزوں، نفسِ پیمائی اور شماریاتی بشریات کی جانچ پڑتال سے بہت کم گزرے ہیں۔ لہٰذا ان کی کردار نمائی کی ہر کوشش کا انحصار بنیادی طور پر انہی کی تحریرات اور افعال پر ہو گا اور ثانوی طور پر ان معدودے چند بیگانوں کے تجربات پر ہو گا جنہوں نے ان سے قریبی رابطہ پیدا کیا ہو۔

ایسے مطالعہ سے جو اہم تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پٹھان کا وصفِ اعلیٰ اس کی انفرادیت پسندی ہے اور یہ قبائلی رکنیت کے مقرر کردہ کٹر رویہ جاتی معیارات کے باوجود۔ تاہم کئی اہم روایاتی اور سماجی عوامل ہیں جو اجتماعی زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں اور اکثر حالتوں

میں افراد کے اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ انہیں معین کرتے ہیں۔
یہ عادات و اطوار پٹھان علاقے کے مختلف حصوں میں کافی حد تک
مختلف ہیں اور ان کو ضبط تحریر میں لانا قریباً ناممکن ہے لیکن ان
میں سے بعض ہر جگہ یکساں ہیں اور ان کا کچھ علم ضروری ہے تاکہ یہ سمجھا
جاسکے کہ پٹھان کیا ہے اور وہ اس نہج تک کیسے پہنچا۔

پختون ولی:-

خوشحال خان نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے'
میں اس شخص سے نفرت کرتا ہوں جو اپنی زندگی عزت سے
نہیں گزارتا
عزت کا لفظ ہی مجھے پاگل بنا دیتا ہے،
اور پاگل آدمی کو سود و زیاں کی کیا پرواہ؟''

عزت کے تقاضے پختون ولی میں مضمر ہیں جسے بعض اوقات
ننگ پختون یا پختون ضابطۂ حیات بھی کہا جاتا ہے۔ پشتو بولنے
والے پورے علاقے میں شاید کوئی ایسا بچہ اور بچی بھی نہ ملے جو پختون
ولی کے اہم عناصر سے آشنا نہ ہو۔ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی پٹھان تاریخ
اور روایت کے مطابق اس سے بھی قدیم تر۔ پشتو میں اس پر
طویل و مبسوط تفسیریں لکھی گئی ہیں اور اس کے بعض لطیف نکات
علماء و فضلا کے درمیان ایک غیر مختتم موضوع سخن بنے رہتے ہیں۔

لیکن اکثر و بیشتر عمومی فلسفیانہ تصورات جن پر نظام قوانین ایستادہ ہے پٹھان کی پہنچ سے بہت باہر ہیں اور عام قسم کے قواعد و ضوابط لا اپنے بے شمار اوامر و نواہی اس کے سامنے پیچ ہیں لہٰذا وہ اپنی زندگی چند سادہ سے اصولوں کی بناء پر گزارتا ہے۔

بَدل :

ان میں سے اولین اور عظیم ترین بدل ہے یعنی بدلہ جس کی کتنی بھی قیمت کیوں نہ دینی پڑے یا کتنے بھی نتائج کیوں نہ بھگتنے پڑیں ایسے شواہد موجود ہیں کہ ابتداً بدلہ صرف مظلوم ہی لے سکتا تھا اور بصورت قتل مقتول کا خاندان' صرف اس فرد سے جس نے نقصان پہنچایا ہو[1] لیکن بدلے کی پابندی مدتوں سے مورد توہین یا مجروح قبیلہ بہ حیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے اور اس کا مداوا اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ فرد متعلقہ اور جارح قبیلہ کے خلاف کارروائی کی جائے اس کا نتیجہ خونیں جھگڑوں کی صورت میں نکلا ہے جو بین القبائلی تعلقات کو متاثر کرتے ہیں جو پورے کے پورے خاندانوں اور چھوٹے چھوٹے قبیلوں کو نیست و نابود کرنے کے ذمہ دار ہیں[2] بدل میں زمان و مکان کی

1- دیکھیے گورنمنٹ آف انڈیا، سنٹرل ایشیا، پارٹ I' III' ص ۲۶۶

2- دیکھیے بیلیں' ایضاً' ص ۸۲

کوئی قید نہیں اور انتقام گیری ضروری ہے جب تک قبیلہ کا ایک فرد واحد بھی زندہ ہو۔ کلکتہ اور سنگاپور جیسے غیر پٹھان ماحول میں کبھی کبھار کا کشت و خون کسی ایسے جھگڑے کا نتیجہ ثابت ہوتا ہے جو تیراہ یا گومل میں کسی مدتِ بعید میں شروع ہوا تھا۔

میلمتیا:

پختون ولی کا دوسرا اہم ترین تقاضا میلمتیا یا مہمان نوازی اور مہمان کا تحفظ ہے۔ قبائلی اس پر اس حد تک عمل کرتے ہیں کہ وہ بسا اوقات مہمان کے لئے باعثِ زحمت ہو جاتا ہے خواہ وہ ایک غیر ملکی ہو جو جانتا ہے کہ وہ کبھی اس کا بدلہ نہ چکا سکے گا، اور خواہ ایک ہم قبیلہ ہو جو ڈرتا ہے کہ موقع آنے پر وہ اس کا پورا بدلہ چکانے سے قاصر رہے گا۔ میلمتیا تحفظ اور خورد و نوش کی دوگونہ پابندی عائد کرتا ہے، گو یہ پابندی اسی لمحہ ختم ہو جاتی ہے جب مہمان میزبان کی دہلیز سے باہر قدم رکھے یا اس کی علاقائی ذمہ داری کی حدود سے نکل جائے۔ کبھی کبھی تحفظ کا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سیاح کو کسی خاص سردار یا قبیلے کا مہمان قرار دے دیا جاتا ہے جب تک وہ پٹھانوں میں رہے اس کی روایتی علامت ایک خنجر یا لباس ہوتا ہے جو ذمہ گیر سردار کی طرف سے دیا جاتا ہے اور جسے مہمان نشانِ محافظت کے طور پر پہن لیتا ہے۔ کسی اجنبی یا ایلچی

یا دشمن کے لئے ایک رسمی محافظ دستہ یا ضمانت تحفظ بارگہ کہلاتا ہے۔[1] کسی مسلمہ مہمان پر کسی قسم کوئی سختی نہیں کی جاتی اور نہ ہی اسے کوئی چوٹ پہنچائی جاتی ہے خواہ وہ کتنا بھی غریب یا خلاف طبع کا کیوں نہ ہو کیونکہ اولاً میلمستیا کی پابندی واجب التعمیل ہے اور ثانیاً ایسی صورت میں انتقام گیری میزبان پر لازماً ہوجاتی ہے۔ کوئی بھی جو کسی پٹھان یا بالخصوص اس کے گھر تک پہنچ سکتا ہے میزبان سے پناہ مانگ سکتا ہے خواہ ان کے سابقہ تعلقات کیسے بھی رہے ہوں۔ ایسے واقعات ہوئے ہیں جن میں بے گناہ لوگ اجنبیوں یا اپنے ذاتی دشمنوں کو بچاتے ہوئے مارے گئے جنہوں نے اپنے حریفوں کے تعاقب کی وجہ سے پناہ مانگی تھی۔

انگریز ارباب بست وکشاد عام طور پر پختون ولی کا احترام کرتے

---

[1] دربار کابل کے لئے برطانوی ایلچی الیگزینڈر برنز "کابل" اے پرسنل نیریٹو آف اے جرنی ٹو اینڈ ریذیڈنس ان دی سٹی ان دی ایئرز ۱۸۳۶ء تا ۱۸۳۸ء" (لنڈن جے مرے ۱۸۴۳ء) پختون ولی کی انتہائی کہانی میں افسانوی لیکن حقیقت پسندانہ طور پر بیان کی گئی ہیں یعنی "دی لورز آف قندھار" میں جو کاؤنٹ گوبی نیو کی "دی ٹیلز آف ایشیاء" (لنڈن، جیوفری بلیس، ۱۹۴۷ء) میں شامل ہے۔

تھے اور آزاد قبائل کو اس کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیتے تھے لیکن میلمستیا کی پابندیاں اکثر مشکلات پیدا کرتی تھیں۔ مشترکہ قبائلی ذمہ داری کے انگریزی اصول کے تحت حکومت اصرار کرتی تھی کہ قبائل زیرِ انتظام ضلعوں میں سنگین جرائم کے مرتکب افراد کو تحفظ نہ دیں اور انہیں حکومت کی تحویل میں دیدیں جو پہاڑیوں میں پناہ لے چکے تھے۔ انفرادی میزبان اور اکثر پورے کے پورے طائفے یہ بات نہ مانتے تھے اور کوئی بھی طرف اپنا اصول چھوڑنے پر تیار نہ ہوتی تھی۔ وظائف بند کر دیئے جاتے، مہمات بھی بھیجی جاتیں، پل اڑا دیئے جاتے اور دستوں کو نرغے میں لے لیا جاتا اور سرحد میں ایک اور فتنہ کھڑا ہو جاتا۔

سرحد کے اولین اربابِ نظم ونسق میں سے ایک نے (جس نے اپنے محکومین کی اور کوئی تعریف نہیں کی) اپنی سرکاری رپورٹ میں اعتراف کیا کہ "وہ سونا لے کر سب کچھ کر گزریں گے سوائے ایک مہمان کو دھوکہ دینے کے"۔ اس نے مزید لکھا "کوئی بھی جوان کے گھروں میں چلا جائے نہ صرف محفوظ ہوگا بلکہ اس کا پرتپاک استقبال کیا جائے گا"۔[x]

---

x۔ رچرڈ ٹمپل، "رپورٹ شوئنگ دی ریلیشنز آف دی برٹش گورنمنٹ ود دی ٹرائبز، انڈی پنڈنٹ اینڈ ڈی پینڈنٹ، آن دی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر آف دی پنجاب"، شمارہ ۱۱ "سلیکشنز فرام دی ریکارڈز آف دی گورنمنٹ آف انڈیا ۱۸۵۶ء (کلکتہ گورنمنٹ آف انڈیا)، ص ۵۵

میلمتیا کی واحد خلاف ورزی جو عموماً تسلیم کی جاتی ہے (گو یہ مرتکب کو بدل میں ملوث کر دیتی ہے) چھپ کر کسی بیرونی سیاح پر گولیاں چلانے کی رسم ہے جب وہ دشمن قبیلہ کی سرزمین پر ہو۔ یہ وزیرستان میں عام ہے، اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ارباب اختیار اس قبیلے کو زیر عتاب لے آئیں جہاں یہ جرم ہوا ہو۔ بدلہ اور مہمان نوازی پختون ولی کے دو عظیم احکامات ہیں۔ کئی دوسری واضح رسومات و روایات بھی ہیں جو قبائل میں مختلف درجوں کے اداروں کی شکل میں موجود ہیں اور پٹھان طرز زندگی کے مطالعہ میں قابلِ ذکر ہیں ۔

ننواتی در

ان میں ایک ننواتی کافی متنازعہ فیہ ہے۔ اکثر انگریز قلمکار مشمولہ بر مستند علما مثل ڈیوس اور کیرو ننواتی کو محض پناہ یا پناہ گاہ بتاتے ہیں یعنی کسی کو بھی حتیٰ کہ دشمن کو بھی مانگنے پر تحفظ دینے کی پابندی۔ کیرو ننواتی کو میلمتیا کی توسیع سمجھتا ہے اور اس کی یوں تعریف کرتا ہے "ایک حاصل مصدر یعنی اندر آنا[x]"،

---

[x]- کیرو، ایضاً ص ۳۵۱، ڈیوس، ایضاً ص ۴۹ + ایک قدیم تر برطانوی عالم ننواتی کی دوہری تعریف کرتا ہے "تحفظ جو کسی کو دیا جائے جو انتہائی مجبوری میں کسی کی چھت کے نیچے پناہ ڈھونڈے یا مصالحت جسے عموماً ایک کمزور فریق اختیار کرتا ہے تاکہ مجروح کے ساتھ صلح صفائی ہو سکے" بیجورے، ایضاً ص ۱۹ -

لیکن پٹھان خود اس تعریف کو تسلیم نہیں کرتے۔ پناہ اور ننواتی کے تصورات میلمستیا کے ہی حصے سمجھے جاتے ہیں۔ کم از کم آج کل ننواتی ایک مختلف چیز ہے، یہ ایک دشمن کے ہاں اندر جانا، یا اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنا ہے جو اس کے اختیار کنندہ کے لئے ایک شرمناک معنویت رکھتی ہے اور جس کو یہ پیش کی جاتی ہے اس پر قبولیت کی پابندی عائد کرتی ہے۔ مثلاً ایک قبائلی نے دوسرے کو ایسی زک پہنچائی ہے کہ اپنے خلاف بدلے کو دعوت دیدی ہے۔ وہ یا اس کا خاندان اتنے کمزور یا بزدل ہیں کہ نتائج نہیں بھگت سکتے۔ بدلہ سے پہلے ہی وہ اپنے دشمن کے پاس چلا جاتا ہے اقبال جرم کرتا ہے اور اپنے کو دشمن کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیتا ہے۔ مزید نیچا ہو کر وہ اپنی مستورات کو بھی ساتھ لے جاتا ہے' بے پردہ اور قرآن بدست تاکہ دشمن مطمئن ہو سکے۔ اگر دشمن مائل ہو تو وہ پشیمان سے بھیڑ لے سکتا ہے یا جرگہ ہو سکتا ہے اور بدلے کا حق اور پابندی ترک کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح ننواتی پناہ کی بجائے ہتھیار ڈالنا ہے۔

پٹھان جو ہیں سو ہیں لہٰذا سرحد میں یہ طریقہ اکثر استعمال ہوتا ہے۔

پٹھانوں کے لئے "ہبیس کارپس" (غیر قانونی حراست کے خلاف ملزم کا یہ حق کہ اسے اصالتاً عدالت میں پیش کیا جائے۔ مترجم) اور "ففتھ یا پانچویں امنڈمنٹ یا ترمیم" (امریکی دستور کا ایک ایسا ہی قانون جو حقوق ملزمین سے متعلق ہے۔ مترجم) کا کوئی معنی نہیں لیکن

قبائلیوں کی اپنی ہی قانونی اصطلاحات ہیں جو یکساں طور پر اہم تصورات کا احاطہ کرتی ہیں ایک جرگہ کسی شخص کو دشمن قرار دے سکتا ہے یعنی کسی کا سرکاری طور پر مسلمہ دشمن۔ اس کے تحت اول الذکر کو اسے مارنے کا حق مل جاتا ہے جسے جماعت نے تسلیم اور منظور کیا ہے اس کے برعکس جرگہ یہ بھی اعلان کر سکتا ہے کہ مقتول توئی (لفظی معنی گرا یا یا بہایا ہوا) ہے یعنی اس کی موت کسی موروثی جھگڑے کے تعاقب میں ہوئی، اب حساب برابر ہے۔ ادلے کا بدلہ ہو چکا اور انتقامی کشت و خون کا کوئی جواز نہیں۔

ایک اور قسم کا قتل جو پختون ولی کے مطابق جائز نہ ہونے کے باوجود بدقسمتی سے عام ہے میراتا کہلاتا ہے۔ یہ قتل اس لیے کیا جاتا ہے کہ مقتول کو سلسلۂ وراثت سے نکالا جا سکے تاکہ جائیداد قاتل یا اس کے پسندیدہ شخص کو مل جائے۔

اصناف کے باہمی تعلقات میں چغ اور تور کے تصورات اکثر ملوث ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کسی خاص لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے ڈر ہے کہ اسے کوئی اور لے جائے گا کیونکہ وہ اس کے خاندان کی مطلوبہ شرائط پوری نہیں کرتا یا پھر اس کی منگنی کی کہیں اور بات ہو رہی ہے تو وہ یکطرفہ اعلان کر دیتا ہے کہ اس کا اس لڑکی پر چغ یا حق ہے گویا اگر کوئی دوسرا اس پر اپنا حق جتائے تو اسے پہلے اس آدمی کا سامنا کرنا ہوگا (اس سے اگر وہ لڑکی نہ بھی لے

سکے تب بھی کم ازکم وہ اس کے رشتے کے مذاکرات میں کسی نہ کسی طرح ملوث ضرور ہوجاتا ہے)۔

تورہ ر

(لفظی معنی سیاہ) کھلم کھلا جرم یا سیاہکاری ہے۔ مثلاً اگر یہ پتہ چل جائے کہ کوئی عورت کسی آدمی کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھتی ہے تو اسے اس آدمی کے ساتھ تور (اور اس آدمی کو اس عورت کے ساتھ تورہ) قرار دے دیا جاتا ہے اور وہ دونوں مستوجب قتل ہوجاتے ہیں۔

شرمالہ ر

ایک خصوصی جرگہ ہے جو جارح یا اس کے نمائندوں کی طرف سے بلایا جاتا ہے تاکہ کسی جھگڑے یا تنازعہ کا مذاکراتی فیصلہ ہوسکے۔ معاوضہ پر اتفاق کیا جاتا ہے، بھیڑ دی جا سکتی ہے اور بیٹی کی شادی کی پیشکش ہوسکتی ہے۔

لڑائی میں آخری صلح (جو بالآخر فیصلہ کن صلح بن سکتی ہے) جو جرگہ یا حکومت کرائے ایک پتھر رکھ کر منائی جاتی ہے جسے تگہ کہتے ہیں جو کم ازکم ایک عارضی صلح کی علامت ہے۔

امرِ معروف:

جماعت کے کسی چھوٹے سے جھگڑے کا عمومی طور پر تسلیم کردہ فیصلہ ہوتا ہے۔ معمولاً کسی مخصوص علاقے کے ملا اپنے ہی طبقے کے کسی نمائندے کی زیر سرکردگی اور ملوک کی کم از کم بیشگی رضامندی کے ساتھ ایک خود ساختہ مصالحتی یا مذاکراتی کمیٹی کی حیثیت سے جاتے ہیں اور اختلاف کے اسباب کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً کسی خاص سود خوار کی بہت زیادہ شرح سود پر عوامی تنفر و احتجاج۔ ان کے فیصلے عموماً تسلیم کر لئے جاتے ہیں۔

پختون ولی کی قدر و قیمت:

باوجودیکہ اس نے خونیں جھگڑوں کو دوام بخشا۔ پختون ولی نے جنگجو قبائل کے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ ممکنہ امن و امان فراہم کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکثر و بیشتر فرد ہی اس ضابطے پر عمل کرتے ہیں لیکن پوری جمعیت اس کے فعل کی حقانیت پہ متفقہ طور پر نظر ڈالتی ہے اور اس کی حمایت یا مخالفت کرتی ہے۔ پختون ولی اب بھی قبائلی علاقے میں ہر لحاظ سے مضبوط ترین قوت ہے اور پہاڑی پٹھان افغانستان اور پاکستان کے زیر انتظام ضلعوں کے بھائیوں کے برعکس سوائے اپنے قانون کے کوئی اور قانون تسلیم نہیں کرتے۔ اپنی دور افتادگی اور طاقت کی وجہ

سے اہلِ کوہ نے اپنا قبائلی معاشرہ برقرار رکھا لہٰذا وہ کافی حد تک اس ثقافتی اور نفسیاتی تناؤ سے محفوظ ہیں جو زیادہ مہذب اور پٹھانوں کو گھیرے رکھتا ہے جو پاکستان کے برطانوی قسم کے سول قانون کو اپنے ہاں پختون ولی کے تقاضوں کو اکثر پسِ پشت ڈالتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اقتصادی، سماجی اور سیاسی دباؤ بلاشک وشبہ مرورِ زمان کے ساتھ اس صورت حال کو بدل لیں گے گو پچھلے سو سال میں ان کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن سرِدست کم ازکم پہاڑی قبیلے اپنے آبائی قانون کے بل بوتے پر زندہ ہیں اور وہ باقی دنیا کو برائے نام ہی مراعات دیتے ہیں۔

پختون ولی پر رویہ کے ایک ناگزیر معیار کی حیثیت سے کبھی کبھار برطانوی اور پاکستانی قبائلی نظم ونسق کے نقادوں نے سخت تنقید بھی کی ہے۔ اس استدلال کے مطابق پختون ولی بنیادی طور پر ایک ثقافتی روایت ہے اور اس نے اپنی موجودہ فضیلت صرف اس لئے حاصل کی کہ اہلِ برطانیہ اور پاکستان نے جنگی اور حفاظتی وجوہات کی بنا پر پٹھانوں کو انیسویں اور بیسویں صدی کے قانونی ارتقاء سے مستفید نہیں ہونے دیا۔ مزید کہا جاتا ہے کہ قبائلی ضابطے سے واحد قانونی استفادہ فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن میں کیا گیا جو قبائل کے ارتقاء سے زیادہ ان کو مرعوب ومغلوب کرنا چاہتا تھا۔ اس دلیل میں صحت کا عنصر موجود ہے۔ یہ یقیناً درست ہے کہ قبائلی علاقے میں پختون ولی

کی بالادستی کی کم از کم جزوی وجہ یہ ضرور ہے کہ اس کے مقابل کوئی نظامِ قانون نہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ سرحد کی افغان طرف کے قبائل جو باقی افغانستان کی طرح انہی قومی اور شرعی قوانین کے ماتحت ہیں (خواہ برائے نام ہی سہی) اب بھی اپنے معاملات پختون ولی کے مطابق ہی طے کرتے ہیں۔ پاکستانی پہاڑی قبائل کے ہاں ایک مقابل نظامِ قانون کا فقدان اس لئے نہیں کہ انگریزوں اور پاکستانیوں نے اسے انہیں پیش کرنے سے انکار کیا بلکہ زیادہ تر اس لئے ہے کہ قبائلیوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ وہ اب بھی کرتے ہیں۔ گو وہ سکولوں اور طبی سہولیات سے مستفید ہونے کے بھی مشتاق ہیں۔ اپنے میدانی بھائیوں کے برعکس وہ اب بھی ایسی حیثیت کے مالک ہیں کہ تہذیب کے فوائد میں سے چننے اور چھانٹنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔

جرگہ

جرگہ اپنی سادہ ترین شکل میں محض ایک اسمبلی ہے۔ قریباً تمام اجتماعی امور خواہ وہ سرکاری ہوں یا عوامی اس کے دائرۂ اختیار میں ہیں۔ اپنی کارکردگی میں یہ غالباً ایتھنز کی جمہوریت سے قریب ترین ہے جو قدیم الایام سے موجود رہی ہے۔ یہ انتظامی عدالتی اور قانونی فرائض ادا کرتا ہے اور اکثر وبیشتر ثالثی یا مصالحت کا ذریعہ بھی ہے۔ مغل سفرا، سکھ جرنیل، برطانوی اربابِ اختیار،

غیر پٹھان قبائلی، پاکستانی سیاستدان اور امریکی مشاہیر مرورِ زمان کے دوران جرگوں کے رُوبرُو پیش ہوئے ہیں۔

ایلفنسٹن ۱۸۰۹ء میں کابل جاتے ہوئے سرحد میں سے گزرا تو اس نے جرگہ کو ایک بے حد منظم ادارے کی صورت میں دیکھا۔ اس کا بیان ایک سوویٹ نظام کے مشابہ ہے جس میں کُنڈی (وارڈ یا چھوٹا سا گاؤں) جرگہ اپنے نمائندے دیہی جرگہ میں بھیجتا تھا۔ جو اپنے منتخب ارکان خیل جرگہ میں روانہ کرتا تھا جس کی نمائندگی بڑے قبائلی جرگہ میں ہوتی تھی۔ ہوتے ہوتے ہر قبیلہ کے بہترین نمائندے لوئے (عظیم بڑا) جرگہ میں بیٹھتے تھے جو امیر کابل کو مشورہ دیتا تھا اور موقعہ ملنے پر اسے تخت پر بٹھاتا یا تخت سے اتار دیتا تھا[1]

آج کل کا جرگہ سسٹم کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے لیکن چونکہ پٹھان دو الگ الگ ملکوں کے شہریوں میں تقسیم ہو گئے ہیں لہٰذا لوئے جرگہ پوری پٹھان آبادی کا نمائندہ نہیں رہا[2] اہم جرگہ میں ہر کُنڈی، خیل اور قبیلہ کی

1- ایلفنسٹن، ایضاً، ص ص ۱۵۸ تا ۱۸۴۔ نیز جیمز، ایضاً ص ۴۵

2- حکومت افغانستان نے لوئے جرگہ کو اپنے سیاسی ڈھانچے کا حصہ بنا لیا ہے لیکن اس کے اجلاس شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں اور وہ بھی عموماً حکومت کی پالیسی کی تائید کرنے کے لیے۔ نظرثانی کے بعد اس کی رکنیت پٹھان قبائل کی بجائے افغانستان کے مختلف اندرونی گروہوں تک پھیلا دی گئی ہے۔

نمائندگی ضروری ہے۔ انتخابات اور تعارفی و تصدیقی اداروں کا کوئی وجود نہیں، نمائندے عام طور پر ہاتھ کے ہاتھ ہی چنے جاتے ہیں اور قریباً ہمیشہ عمر، فراست اور ساکھ کی بنیاد پہ۔

جرگہ بنیادی طور پر ایک گول میز کانفرنس ہے اس کا کوئی صدر یا ممبر مجلس نہیں ہوتا۔ ہر وہ آدمی جس کے مفادات متاثر ہوتے ہوں بولنے کا حق رکھتا ہے۔ فیصلے لازماً متفقہ ہوتے ہیں اور دعا پر مختتم ہوتے ہیں اگر ایسا نہ ہو سکے تو جرگہ منتشر کر ہو جاتا ہے۔ جرگے کا انعقاد وزیرستان کی کسی گرد آلود سڑک کے پاس کسی تنہا درخت کے سائے تلے بھی ہو سکتا ہے یا پشاور کے گورنمنٹ ہاؤس کے کشادہ سبزہ لان پر بھی۔

ایک بڑا جرگہ ایک متاثر کن منظر پیش کرتا ہے۔ مبصر اگر قریب سے دیکھتا ہو اور تھوڑی سی پشتو بھی جانتا ہو تو وہ کچھ مانوس نمونے پہچان سکتا ہے۔ مقررین میں سے ایک عموماً بہت سنجیدہ طویل گفتار سفید ریش ہوتا ہے جو نہایت متانت سے روایت وصداقت کی پاسداری کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے جواب میں ایک پرجوش سرپھرا نوجوان بولتا ہے اور بولنے سے زیادہ لڑنا چاہتا ہے اور ان میں سے جس طرف بھی نکل جائے اس کا رکنا محال ہو جاتا ہے۔ اگر تنازعہ کھل کر سامنے آجائے تو ایک نرم گفتار، نازک خیال ادھیڑ عمر کا ملک اپنے سامعین کو اتفاق نہیں تو کم از کم قریب الاتفاق لانے کی کوشش کرتا ہے، پھر ایک زندہ دل، کھری کھری سنانے والا پیچھے بیٹھا

ہوا، تالیاں بجانے والا، اس نرم ساختہ گروہ کو کسی فیصلے پر لانے کے لئے کچھ گستاخانہ اور بے محابانہ کوشش کرتا ہے، پیشتر اس کے کہ سلسلہ کلام کا رخ پھر بدل جائے۔

قریباً ہمیشہ ہجوم کے سرے پر کہیں بیزار مخالف بھی بیٹھا ہوتا ہے، پگڑی سے اپنا آدھا چہرہ چھپائے ہوئے اور اپنی چال ڈھال اور حرکات و سکنات سے یہ ظاہر کرتا ہوا کہ وہ جسمانی طور پر تو موجود ہے لیکن روحانی طور پر نہیں۔ ناگزیر طور پر وہاں زاہد و عابد بھی ہوتا ہے۔ نوجوان اور دبلا پتلا یا معمر اور ٹھوس۔ جب اللہ کا نام لیتا ہے تو اس کی آنکھوں میں ایک غیر ارضی، ملکوتی قہر چمکتا ہے۔ دیرینہ مسائل کا حل عموماً کافی آگے بیٹھا ہوا شائستہ اور سرکردہ ملک کرتا ہے جو تمام آرا پر سر ہلاتا ہے لیکن بولتا ہے تو انہیں صرف کسی نقطۂ اتفاق پر لانے کے لئے۔ لباس اور زبان کے سوا یہ کسی بھی امریکی سیاسی اجتماع کی جلسہ گاہ کی مانند ہے۔

آج کل جرگے کی کارگزاری کے تین اہم دائرے ہیں۔ اپنی وسیع ترین خالص ترین شکل میں یہ قبائلی معاشرے کے اندر ہر سطح پر زندگی کو منضبط کرتا ہے جو پوری برادری کے لئے متوجہ طلب ہوتی ہے مثلاً ایک نئی مسجد کے لئے جگہ کا انتخاب، خانگی بے وفائی کی سزا، خونیں جھگڑے کا فیصلہ یا ایک ہمسایہ قبیلے کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا فیصلہ۔ ثانیاً جرگہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے قبیلے

کے فیصلے یا آرا حکومت کے گوش گزار کئے جاتے ہیں اور حکومت کے فیصلے قبیلے کو پہنچائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے جرگہ قبیلے کے خارجی تعلقات کا ضامن ہے اور اسے کسی خاص لائحہ عمل سے وابستہ کر سکتا ہے۔

تیسری شکل نام نہاد سرکاری جرگہ ہے جو حکومت پاکستان کے کسی افسر کے مقرر کردہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا روایتی پختون والے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز (دیکھئے باب ششم آگے) کے تحت جرائم کا فیصلہ کرنے کے سلسلے میں اس افسر کے لئے مشاورتی جیوری کی حیثیت رکھتا ہے۔

جرگے میں رائے شماری شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ اجلاس کا مجموعی ردِ عمل عموماً اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے گو اس کا مفہوم بسا اوقات پُرامن سوسائٹی آف فرینڈز (سترھویں صدی کے نصف آخر میں جارج فوکس کی بنا کردہ۔ مترجم) کی روحوں کو بھی منجمد کر دے گا جنہوں نے یہ اصطلاح وضع کی تھی۔ جرگے کے مسلح افراد بشرط ضرورت تعمیل فیصلہ کروانے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ جرگے کو جو تقدس حاصل ہے وہ اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ یہ شاذ و نادر ہی اختلاف سے منتشر ہوتا ہے۔ پٹھان کی متلون فطرت اور بھاری اسلحہ کے پیش نظر یہ واقعی روایت کی جبلت پر فتح کا نام ہے۔

جرگے کی حکم عدولی کی روایتی سزا مجرم کے گھر کو جلا ڈالنا ہے۔ یہ خاص طور پر مؤثر ہے کیونکہ ایک پٹھان کا گھر ایک قلعہ ہے جو

اپنے دیدبانوں، موٹی دیواروں اور آہنی دروازوں کے۔ مالک کا وقار
اعتبار اس کی اسے محفوظ رکھنے کی اہلیت سے بہت گہرے طریقے سے
مربوط ہے اور انگریزوں کے دور میں بڑی بڑی انتقامی مہمات
یا بمبار جہاز بھی کبھی کبھار بھیجے جاتے تھے۔ تاکہ کسی باغی ملک کا گھر
تباہ کرکے اسے معاشرے کا نشانہ تحقیر بنا دیا جائے۔

سیاسی نظریئے کے لحاظ سے جرگہ کے کئی دلچسپ پہلو ہیں۔ کسی
شخص کے جرگے میں بیٹھنے کا انحصار برادری کی رضامندی کے علاوہ
اس کی اپنی قوت یا شہرت پر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک نمائندہ
ہے ایک خاندان کا یا قبیلے کے نقطۂ نظر کا یا ایک گڈ مڈ جرگے میں
بذات خود قبیلے کا۔ برک کے مثالی پارلیمنٹ ممبر کے برعکس وہ عمل
میں خود مختار نہیں بلکہ اسے تو اس گروہ کے نقطۂ نظر کو پیش کرتا
ہے جس کا وہ نمائندہ ہے۔ عموماً وہ بولنے سے پہلے اپنے گروہ
کی آرا معلوم کرتا ہے اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ عدم اتفاق
کا خطرہ مول لیتا ہے[1]۔ جب جرگہ ایک فیصلے پر پہنچ جائے تو اس کے

---

[1]۔ دیکھئے جیمز، ایضاً ص ۵۲، اگر پی اے یا ڈی سی، ایف سی آر کے تحت کسی
فوجداری مقدمے کے تصفیے کے لئے جوڈیشنل جرگہ بلائے تو وہ اس اصول
سے مستثنیٰ ہوتا ہے کیونکہ ایسے جرگے کے ممبر کم از کم نظری لحاظ سے غیر جانبدار
جمہوری ممبران ہوتے ہیں۔

تمام اراکین اس فیصلے کو نافذ کرنے کے لئے اپنی پوری قوت اور اثر و رسوخ استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ایک لطیف نکتہ، جو اکثر جرگے کے نیم عدالتی کردار کی وجہ سے نظر انداز ہو جاتا ہے یہ ہے کہ اس کا فرض ایک موجودہ صورتحال کو پُر امن طریقے سے سلجھانا ہے نہ کہ حق و باطل کا فیصلہ کرنا، جُرم کا تعین کرنا یا سزا سنانا۔ فریقین جو ایک مغربی عدالت میں مدعی اور مدعا علیہ کہلاتے ہیں، یہاں مساوی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں۔ ایک نے دوسرے کے خلاف کوئی اقدام کیا ہے اور اس اقدام کی نوعیت تمام متعلقہ افراد کو معلوم بھی ہے اور ان کا اس پر اتفاق بھی ہے۔ جرگے کا کام یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا جو کچھ کیا گیا وہ صحیح تھا اور اگر نہیں پھر مظلوم فریق حساب برابر کرنے کے لئے کیا کرنے کا مجاز ہے[1]۔ مناسب فیصلہ کرنے کے لئے اراکین جرگہ پختونولی کے تقاضوں، واقعہ مخصوص کے حالات اور افراد متعلقہ کے کردار کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ان کی رہنمائی مالی معاوضہ کے ایک عمومی طور پر مسلمہ پیمانہ سے بھی ہوتی ہے جو مظلوم فریق بشرط رضامندی ادلے کا بدلہ کی بجائے عز و افتخار کے ساتھ قبول کر سکتا ہے[2]۔

---

[1]۔ اس نظام کے پہلے انگریز مبصر، الفنسٹن نے اس نکتے کو فوراً سمجھ لیا۔ دیکھئے الفنسٹن، ایضاً ص ۱۲۹

[2]۔ یہ علاقہ بہ علاقہ مختلف ہے۔ ایک سو سال پہلے موت ۲۴۰ روپے کے برابر تھی۔ مستقل چوٹ ۸۰ روپے کے اور زخم ۵۰ تا ۹۰ روپے کے، پچھلے سالوں میں افراط زر اور کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فیصلے عام طور پر بہت سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ محمود افضل کو مارنے کا حق رکھتا تھا کیونکہ افضل نے محمود کے چچا کو مار دیا تھا اور بس عالمگیر نے جائز طور پر اپنی بیوی کو مارا کیونکہ اس نے زناکاری کا ارتکاب کیا تھا اور اس کے سسر کو اس کے خلاف کوئی گلہ نہ تھا۔[1] حکمت نے بلا وجہ بشیر کو مار کر ناجائز کام کیا اور بشیر کے اعزہ و اقرباء حکمت کو مارنے کے مجاز ہیں یا پھر وہ اس سے ...،۴ روپے بطور ناگہ (خون بہا) قبول کر لیں تاکہ معاملہ ختم ہو جائے اور بدل لاگو نہ رہے جب جائیداد کے پیچیدہ جھگڑے اور/یا بین القبائلی تنازعات کا سوال ہو تو فیصلہ بہت مشکل ہو جاتا ہے اور عموماً شریعت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ) کی قیمت گھٹنے کی وجہ سے معاوضوں کی شرح بڑھ گئی ہے مثلاً آج کل کرم میں قتل کا معاوضہ ۴ ہزار اور مسعودوں میں ...،۷ روپے ہے۔

[1] ۔ زناکار بھی مستوجب قتل ہے اور بعض قبیلوں میں اگر زناکاری اعلانیہ یا سنگین ہو تو اس کے ایک رشتہ دار کا قتل بھی ضروری ہے تاکہ مظلوم شوہر کی عزت بحال ہو سکے۔ زناکارہ کو کبھی کبھار سزائے موت دینے کی بجائے صرف اس کی ناک کاٹ دی جاتی ہے اور یہ سزا سرحدی علاقے میں اتنی عام تھی کہ اس کے لئے صدیوں پہلے ایک خاص جراحی ایجاد کرنا پڑی۔ اس میں پیشانی سے کچھ گوشت لے کر ناک پر پیوندکاری کی جاتی تھی تاکہ جزوی بحالی ہو سکے۔ دیکھئے بیلیو، ایضاً ص ۱۹۲، اب یہ رسم صرف ہزارہ میں ہی موجود ہے۔

رواج اور شریعت :۔

پٹھان کی طرزِ زندگی میں رواج یا رواجِ عام اور شریعت کو بھی
بڑا عمل دخل حاصل ہے۔ رواج شریعت سے زیادہ رائج ہے اور اسے
عموماً ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ قبیلہ بہ قبیلہ مختلف ہے اور اسے ضبطِ تحریر و
ترتیب میں لانے کی کئی برطانوی کوششیں ایک نمائندہ مجموعہ پیش کرنے
میں ناکام رہیں۔ اس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ مسلمان پٹھان شروع میں
ہی برصغیر کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مذہبی رشتہ وحدت کا شدید
احساس رکھنے لگے اور وہ پوچھ گچھ کرنے والے انگریزوں سے بہ اصرار
کہتے رہے کہ رواج کا کوئی وجود نہیں تھا اور صرف شریعت ہی شریعت
تھی۔ اس کے علاوہ ملوک ومعتبرین نے ہمیشہ پرسنل لاء کو ممکنہ حد تک
لچکدار رکھنے کی عملی افادیت کو تسلیم کیا ہے۔ شادی اور وراثت کے
قواعد بھی رواج کے بہت زیرِ اثر ہیں۔ مثلاً شادی کا قوی امکان
صرف اسی وقت موجود ہوتا ہے جب مطلوبہ معاہدہ کا قوی امکان ہو
یعنی "میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی" کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اسلامی
قانون کے مطابق تمام بیٹوں کو میراث میں یکساں حصہ ملتا ہے لیکن
اس کی ترمیم یوں کردی جاتی ہے کہ سب سے بڑے بیٹے کا خصوصی حق
مانا جاتا ہے جو اپنے والد کی اجتماعی ذمہ داریوں کا وارث ہونے کے
ساتھ ساتھ (خواہ آزمائشی طور پر ہی ہو) اس کے ترکہ میں بھی نسبتاً بڑے

حصّہ کا وارث ہوتا ہے۔ رواج کے مطابق ایک بیٹی کو وراثت سے کچھ نہیں ملتا گو اگر تحفہ یا جہیز کی بناء پر غیر منقولہ جائیداد میں اس کا کوئی حصّہ ہو تو وہ ناقابلِ انتقال ہوتا ہے۔ بیوہ اپنی موت یا دوسری شادی تک اپنے شوہر کی جائیداد سے گزارہ کی مجاز ہے اور ایسے ہی ایک غیر شادی شدہ بیٹی اپنی شادی تک گزارہ کی مستحق ہے۔

شریعت سے انحراف کی ایک انتہائی صورت جسے ایک ابتدائی انگریز عالم نے دیکھا یوسفزئیوں میں بہت عام ہے جس کے تحت میراث میں ہر بیٹے کے مساوی حصّہ کی بجائے ہر بیوی کی اولاد کے لئے میراث میں سے مساوی حصّے رکھے جاتے ہیں۔ گویا اگر ایک شخص کی چار بیویاں ہوں اور پہلی تین سے ایک ایک بیٹا ہو تو ہر بیٹا کل میراث کا ایک چوتھائی حاصل کرے گا اور اگر چوتھی بیوی کے چار بیٹے ہوں تو ان میں سے ہر ایک باقی ماندہ میراث کا ایک ایک چوتھائی لے گا[1]۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ اسی وقت کیا جاتا تھا جب بیویاں پست سماجی حیثیت

---

[1]- ایچ بی لمسڈن "رپورٹ اون دی یوسفزئی ڈسٹرکٹ سلیکشنز فرام دی پبلک کارسپانڈنس آف دی ایڈمنسٹریشن فار دی افیئرز آف دی پنجاب" ۱۸۵۳ء ص ۳۴۰- رواج کی بعض مثالیں جے۔ جی۔ لوریمر کی "کسٹمری لاز آف دی مین ٹرائبز آف دی پشاور ڈسٹرکٹ" (پشاور: این ڈبلیو ایف پی گورنمنٹ پریس ۱۹۳۴ء) اور ایچ۔ این۔ بولٹن کی "کسٹمری لاز آف دی ٹرائبل کسٹم آف دی ڈیرہ اسماعیل خان ڈسٹرکٹ" (پشاور: این۔ ڈبلیو ایف پی گورنمنٹ پریس ۱۹۰۷ء) میں ملتی ہیں۔

کی ہوں۔

بعض ریتیں بھی پٹھانوں کے نزدیک رویّہ کی مسلمہ رہنما مانی جاتی ہیں۔ایک عام ریت" بو تا برہمپتا" کہلاتی ہے جس کا بہترین ترجمہ "ادلے کا بدلہ" ہے اس کے تحت اگر کسی آدمی کی املاک کا کوئی حصہ بالخصوص جانور کھو جائے تو وہ کسی نہ کسی طرح چور یا اس کے قبیلہ کی ایسی اور اتنی ہی چیز پر قبضہ کرنے کا مجاز ہے۔اس کے بعد تبادلہ کیا جاتا ہے اور ریت کی خوبی یہ ہے کہ متعلقہ جانور یا اشیاء آئندہ کے لئے ایسی سرگرمی سے مستثنیٰ قرار دے دئیے جاتے ہیں۔

اگر پہلا مظلوم فریق بزور یا برہمپتا طریقہ کے تحت اپنا نقصان پورا نہ کر سکے تو وہ (اگر اس کا حریف معزز آدمی ہو) "تنگلی" کا طریقہ اختیار کر سکتا ہے یعنی اس چیز کی قیمت کا پانچواں حصہ اس کے قابض کو بطور فدیہ ادا کر سکتا ہے۔

پٹھانوں کی اپنی کہاوتوں کے مطابق امن شکنی کے اکثر و بیشتر جرائم زر، زن اور زمین کی وجہ سے ہوتے ہیں۔اکثر خونیں جھگڑے ان میں سے کسی ایک یا زیادہ کی بناء پر ہوتے ہیں۔ مثلاً ۲۰-۱۹۱۹ء میں شمال مغربی سرحدی صوبہ میں (قبائلی علاقہ کے بغیر) جہاں برطانوی سول قانون پوری طرح رائج تھا ریکارڈ کے مطابق ۴۰۴ قتل ہوئے (غالباً قتل کی اصل وارداتوں کے نصف سے بھی بہت کم) جن میں سے ۹۴ سرکاری طور پر اصناف کے تعلقات سے منسوب کئے گئے

۹۶ ر لوٹ مار سے، ۳۶ ر زمینی تنازعات سے اور ۵۸ ر خونیں جھگڑوں سے۔ آخرالذکر میں بلاشک وشبہ پہلے تینوں عوامل ملوث تھے۔[1]

افراد اور مُعاشرہ :

قبائلی معاشرہ فرد سے شروع ہوتا ہے اور فرد پر ہی ختم ہو جاتا ہے جس کا مقام اکثر قبائل میں اس کے دفتری ہونے پر منحصر ہے جو نظری یا عملی لحاظ سے قبائلی زمین میں حصّہ اور قبائلی جرگوں میں اظہار رائے کا حق رکھتا ہے۔ ہر گروہ کی اہمیت کھول سے لے کر قبیلہ تک براہ راست ان انفرادی قبائلیوں کی تعداد پر منحصر ہے جو اس کے وفادار ہیں۔ یہ وفاداری حسب معمول (لیکن ناگزیر طور پر نہیں)

---

[1] ۔ نارتھ ویسٹ فرنٹیئر پراونس (انڈیا)" این ڈبلیو، ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹ۔ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۰ء" ص ۷۔ ایک تجربہ کار ریکروٹنگ افسر میجر آر۔ ٹی۔ آئی رجوے نے اپنی اس سے پہلے تحریر کردہ کتاب اور ۱۹۱۸ء میں دوسری دفعہ مطبوعہ میں خونی جھگڑوں کے اہم اسباب یہ بتائے ہیں i عورتوں سے سازباز ii قرض یا وراثت کے تنازعات iii زمین یا پانی پر جھگڑے iv کسی فرد خاندان یا اس کے ہمسایہ کا قتل اور v پدرگہ کی حکم عدولی۔ دیکھئے "پٹھان" از آر۔ ٹی۔ آئی رجوے (کلکتہ گورنمنٹ پریس ۱۹۱۸ء) ص ۱۹" زر، زن اور زمین پٹھان داستان "واقعہ خونی گیا" مولفہ قاضی احمد جان دپشاور بہاری لال ۱۹۳۱ء) کا خاص موضوع ہیں۔

خونی رشتہ پر مبنی ہے لہٰذا یہ بنیادی طور پر معاشرے سے متعلق ہے
نہ کہ ایک مخصوص رہنما سے۔

ملک :

لیکن بعض افراد گروہ کے قائد اور نفس ناطقہ تسلیم کئے جاتے
ہیں اور وہ اپنی قابلیت اور تجربہ کی بنا پر ایک بالکل محدود دائرے
کے اندر اپنے ساتھیوں کی سرگرمیوں کو کسی خاص نہج پر ڈال سکتے ہیں
اس لفظ کا اصلی معنیٰ "بادشاہ" گمراہ کن ہے اور ملک پٹھانوں کے
ہاں زیادہ سے زیادہ مساویوں میں سرفہرست ہوتا ہے۔ زیر انتظام
اضلاع میں وہ عموماً خان کہلاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں دولت،
خاندانی اثرورسوخ اور حکومتی منظوری اس خطاب کو حاصل کرنے
اور جاری رکھنے میں غیر اہم نہیں ہوتے تاہم اس کا ذاتی کردار
اور قابلیت اس کے اثرورسوخ کی وسعت کو متعین کرتے ہیں۔
پچھلے چند سالوں میں بعض قبائلی ملوک صنعت و حرفت اور ٹھیکیداری
کی بدولت امیر ہو گئے ہیں لیکن وہ اب بھی قبائلی زمینوں اور جرگوں میں
کسی دوسرے فرد سے زیادہ حصہ کے حقدار نہیں ہیں اور نہ ہی وہ پوری
مرد آبادی کی رضامندی کے بغیر اپنے گروہ کو کسی لائحہ عمل کا پابند یا
اس سے وابستہ کر سکتے ہیں۔

اکثر حالتوں میں پٹھانوں کے ہاں بڑے بیٹے کا حقِ فوقیت

موجود نہیں ہے لیکن ملکی یا سرداری قریباً ہمیشہ اسی خاندان میں رہتی ہے۔ قبائلی علاقے میں ملک کا کردار مرورِ زمان کے ساتھ نہیں بدل سکا[1]۔ دوسری طرف زیرِ انتظام علاقوں کے روایتی رہنما یعنی خوانین اپنا اصلی قائدانہ اختیار کافی حد تک کھو چکے ہیں کیونکہ ہیئت اجتماعیہ میں تبدیلیاں آگئی ہیں لیکن ان سے بہت سے انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی بندوبست اراضی کے دوران بڑی بڑی زمینی املاک کے مالک بن بیٹھے اور بے حد امیر ہو گئے۔

مُلّا :

سرحدی علاقے میں مُلّا فراواں میسر ہیں۔ چونکہ اسلام میں کوئی رسمی مُلّائیت نہیں ہے لہٰذا مُلّا اور قبیل کے دوسرے نیک لوگ خود ساختہ ہیں۔ مُلّا کی مخصوص ذمہ داری مذہبی مسجد اور بچوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم ہے۔ وہ کبھی کبھار ملک اور دیگر اہم افرادِ معاشرہ کا صلاح کار بھی ہو سکتا ہے۔ زیرِ انتظام اضلاع میں وہ زیادہ تر خان یا کسی سرکردہ خاندان کا حلقہ بگوش ہوتا ہے۔ چونکہ عام قبائلی مذہب سے دیوانہ وار عقیدت بھی رکھتا ہے اور اس سے کافی حد تک نابلد بھی ہوتا ہے لہٰذا ایک ہوشیار

---

[1]- دیکھیئے ایلفنسٹن، ایضاً ص ۱۶۳، اور جیمز ایضاً، ص ص ۸۲ تا ۸۳

مُلّا اپنی برادری کی سوچ پر گہرا اثر ڈال سکتا ہے خواہ معاملات کا مذہب سے دُور کا تعلق بھی نہ ہو۔ ایک غیر معمولی قابلیت کا آدمی مُلّا اور مُلک کے اختیارات کا امتزاج ہو سکتا ہے اور مذہبی و غیر مذہبی معاملات میں گروہ کا رہنما تسلیم کیا جا سکتا ہے:

جو مُلّا مسجد میں سرکردہ ہوتا ہے اور جماعت کراتا ہے امام کہلاتا ہے۔ ایک ایسا نیک آدمی جو عام طور پر جو نمازوں کی امامت نہیں کرتا لیکن کسی خاص ولی اللہ یا سلسلۂ تصوف کا مرید ہے شیخ کہلاتا ہے۔ طالب علم ایک تیسری قسم ہے جو کم و بیش باقاعدہ طور پر مذہبی مطالعہ کے لیے موقوف ہوتی ہے لیکن کسی عام پیشے سے بھی منسلک رہتی ہے۔

ایک اور گروہ آستانہ داروں کا بھی ہے جن میں پیر یا پیروں کی اولاد، میاں جو قدیم زمانے کے علماء و صوفیا کے طبقے کی ذریات ہیں (یہ خطاب عموماً آنحضورؐ کے قبیلہ قریش کے اخلاف اور اساتذہ کو دیا جاتا ہے) پیرزادگان، اخوندزادگان اور صاحبزادگان جو ایسے اصحاب کے بیٹے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی بناء پر تقدس کا درجہ حاصل کیا اور بعض مقامات پر چند فقرا یا درویش شامل ہیں۔ جو نظری طور پر کسی نہ کسی سلسلۂ صوفیا کے اراکین ہوتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر محض انفرادی صوفی یہ شاذ و نادر پٹھان ماخذ کے ہوتے ہیں۔ ان سے قدرے الگ اور بالا سادات ہیں جنہیں اکثر شاہ کہا جاتا ہے اور جن کی سیادت

محض آنحضور کے حسب و نسب عالی سے ماخذ ہونے کی وجہ سے ہے۔

مذہبی توہم پرستی کے باوجود یہ سب اصحاب ملک کی طرح اپنی حیثیت کے لئے بڑی حد تک اپنے ہم قبائلیوں کے حسن ظن کے محتاج ہیں، اور جب تک وہ اپنے زہد و اتقا کے ذریعے اپنی واقعی مذہبی فضیلت کا ثبوت نہ دیں وہ معاشرے میں کسی اونچے مقام کے اہل نہیں ہو سکتے۔ مثلاً اگر قبیلے کا ہی فرد ہو تو وہ اپنی ذاتی زمین کے علاوہ مسجد کے لئے وقف زمین کا بھی انتظام کرتا ہے لیکن وہ اپنے معتقدین پر کسی قسم کا کوئی محصول نہیں لگا سکتا کیونکہ ایسا حق اسے ایک مستقل اختیار دے دیتا ہے جو اکثر قبائلی برداشت نہیں کر سکتے خواہ اس کا مقصد کتنا بھی بلند یا روحانی کیوں نہ ہو۔

ملاّ نے قبائل کے ساتھ برطانوی تعلقات میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے (گو قریباً ناگزیر طور پر تخریبی) اور غیر معمولی افراد جیسے پوندہ ملاّ حاجی ترنگ زئی اور فقیر ایپی نے مذہب اور جنگ کو جہاد میں مخلوط کر دیا[1] جس کی وجہ سے قبائل برطانوی ہند کے دارالحرب

---

[1]- پٹھانوں کے ہاں جہاد کا مطلب اکثر وہ نہیں ہوتا جو اسلامی فقہ میں ہے۔ یہ عموماً ہر اس پُر تشدد فعل پہ محیط ہوتا ہے جو کسی غیر مسلم یا غیر قدامت پسند مسلمان فرقہ پرست کے خلاف کیا جائے۔

پر پل پڑے۔ پاکستان کی مسلم ریاست کے ظہور کے بعد جہاد کے لئے انگریزوں کے کفر کا محرک موجود نہیں رہا، اور گو فقیر ایپی ۱۹۶۰ء میں اپنی موت تک وزیرستانی سرحد پر اپنے چٹانی قلعے میں سرکش رہا تاہم اس کا اثر و رسوخ مذہبی حرمت کی بجائے قانون شکن کی حیثیت سے اس کی قوت و قابلیت پر منحصر تھا۔

لشکر :-

پشتو لشکر کا بہترین انگریزی مترادف غالباً امریکی ہندوستانی 'جنگی جماعت' ہے۔ لشکر محض ان افراد کا مجموعہ ہے جو ایک مشترکہ دشمن کے خلاف یا ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں۔ پٹھان تصورِ حیات جو ہے سو ہے لہٰذا یہ لفظ ان کی زبان میں رائج العام ہے۔ جرگے کی محدود تعداد کی وجہ سے وہ اس زمرے میں نہیں آتا۔ یہ اصطلاح ان درجن بھر آدمیوں پر بھی محیط ہے جو کسی قریبی گاؤں سے بھیڑ چرانے جاتے ہیں اور ان ہزارہا افراد پر بھی جو ۴۸-۱۹۴۷ء میں کشمیر پر ٹوٹ پڑے[1]

اپنی غیر رسمی نوعیت کے باوجود لشکر انتہائی عملی اور کاروباری ہوتا ہے اور اس کے لئے تفصیلی منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔

---

[1]- دیکھئے باب ۲۴ جس میں جہادِ کشمیر کا مفصل ذکر آ رہا ہے۔

ایک محترم ملک کے لشکر کو تین گروہوں میں تقسیم ہونا چاہیئے۔ پہلا اور بہترین طور پر مسلح گروہ ہدف پر حملہ کرتا ہے اور پھر دوسرے گروہ سے آ ملتا ہے جو اپنے گاؤں کی طرف کچھ فاصلے پر پیچھے تعینات کیا جاتا ہے۔ یہاں پہلا گروہ لوٹ مار دوسرے گروہ کو دیکر پہاڑوں میں منتشر ہو جاتا ہے۔ تیسرا گروہ جو اپنے گاؤں سے صرف چند میل کے فاصلے پر ہوتا ہے دوسرے گروہ سے لوٹ مار لے لیتا ہے، اور واپسی جاری رہتی ہے۔ یہ لوٹ مار اور قیدیوں کو گاؤں میں لے آتا ہے جہاں پہلے دونوں گروہ پہنچ چکے ہیں، اور از سرِ نو مسلح ہو چکے ہیں۔

اس مرحلے پر لوٹ مار کو محفوظ کیا جاتا ہے اور ہر ایک کا خون گرم ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو مجتمع لشکر اور اُن بے خوف تعاقب کنندگان (بشرطیکہ ہوں) پر ٹوٹ پڑتا ہے اور خاطر خواہ طور پر ان کو عبرتناک نقصان پہنچاتا ہے۔

حُجرہ :

حجرہ یا کمیونٹی سنٹر پٹھان کردار کے ایک شریف تر اور سماج دوست پہلو کا مظہر ہے۔ یہ زیرِ انتظام اور قبائلی علاقوں کے قریباً ہر گاؤں میں موجود ہے اور تہذیب و وقار کا ایک نشان سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے قبائل کے بہت سے لوگ یار مہمندوں کے

بعض حصوں کو اس لئے موردِ تنقید بنائے ہیں کہ ان کے دیہات میں شاذونادر ہی حجرے پائے جاتے ہیں۔ روایتی طور پر یہ ایک مردانہ سماجی مرکز ہے جہاں قبیلے کے غیر شادی شدہ نوجوان ہوتے ہیں[1] لیکن حجرے میں نووارد بھی ٹھہرتے ہیں اور یہ اجتماعی عمل اور فکر و خبر کا مرکز بھی ہے۔ یہاں سب کو کھانا اور چائے دی جاتی ہے۔ ایک گاؤں میں کئی حجرے ہو سکتے ہیں جو مہمان نوازی میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ہر قسم کے معاشرتی امور حجرے میں نمٹائے جاتے ہیں۔ گپ شپ بھی ہوتی ہے اور معلومات کا تبادلہ بھی کیا جاتا ہے۔ چونکہ جیسا کہ ایلفنسٹن نے ۱۵۰ سال پہلے دیکھا "اُن کی (پٹھانوں کی) عام مصروفیت بات چیت ہے جب وہ بیٹھے ہوئے ہوں" لہٰذا حجرا ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ دور افتادہ دیہات کے بھی بہت سے حجروں میں اب بیٹری سے چلنے والے ریڈیو موجود ہیں لہٰذا غیر متعلقہ موضوعات جیسے اقوام متحدہ اور سرد جنگ بھی قبائلیوں کی بات چیت کا حصّہ بن چکے ہیں۔ ناقد ریڈیو پشتو نشریات میں ریڈیو کابل اور ریڈیو پاکستان کا مقابلہ کرتا ہے، اور بی بی سی اور وائس آف امریکہ انگریزی، اردو اور فارسی میں دنیا کی اور بہت

---

[1] ۔ ایک کنوارا پٹھانوں کے ہاں ایک آوارہ سمجھا جاتا ہے اور وہ عموماً اپنے بھائی کے گھر میں بھی نہیں سوتا۔

سی خبریں بھی مہیا کرتے ہیں۔

ماتحت طبقے

کسی پٹھان گاؤں کا ایک سرسری سا مطالعہ بھی ظاہر کر دیتا ہے کہ عام پٹھان دفتری جو دیہی عوام کی تشکیل کرتا ہے اپنی جگہ یہ ایک چھوٹا سا خان ہے۔ اس کی ضروریات مختلف بنگہ اور کاریگر پوری کرتے ہیں جنہیں ہمسایہ اور غلام (یہ لفظ اب بتدریج متروک ہو رہا ہے) کہتے ہیں ان میں اکثر گوجر اور اعوان قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جو ماخذ کے اعتبار سے غیر پٹھان ہیں۔ ان میں سے اکثر مسلمان ہیں لیکن ہندو ہمسائے بھی موجود ہیں، آج کل بھی موجود ہیں۔ بعض علاقوں میں ان لوگوں کے علیحدہ دیہات ہیں جو پٹھانوں سے مستاجر زمینوں پر اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ انفرادی طور پر وہ ایک پٹھان گاؤں یا گھرانے میں خدمت گاری اور منشی گیری کرتے ہیں۔ دونوں حالتوں میں وہ اپنے مخدوم لیکن متکبر پٹھانوں کے مقابلے پر اقتصادی لحاظ سے زیادہ خوشحال ہوتے ہیں۔ ہمسائے کا اپنے پٹھان مربی سے تعلق بیان کرنا مشکل ہے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے قبائل میں ایک نرم قسم کی غلامی کا رواج تھا۔ غلام نہ کسی زمین کا مالک ہو سکتا تھا نہ مویشیوں کا۔ وہ علاقہ چھوڑ نہیں سکتا تھا اور اپنا بیشتر وقت یا پیداوار اپنے آقا کے لئے وقف کرتا تھا

۱۸۷۰ء تک یوسفزیوں میں غلامی عام تھی اور ہندو ہمسایوں کو تو جزیہ بھی دینا پڑتا تھا جو اسلام کا کفار پر عائد کردہ روایتی فی کس ٹیکس ہے ^1

انیسویں صدی میں ایک اور قسم کی غلامی بھی عام تھی جسے زیادہ صحیح طور پر ہرکارہ پن کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت ایک بے زمین پٹھان اپنے آپ کو ایک دفتری کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتا تھا۔ اسے چوریکار کہا جاتا تھا اور اس کے بدلے میں آقا کاشتکاری کرنے کے لیے اسے ایک قطعہ زمین کچھ پیشگی روپیہ اور اکثر و بیشتر ایک لونڈی (وینڈزا) دیتا تھا تاکہ وہ اپنا گھر بسا سکے۔ چوریکار حلف دیتا تھا کہ وہ اس وقت تک رہے گا جب تک وہ سب پیشگی رقومات ادا نہ کر دے چونکہ پیداوار کا تین چوتھائی حصہ دفتری کو چلا جاتا تھا بوجہ ملکیت لہٰذا باقی ماندہ ایک چوتھائی سے ہی اسے نقد پیشگی رقوم اور وینڈزا کی قیمت ادا کرنا ہوتی تھی اور اسی سے اپنا گھر بھی چلانا ہوتا تھا لیکن چوریکار کی زندگی نامناسب حد تک سخت نہ تھی کیونکہ وہ جب ایک دفعہ لائق کاشتکار ثابت ہو جاتا تھا تو اسے کوئی دوسرا دفتری مل جاتا تھا جو بخوشی اصلی آقا کو قرض ادا کر دیتا تھا اور چوریکار سے اسی قسم کا معاہدہ کر لیتا تھا۔

1- گورنمنٹ آف انڈیا" سنٹرل ایشیا" پارٹ I ، III ، ۲۱۲

آج کل بھی قبائلی علاقے میں ہمسائے کا کردار انتہائی جاگیری ہے اور بعض اطلاعات کے مطابق انفرادی طور پر انہیں بمشکل ہی غلاموں سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اوسط ہمسایہ کسی اور گاؤں کا کوئی بے سہارا پٹھان ہوتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے (اکثر قانونی گرفت) اپنے آپ کو ایک درباری یا محافظ کی حیثیت سے کسی طاقتور ملک سے منسلک کر لیتا ہے یا وہ ایک ہندو محاسب ہو سکتا ہے۔ جو اپنے آقا کے فوائد اور منافع جات میں حصہ گیر ہوتا ہے۔ جو قبیلے کے غیر رکن افراد کے ساتھ روابط کی وجہ سے اسے حاصل ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ منسلک ہوتا ہے۔ تکنیکی طور پر ہندو محاسب آنے جانے میں اتنا ہی آزاد ہوتا ہے جتنا ایک پٹھان محافظ لیکن اس میں اپنے آقا کی حکم عدولی کر کے یا اسے خیرباد کہہ کر اپنی فلاح و بہبود کو خطرے میں ڈالنے کی اہلیت کم ہوتی ہے۔

عورت کا مقام اور کردار :

پٹھان عورتیں سماجی یا اجتماعی معاملات میں عموماً کوئی حصہ نہیں لیتیں۔ قبائلی علاقے میں ملک کے خاندان اور دیگر خاندانوں کی تمام مستورات اپنے سماجی امتیاز کی وجہ سے برقعہ اوڑھتی ہیں، یعنی انتہائی حالتوں میں یہ پردہ "چار دیواری" ہوتا ہے جس کے تحت عورت کبھی اپنے گھر سے نہیں نکلتی حتیٰ کہ اپنی سہیلیوں اور

اقربا سے ملنے کے لئے بھی نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بالائی طبقے کی پٹھان عورتیں بے اثر ہوتی ہیں۔ رسم ورواج کی تحدیدات کے اندر رہتے ہوئے یہ عورتیں ذہین اور ہیلکار ہوتی ہیں اور اپنے مردوں کے اہم گھریلو معاملات کو اپنی ہیچ پر چلاتی ہیں اور رشتوں ناطوں اور خاندانی میل ملاپ میں بڑا کردار ادا کرتی ہیں۔ کبھی دوسرے خاندان کی مستورات کے ساتھ براہ راست گفت وشنید کے ذریعے اور کبھی بتوسط دیگراں۔ عورتیں میلمتیا کے تقاضوں کو پورا کرنے کا بھی عملی وسیلہ ہیں جو پختون ولی کا اتنا اہم حصہ ہے اور بہت سے ملوک کی عزت محض اس لئے بڑھی ہے کہ ان کی بیگمات کو کھانے پکانے کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ عورتیں بھی پختون ولی پر اتنی ہی سختی سے عمل کرتی ہیں جتنے مرد اور وہی اکثر وبیشتر اپنے کاہل اور غیر رضامند مردوں کو بدل پر اکسانے کا اہم عامل ہیں۔ ان میں سے معدودے چند ہی ایسی ہوں گی جو رائفل، پستول یا خنجر نہ چلا سکتی ہوں اور لڑائی بھڑائی کے دوران جنگی صفوں کے عقب میں ہر طبقے کی عورتیں ہاتھ بٹاتی ہیں۔

عام قبائلیوں کی بیویاں کام کا بیشتر حصہ کرتی ہیں۔ کھانا پکانا پانی، گھاس اور ایندھن لانا، دودھ دوہنا اور بلونا، فصلیں کاٹنا، ہیا نور سنبھالنا، سینا پرونا اور کپڑے دھونا، لہٰذا وہ پردہ نہیں کرتیں لیکن غیر محرم کو دیکھتے ہی پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔

زیر انتظام ضلعوں کے صرف چند ان گنے بڑے شہروں کے

سوا پردہ کے خلاف آج تک عورتوں میں ابتدائی بغاوت کے آثار
بھی نظر نہیں آتے اور ایک ایسے علاقہ میں جہاں ہر قسم کے مخنث کافی
فاحشہ ہیں۔ ایسا کرنے کے لئے کوئی اقتصادی محرک بھی نہیں ہے۔ مرحلہ
میں پردہ اتنا سخت ہے کہ کراچی، لاہور اور راولپنڈی کی فیشن ایبل
خواتین بھی جو رات کے وقت محفل رقص و سرود میں مردوں کی
نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھیں پشاور پہنچتے ہی برقعہ اوڑھ لیتی ہیں
اور زنانہ میں چلی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ملنے کے علاوہ مقامی
خواتین ہر جمعہ کو مساجد و مقابر میں جاتی ہیں اور تقریبات شادی
میں شریک ہوتی ہیں اور یہی ان کی تفریح طبع ہے[1]

اکثر پٹھانوں کی ایک ایک ہی بیوی ہوتی ہے لیکن سب بااصرار
کہتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو چار بھی رکھ سکتے ہیں، جس کی اسلام اجازت
دیتا ہے اور چند دولت مند لوگ واقعی چار چار بیویوں کے شوہر
ہوتے ہیں۔ ایام گزشتہ میں بعض چار سے بھی زیادہ رکھتے تھے۔ یہ
اضافی عورتیں عموماً سُرّیتی ہوتی تھیں یعنی خوبصورت لونڈیاں جنہیں
کاکاخیل خٹک کاشغر سے لاتے تھے اور ۴۰ تا ۲۰۰ روپے فی لونڈی
بیچ دیتے تھے۔ دلہن خریدنے کی روایتی قبائلی رسم شہروں کے متوسط

---

[1] ۔ پردہ سسٹم پشاور میں ان دو سالوں میں ٹوٹنا شروع ہو گیا ہے جب یہ مواد
پریس کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

طبقے میں کسی حد تک کم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ اسلامی اور پاکستانی نکاح نامہ نے لے لی ہے، جس کے تحت شوہر جہیز اور کفالت یا خرچے کی ضمانت دیتا ہے۔ آخر الذکر کا مقصد بیوی کو اس کے شوہر کی وفات یا بعد میں اسے طلاق دینے کی صورت میں ایک خاص رقم کا حق دار بناتا ہے۔

لیکن اکثر قبائلی دلہنیں اب بھی ان کے والدوں کو نقد رقم یا جنس دیکر خریدی جاتی ہیں۔ زیر انتظام ضلعوں کے بعض امیر خوانین اور زیادہ طاقتور پہاڑی ملوک میں خاندانی کبروناز نے ان دونوں رسموں میں ایک خاص تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ بیوی کو ایک بڑی رقم کی ضمانت دینے کی بجائے جو صرف طلاق کی صورت میں یا شوہر کی وفات کے بعد ادا کرنا ہوتی ہے صرف ایک علامتی رقم کی ضمانت دی جاتی ہے جو ہر ایک آسانی سے ادا کر سکتا ہے۔ یہ اس بات کی غماز ہے کہ طلاق (یا اس کی جائز وجوہات) کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور معزز خاندانوں کے درمیان ایسے مالی تحفظ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے عقب میں یہ حقیقت ہے کہ جس سے طرفین اچھی طرح واقف ہیں کہ طلاق کا نتیجہ محض مالی سزا ہی نہیں ہوتا بلکہ سابقہ بیوی کے رشتہ داروں کے ہاتھوں معاہدہ شکن شوہر کی موت بھی ہو سکتی ہے۔

زمینی مالکیت:

غلمزئی پوندوں کے سوا بڑے بڑے پٹھان قبائل میں سے کوئی بھی صحیح معنوں میں خانہ بدوش نہیں۔ وہ اپنی سرزمین سے ایسے ہی محبت کرتے ہیں جیسے اپنی تلواروں سے اور اکثر ایک قبائلی اپنی ایک مخصوص بنجر اور سنگلاخ زمین سے ایسی محبت کرتا ہے جو اس محبت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، جو امریکی وسط مغرب کے ایک شیر خانہ کے مالک کو اپنی سرسبز اور زرخیز چراگاہوں سے ہوتی ہے۔ پٹھان کی قبیلے میں شہریت کا انحصار ہی اس کے حق دفتر یعنی حصہ زمین پر ہے اور قبائلی معاشرے کے مجموعی ڈھانچے میں جو اہم کردار زمینی نظام ادا کرتا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس کا مطالعہ قدرے تفصیل سے کیا جائے۔

جب قبائلی اپنی موجودہ زمینات پر آئے تو نئی زمین ایک اچھے خاصے معیاری طریقے سے تقسیم کی گئی۔ کل زمین کا قریباً نصف پورے قبیلہ کی مشترکہ چرائی کے لئے علیحدہ کر دیا گیا۔ اسے شاملات کہا جاتا ہے۔ باقی ماندہ قبیلے کے تمام بڑے بڑے گروہوں میں قریباً برابر برابر بانٹ دی گئی۔ ان میں سے ہر حصہ آگے ذیلی گروہوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا گیا اور چھوٹا سا حصہ مشترکہ یعنی بطور شاملات رکھا گیا۔ اس شاملات کا ایک قطعہ مسجد، امام اور ملاؤں کے لئے علیحدہ کر دیا گیا جسے سیری کہتے ہیں۔ پھر ہر بڑے خاندان نے ذیلی

گروہ کے باقی ماندہ حصہ میں سے برابر برابر اپنا قطعہ حاصل کیا۔

پھر خاندان نے اپنے بالغ مردوں کو الگ الگ پلاٹ دے دیئے[1]۔ جو مالک کے بیٹوں کو برابر برابر مل گئے ایسے ہی جیسے مالک کے حقوق گروہی اور قبائلی شاملات میں۔ گاؤں میں رہائشی پلاٹ بھی اسی طریقے سے تقسیم کئے گئے۔

فرد کا مفوضہ پلاٹ نجرہ کہلاتا تھا اور شاملات میں اس کا حصہ انعام، نجرہ اور انعام ملکر دفتر بنتے تھے اور تمام اصلی و نسلی پٹھان دفتری تھے۔ جب کئی نسلوں کے بعد اراضی کی تقسیم در تقسیم اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو ایک جرگے نے کچھ شاملات کے حصے بنائے

---

[1]۔ مثلاً یوسفزیوں کے خانزئی سیکشن میں تقسیم یوں ہوئی۔ مالیزئی نے قریباً ۶۰ فیصد زمین بطور شاملات رکھی اور باقی ۴۰۰ پلاٹوں میں کاشتکاری کے لئے یوں تقسیم کی گئی۔

تورڈو (۲۰۰) ہوتی (۲۰۰)

ہوتی ۱۰۰ — مردان ۱۰۰

سیری ۱۲ — مندورکی ۱۶ — کشتاگری ۷۲

خان خیل ۲۴ — رستم خیل ۲۴ — بدا خیل ۲۴

بہادر خیل ۱۲ — بامو خیل ۱۲

ہر خاندان
۱ ×

× ہر بھائی
ہر بچہ

اور بانٹ دیئے تاکہ اصلی بخروں میں کچھ اضافہ ہو سکے۔ اگر کوئی آدمی اپنی زرعی زمین پر کاشت نہیں کرنا چاہتا تھا یا اپنی رہائشی جگہ کو استعمال میں نہ لانا چاہتا تھا تو وہ اسے کسی مزارع کو ٹھیکے پر دے سکتا تھا لیکن ملکیت اسی یا اس کی اولاد کی ہی رہتی تھی۔ نہایت غیر معمولی حالات میں ہی وہ اس کا سرکاری طور پر انتقال کرتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے اسے قبیلے میں اپنی بنائے رکنیت سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ متروکہ زمین کوئی بھی استعمال میں لا سکتا تھا لیکن مالک یا اس کے خلاف کسی وقت بھی اس پر مع ترقیات اپنا حق دوبارہ حاصل کر سکتے تھے۔

بعد میں جب چرائی اور کاشتکاری کے لئے باربار تقسیم کی وجہ سے شاملات ختم ہو گئی تو نسلاً بعد نسلاً تقسیم در تقسیم کا سلسلہ رکنا ممکن نہ رہا اور آہنی دفتری نظام نے بہت سوں کو ہندوستانی میدانوں میں محنت مزدوری یا سرحدی پہاڑیوں میں ڈکیتی پر مجبور کر دیا۔ یہ زیادہ تر ایسے قبائل میں ہوا جیسے یوسفزئی جو زرخیز وادیوں میں رہتے تھے اور جن کا معاشرہ کاشتکاری پر ہی دارومدار کا عادی ہو چکا تھا۔ بنجر پہاڑیوں میں جہاں محض زراعت پہ انحصار ممکن نہ تھا قبائلی ڈھانچہ ہجرت سے کم متاثر ہوا اور ایک تنگ دست خاندان کی مطلوبہ ضروریات خوراک و رہائش پوری کرنا عمومی چندے کے ذریعے آسان رہا۔

جب انگریز آئے تو یہ زمینی ڈھانچہ کم از کم ۳۰۰ سال کی شکست و ریخت کے باوجود خاصا محفوظ تھا۔ اولین برطانوی ارباب بست و کشاد میں سے ایک نے ۱۸۵۱ء میں یوسفزئیوں کے متعلق لکھا کہ الحاق کے وقت "ہر آدمی اپنا نجرہ یا اس کا کچھ حصہ اپنی مرضی سے کاشت کرتا تھا اور کسی کو نہ لگان ادا کرتا تھا اور نہ ہی پیداوار کا کچھ حصہ۔ قبیلے کے لئے اس کا فرض صرف یہ تھا کہ وہ ان تمام جارحانہ اور مدافعانہ کارروائیوں میں حصہ لے جن کا فیصلہ جرگے کرتے تھے[۱۰]"۔

سکھوں کی زمینی پالیسی غیر مستقل تھی اور خالصتاً منفعت گیری کے لئے۔ انگریزوں کا مقصد ہر قیمت پر ایک منصفانہ لگان وضع کرنا اور وصول کرنا تھا لیکن یہ دونوں شاملات کو لگان سے مستثنیٰ قرار دیتے تھے۔ ٹیکس سے بچنے کی ایک غلط کوشش میں بہت سے پٹھانوں نے اپنے نجروں کے کچھ حصے انعام میں بدل دیئے۔ ان کا مزید اصرار تھا کہ اگر وہ کسی زمین کو مصنوعی آبپاشی کے ذریعے زیر کاشت لائے ہوں تو وہ ان کے محصولی نجروں کا حصہ نہ سمجھی جائے۔

یہ چالیں سکھوں کے دور میں تو کامیاب رہیں لیکن جب انگریزوں نے اپنے قبضے کے بعد بیس سال کے دوران بندوبست اراضی کیا تو وادی پشاور کے دفتریوں پر اکثر و بیشتر ان کے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ ملوک خوانین کو انگریز افسران بندوبست کے ساتھ اکثر سابقہ پڑتا تھا۔

۱۰- جیمز ایضاً - ص ۸۳

جن کا سابقہ تجربہ بنگال میں حاصل ہوا تھا جہاں زمینی نظام کافی مختلف تھا۔ افسران بند وبست کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہ معلوم کر سکیں کہ شاملات اور معاف اراضیات کا ذمہ دار کون تھا۔ ملوک و خوانین کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ ایک بڑی شاملاتی ملکیت ان کا وقار بڑھا سکتی تھی لہذا انہوں نے اکثر اپنے ناموں پہ اس کی لگان دہی کی ذمہ داری قبول کر لی اور وہ بند وبست کے نتیجے میں برطانوی قانون کے تحت شاملات کے بلا شرکت غیرے بن کر ابھرے۔

بظاہر متروکہ بجروں نے افسران بند وبست کے لئے ایسا ہی نازک مسئلہ پیش کیا جیسا کہ امریکی مغرب میں پیش آیا تھا۔ ابتدا ہی سے انگریزوں نے قابضین کے حقوق کو تسلیم کر لیا گو پہلے پہلے دفتری مالک رہا اور حصہ پیداوار کا حق دار بھی لیکن مخصوص حالات کے سوا اس کا مزارع کو نکالنے کا حق جاتا رہا۔ لیکن بعد میں ملکیت اور لگان ادا کرنے کی ذمہ داری طے کی گئی اور قطعی قرار دے دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض سابقہ دفتری نہ بجرہ کے مالک رہے نہ انعام کے گوجر یا اعوان غلام یا ہمسائے، کاشتکاری کے دائمی حقوق ہیں۔ مستقل کر دیئے گئے اور پٹھان دفتری کے پاس ملکیت رہی اگر اس کے پاس واضح ثبوت تھا اور زمین بوجہ عدم ادائیگی لگان ضبط نہ ہوئی تھی۔ چند حالتوں میں انگریزوں نے پٹھان معاشرے کی بنیاد کو سرے سے نظر انداز کر دیا اور زمین کی ملکیت بھی انہی گوجروں یا

اعواتوں کو دے دی جو اس پر کاشت کر رہے تھے۔

ابتداً ملک کا دفتر کسی اور قبائلی کے دفتر سے بڑا نہ تھا لیکن یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ عوامی نمائندہ کی حیثیت سے اس کے فرائض ایسے تھے کہ وہ اسے خود کاشت کرنے میں حائل تھے لہٰذا بہت سے ملوک نے اپنی پوری یا جزوی زمین کاشت کے لئے غیر پٹھان ہمسایوں کو دے رکھی تھی، چونکہ یہ لوگ اکثر و بیشتر پٹھانوں کی نسبت بہتر اور زیادہ محنتی اور زراعت کار تھے اور اپنے کم تر سماجی درجے کی وجہ سے ایک کمتر معیار زندگی پر قانع تھے۔ لہٰذا وہ ملک کے لئے زمین سے بہتر پیداوار لیتے تھے، جو ایک خود کاشت ملک نہ کر سکتا تھا۔ کچھ ملاؤں نے سیری پر بھی اسی طریقے کا اطلاق کیا اور وہ مذہبی مطالبات و فرائض کو زیادہ وقت دے سکے۔ اگر مزدور دستیاب تھے تو بہت سے عام پٹھان دفتریوں نے بھی اپنی زمین پر بزگر لیا دیئے اور خود جرگہ، لشکر، بدل اور میلمستیا کے تقاضے پورے کرتے رہے اور حجرے کی دلچسپیوں میں بے فکری سے مگن ہو گئے۔

یہ صورتحال دو وجوہات کی بناء پر دائمی بن گئی ہے۔ ایک تو بیرونی وظائف ہیں جو پٹھانوں کو ان کی سیاسی اور جنگی اہمیت کی وجہ سے خراج کے طور پر ملتے ہیں اور دوسرے زرخیز میدانوں میں لوٹ مار کے امکانات ہر وقت موجود ہیں۔ اس طرح بنجر زمینوں کے مالک قبائل بھی شاذونادر ہی بھوک کی شدت سے اتنے مجبور ہوئے

ہیں کہ وہ اپنے قبائلی عادات واطوار کو ترک کرکے گزارہ بخش زرعی معیشت اختیار کریں۔

ماہر بشریات فریڈرک بارتھ نے (جس نے ۱۹۵۴ء میں ریاست سوات میں کام کیا) پٹھان معاشرے کے اسی پہلو کی بنیاد پر ایک دلچسپ ماحولی نظریہ قائم کیا۔ بارتھ نے یہ معلوم کیا کہ مقامی کوہستانیوں کو آگے دھکیل دھکیل کر (اور یہ عمل کئی صدیوں تک جاری رہا) وادی سوات کے بالائی حصوں تک پٹھانوں کی توسیع وہاں رک گئی۔ جہاں وہ اس علاقے کے سرے تک جا پہنچے۔ جس میں ان کی طرز زندگی کے سہارے کے لئے دوہری فصل کاری ممکن تھی۔ کوہستانی نسبتاً زیادہ خالص زرعی معاشرہ ہونے کی بناء پر بلند تر علاقوں میں زندہ رہ سکتے تھے جہاں ایک ہی فصل اور قدرے گلہ بانی ممکن تھی[1]

ویش ۸ر

روایتی پٹھان زمینی نظام کا ایک انوکھا پہلو یہ تھا کہ وقتاً فوقتاً ایک طرف قبیلوں اور طائفوں اور دوسری طرف ایک ہی قبیلہ کے افراد کے درمیان تبادلۂ زمین ہوتا رہتا تھا۔ اسے ویش کہتے تھے۔

---

[1] فریڈرک بارتھ "ایکولوجک ریلیشنز ان سوات" نارتھ پاکستان" امریکن اینتھرو پالوجسٹ شمارہ ۵۸ (دسمبر ۱۹۵۶ء) ۱۰۸۱

اور اس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ ہر گروہ کا ہر فرد اور ہر گروہ ایک اکائی کے طور پر کچھ عرصے کے لئے بہترین زمین سے متمتع ہو سکے اور اس طرح اقتصادی قوت کی بناء پر قیادت کے ظہور کو روکا جا سکے۔ یہ تبادلے یوسفزئیوں کے بعض گروہوں میں گذشتہ صدی کے وسط تک جاری رہے اور تعجب خیز امر یہ ہے کہ یہ عموماً بلا کشت و خون ہو جاتے تھے۔ تبادلے مختلف مدت کے بعد ہوتے تھے۔ تین، پانچ، دس اور تیس سال کے بعد، کبھی صرف زمین کا تبادلہ ہوتا تھا اور کبھی رہائش گاہیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ یہ رسم اب ختم ہو چکی ہے، گو دیر، بنیر اور باجوڑ کے معیشت بہ پہاڑی علاقوں میں یہ اس صدی کے چوتھے عشرے میں بھی رائج پائی گئی۔[1]

سکھوں کے قبل از وقت بندوبست اراضی نے ویش کو تسلیم کر لیا لیکن انگریزوں نے ایسا نہیں کیونکہ اس کی وجہ سے ایک عاقلانہ نظام لگان بھی ممکن نہ تھا اور نہ ہی زمین کا ارتقا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں تبادلے کا مفصل بیان، الفنسٹن، ایضاً، ص ص ۲۲۵ تا ۲۲۶ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسم کا ذکر واربرٹن، ایضاً، ص ۲۳، جیمز، ایضاً، ص ص ۱۰۱، تا ۱۰۲، ڈیوس، ایضاً، ص ۵۵، اور لمسڈن، ایضاً، ص ۳۰ پر بھی موجود ہے۔

(۸) باب چہارم

ثقافت اور تصوّرِ حیات

پٹھان ثقافت پر مذہب اور زبان کا بہت گہرا اثر ہے اور یہ دونوں عوامل پٹھان قومیت کے پیچیدہ مسئلے میں بھی بے حد اثرانداز ہیں پٹھانوں پر تفصیلی نظر اور ان کے تصورِ زندگی کی تفہیم کے لئے مذکورہ بالا تینوں عوامل پر کچھ تبصرہ ضروری ہے۔

۱۔ مذہب :

اسلام برصغیر کے دوسرے حصّوں کے مقابلے پر سرحد میں پہلے پہنچا سوائے سندھ کے جہاں اسے عربوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں متعارف کروایا۔ لہٰذا یہ حیران کن نہیں ہے کہ تمام پٹھان مسلمان ہیں چونکہ انہیں اپنا مذہب سُنّی ترک خاندانوں کے ذریعے ملا لہٰذا یہ عین فطری تھا کہ پٹھانوں کی اکثریت سُنّی حنفی ہے۔

یہ بھی تعجب خیز نہیں ہے کہ پٹھان چونکہ سنجیدہ چیزوں کو سنجیدگی سے ہی لیتے ہیں لہٰذا وہ اپنے مذہب کے والہ و شیدا اور اکثر دیوانہ وا

پیرو ہیں۔ لیکن اجتماعی معاملات میں ایک بے حد عزیز غیر مذہبی روایت، خواندگی کی کم شرح اور اسلام کی اہم رَوؤں سے صدیوں پر پھیلے ہوئے الگ تھلگ پن نے اکثر قبائلیوں کے مذہبی شعور کو تنگ اور ذاتی بنادیا ہے اور توہم پرستی کے راستے کھول دیئے ہیں۔

اصولی لحاظ سے پٹھان اسلامی عقائد کی سادہ ترین شکل پر عمل پیرا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ۔ مقررہ نمازیں، اکل و شرب کے قوانین اور ماہ رمضان کے روزے سختی سے زیرِ عمل ہیں۔

دلچسپ طور پر پٹھانوں کی دو اہم ترین مذہبی تحریکات سُنّی قدامت پرستی سے منحرف ہوئی ہیں اور ان کا پٹھان تاریخ پر بہت گہرا اثر ہوا ہے۔

روشنیہ

سولھویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب بایزید نامی ایک شخص جو غالباً پٹھان ماخذ کا تھا گو وہ مدینہ کے عرب انصاری قبیلہ کی رکنیت کا دعویدار تھا جس نے مکہ شریف سے ہجرت پر آنحضورؐ کو خوش آمدید کہا تھا، سرحدی پہاڑیوں میں نمودار ہوا۔ بایزید اپنے دور کے لحاظ سے خاصا تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے مشہور پنجابی صوفی، ملّا سلیمان جالندھری سے استفادہ کیا تھا اور وہ ایرانی صوفیا اور ہندو جوگیوں سے بھی متاثر تھا۔

بایزید نے "پیرروشن" کا لقب اختیار کیا اور ۱۵۴۲-۴۳ء میں

پٹھانوں نے ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی۔ وہ ہندو عقیدہ تناسخ ارواح
کی تبلیغ کرتا تھا اور اس میں مزید اضافہ کرتا تھا کہ کچھ بھی موجود نہیں
ہے سوائے خدا کے جس کو پرستش کی کوئی خاص قسم مطلوب نہیں ہے۔
اس کے مطابق زمین پر خدا کا عظیم ترین اظہار پیر کی شخصیت میں ہوتا
ہے اور عظیم ترین پیر وہ خود تھا۔

یہ خیالات اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف تھے لیکن روشنی فرقہ
چند ہی سالوں میں پورے سرحد میں پھیل گیا اور قریباً سب یوسفزیوں
نے اسے قبول کرلیا۔ مذہبی میدان میں پیر روشن کا مہیب ترین مدِ مقابل
پشاور کا اخوند درویزہ تھا جو پشتو ادب کی اولین عظیم شخصیات میں سے
ہے اور غالباً پٹھان تاریخ کا محترم ترین سُنی مذہبی رہنما ہے۔ اخوند
نے پیر روشن کو پیر تاریک کہا اور بہت سے گمراہانِ فرقہ کو واپس
آغوشِ اسلام میں لے آیا۔

سولہویں صدی کے نصف آخر میں روشنی تمام پٹھان معاملات میں
ایک متحرک طاقت بن گئے تھے اور ان کی وجہ سے بہت سے بین القبائلی
معرکے بھی ہوئے اور مغلوں پر بھی کئی بڑے بڑے حملے کئے گئے۔ یہ فرقہ
۱۱۶۱ء میں قریباً مکمل طور پر تہہ و بالا کردیا گیا جب مُغل شہنشاہ جہانگیر
نے اس کے خلاف ایک زبردست مورچہ لگایا۔ لیکن تیراہ اور کوہ سلیمان
کی دورافتادہ وادیوں میں یہ مزید سالہا سال تک جاری رہا اور کوہاٹ
اور تیراہ میں پیر روشن کے چند مرید انیسویں صدی کے وسط تک اپنے

عقائد میں پکے رہے۔ آج کل بھی سُنّی قبائل بعتقد ہیں کہ بنگش اور اورکزئیوں
کے شیعہ اصل میں روشنی فرقہ ہی کے پیرو ہیں ۱۷

سید احمد بریلوی :۔

روشنیہ تو ایک قریب قریب خالصتاً پٹھان فرقہ تھا قبائلیوں
کا دوسرا مذہبی جوش و خروش انیسویں صدی کے اسلام میں ایک بڑی تحریک
کا حصہ تھا۔ یہ سید احمد بریلوی کے فرقہ پر مرکوز تھی۔ جنہوں نے ایک ایسی
تحریک چلائی جنہیں برطانوی دستاویزات میں ہندوستان کے جنونی
"پٹنہ سازش" یا "ہندوستانی وہابی" کہا گیا۔

سید احمد ہندوستان کے صوبجات متحدہ میں ۱۷۸۲ء میں پیدا
ہوئے۔ وہ جوانی میں پٹھان قزاق کے لشکر میں سپاہی رہے جس نے
متوسط ہند میں ریاست ٹونک کی بنیاد ڈالی تھی اور بالآخر دہلی آگئے
جو ہندوستان میں انحطاط پذیر مسلمان وراثت کا مرکز تھا۔ دہلی میں
انہوں نے بزرگ محترم شاہ عبدالعزیز ابن شاہ ولی اللہ سے فیض حاصل
کیا۔ سید احمد کی مذہبی سوچ بچار تھوڑے ہی عرصہ بعد فوجی رنگ
اختیار کر گئی اور ان کے گرد کچھ ارادت مند اکٹھے ہو گئے جن میں شاہ
عبدالعزیز کا بھتیجا اسماعیل بھی شامل تھا۔ انہوں نے ایک کتاب شائع

۱۷۔ رجوے نے بھی اس عقیدے کا ذکر کیا ہے۔ ایضاً ص ۲۱

کروائی جس میں پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں پر سکھا شاہی کے مظالم کی پُرزور مذمت کی گئی تھی۔

۱۸۲۰ء میں سید احمد حج پر گئے اور عرب میں وہ سعود خاندان کے بنا کردہ وہابی فرقہ کے زیر اثر آ گئے۔ ہندوستان واپس آ کر انہوں نے سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کیا اور جب ہندوستان میں کئی دورے کے بعد ان کے پیروؤں کی تعداد بڑھ گئی تو وہ سرحد کو چل پڑے۔[1] پٹھان بالخصوص یوسفزئی جو سکھا شاہی سے بہت تنگ تھے سید احمد کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور مؤخر الذکر نے درانی سرداروں کے ساتھ مل کر وسیع پیمانے پر بغاوت کے انتظامات کئے۔ یہ سردار سکھوں کی طرف سے پشاور کے حکمران تھے جب ایک سکھ فوج سرحد پہنچی تو سرداروں نے سید صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا اور ان کے قبائلی لشکر کو ۱۸۲۸ء کے معرکے میں تتر بتر کر دیا گیا۔ اس کے بعد سید احمد یوسفزئی علاقہ میں پناہ گزین ہوئے اور زیدہ اور ھنڈ کے خوانین اور ملک میر بابا چارگلئی کی مدد سے سرداروں پر کامیاب حملہ کیا اور یار محمد ۱۸۲۹ء کی جنگ زیدہ میں مارا گیا۔ ۱۸۳۰ء میں وہ پشاور سے سرداروں اور سکھ گورنر کو بھگانے میں کامیاب ہو گئے اور یہ شہر

---

[1] سر ولیم ہنٹر کی "آور انڈین مسلمانز" (لندن: ٹروبنر، ۱۸۷۲ء) سید احمد کی تحریک کا ایک جامع لیکن متعصبانہ بیان ہے۔

مختصر سے عرصہ کے لئے ایک نئی اسلامی سلطنت کا پایۂ تخت بن گیا۔

سرحد آنے سے پہلے سید احمد نے ہندوستان میں مراکز قائم کئے تھے۔ یہ گروہ برطانوی حکام سے متصادم ہو گئے اور سید صاحب کو سکھوں کے خلاف مہمات میں ان کی طرف سے مسلسل کمک ملتی رہی اہم ترین مرکز پٹنہ تھا۔

سید صاحب سرحد میں اپنے تطہیری عقائد پھیلاتے رہے اور اس بناء پر کہ ہر صحیح مسلمان کو شادی شدہ ہونا چاہیے۔ انہوں نے پٹھانوں پر زور ڈالا کہ وہ ان کے پیروؤں کو رفیقہ ہائے حیات مہیا کریں۔ جو ہندوستان سے ان کے بغیر آئے تھے۔ بالآخر قبائلی ان کی تعلیمات کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک مقررہ جمعہ کو پورے یوسفزئی علاقہ میں آگ جلائی گئی اور اس اشارے پر سید صاحب کے مُلّا مار دیئے گئے اور ان کی روحانی قیادت کو ٹھکرا دیا گیا۔

اس کی وجہ سے ان کے گروہ کو ضلع ہزارہ کی پکھلی وادی میں پناہ لینا پڑی جہاں ان پر سکھوں نے دباؤ ڈالا اور ۲ مئی ۱۸۳۱ء کو شیر سنگھ اور جنرل ایوی ٹیبل کے تحت ایک سکھ فوج نے سید صاحب کو شہید کر دیا۔[1] باقی ماندہ گروہ کو بنگال اور پٹنہ سے مسلسل امداد اور رضاکار

---

[1]- راقم الحروف کو درانی سرداروں، سکھوں اور سید احمد کے درمیان تکونی آویزش کے واقعات کا صحیح تسلسل قائم کرنے میں مشکل پیش آئی۔ یہاں جو تسلسل دیا گیا ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ملتے رہے اور اسکی کی سرگرمیاں روز بروز انگریزوں کے خلاف بڑھتی گئیں۔ ۱۸۵۸ء تک تحریک نے دوبارہ اتنی قوت حاصل کر لی کہ خداخیل نے فرنگی راج کے خلاف بغاوت کر دی۔ ایک برطانوی دستہ بستی تباہ کرنے کے لئے بھیجا گیا لیکن گروہ یہاں سے ناقابلِ رسائی براند و وادی میں منتقل ہو گیا۔

۱۸۶۸ء میں انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا گیا اور دیر سے کوہستان تک کے تمام قبائل فرنگیوں کے خلاف اس فرقے سے مل گئے۔ نتیجہ امبیلہ کی مہم تھی جس میں انگریزوں کی ۹ ہزار فوج کا ۱۰ ر فیصدی حصہ مارا گیا یا زخمی ہوا۔ یہ اس وقت تک شمال مغربی ہندوستان میں انگریزوں کی سب سے بڑی مہم تھی۔ سید احمد کے پیروؤں اور قبائیوں کے راستے ایک دفعہ پھر جدا جدا ہو گئے اور ان کی بستی بنیر اور سندھ پار کوہ سیاہ میں قائم ہونے سے پہلے تیس سال تک اِدھر اُدھر بالائی یوسفزئی علاقہ میں بھٹکتی رہی۔ اس کے چند علمبردار اب بھی چمرقند میں موجود ہیں۔

روشنیہ اور سید احمد کا بنا کردہ گروہ مذہب کی دو متقابل انتہاؤں پر تھے۔ اول الذکر ایک خالص مقامی فرقہ تھا جس میں صوفیانہ

(بقیہ حاشیہ)

وہ جبر ایضاً ص ص ، تا ۱۷ کے مفصل بیان پر مبنی ہے جو مذکورہ واقعات کے ۲۵ سال بعد مقامی ذرائع سے اکٹھا کیا گیا تھا۔

رجحانات غالب تھے جبکہ آخر الذکر تطہیری رجحانات کے عربی و ہندوستانی اسلام کی پیداوار تھا۔ ان کے درمیان . سال کا زمانی فاصلہ تھا۔ پٹھانوں نے دونوں فرقوں کی اطاعت قبول کی لیکن پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد کنارہ کشی کر لی۔ لیکن ہر فرقے نے اپنے عروج پر بے پناہ جوش و خروش پیدا کیا اور اہم واقعات کو جنم دیا۔

یہ سمجھنا مشکل ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ پٹھانوں کی مسلمہ زود اعتقادی ایک ناکافی جواب ہے۔ غالباً دونوں تحریکات میں کشش اس وجہ سے تھی کہ انہوں نے اسلام کے پردے میں پٹھانوں کی انفرادیت اور اپنے نام نہاد حکمرانوں دہلی میں مغل اور دوسری میں سکھ اور انگریز کے خلاف نفرت کے اظہار کے مواقع پیش کئے۔ بہر کیف اس میں کلام ہے کہ اگر یہ تحریکات پُر امن اور غیر سیاسی ہوتیں اور ان کا اس دنیا میں انتقام و عظمت و شہرت کی بجائے صرف اگلی دنیا میں نجات سے سروکار ہوتا تو بھی ان میں کوئی کشش ہوتی۔

۲- زبان و ادب ۱۸

کابل کے بعض عاشقانِ پشتو کا دعویٰ ہے کہ یہ زبان قدیم آریہ زبان کی براہِ راست اولاد ہے اور سنسکرت اور اوستائی دونوں پشتو کی شاخیں ہیں۔ یہی مکتبۂ فکر غور کے امیر کروڑ کے حوالے سے کہتا ہے کہ پشتو شاعری آٹھویں صدی عیسوی میں بھی موجود تھی۔ یہ دعاوی

شکوک معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ خاصا واضح ہے کہ زبان کا ارتقا بحیثیت
ایک ادبی ذریعہ اظہار دورِ اسلام کے بعد ہُوا ۔

نسبتاً بہت کم پشتو ادب کا یورپی زبانوں میں ترجمہ ہُوا ہے اور
معدودے چند مسوّدات یا مطبوعات دستیاب ہیں[1] ۔ اوّلین عظیم
قلمکار غالباً اخوند درویزہ تھے اور ان کی تصنیف "مخزن" قریباً ۱۵۲۵ء
سے شروع ہوتی ہے ۔ یہ کتاب پیر روشن کے نظریات کی شستہ تردید
ہے اور اصولِ الٰہیات، خطیبانہ ظرافت اور منطقی استدلال کا ایک
نمایاں امتزاج ہے اور تھامس ایکوئی ناس کی "سما تھیا لوجیکا" کی یاد
دلاتی ہے[2] ۔

1۔ انگریزی کتب میں شامل ایچ ۔ جی ۔ راورٹی کی "سیلیکشنز فرام دی پوئٹری آف
دی افغانز" (لندن : ولیمز اینڈ نارگیٹ ۱۸۶۷ء) اور سی ای بڈلف کی "افغان
پوئٹری آف دی سیونتھ سنچری" (لندن کیگن پال، ٹرینچ، ٹروبنر ۱۸۹۰ء)، جیمز ڈار
میسٹر کی "چینٹس پاپولیرس ڈیس افغانز" (پیرس امپیری میری نیشنل ای ایرڈکس
۱۸۸۰ء تا ۱۸۹۰ء) میں لوک گیتوں کا ایک بڑا انتخاب ہے جن میں سے بہت
سے اس دور اور قدیم دور کے مشہور واقعات پر ہیں ۔ ڈارمیسٹر کی کتاب کا پہلا
حصہ غالباً بہترین دستیاب ثقافتی و لسانی تاریخ ہے ۔ پشتو اکاڈمی پشاور کے
پاس ان مسودات کا ایک خاصا مجموعہ اور اسے کچھ مطبوعات کا بھی شرف حاصل ہے ۔

2۔ سینٹ تھامس ایکوئی ناس ۱۲۲۷ تا ۱۲۷۴ء الٰہیات اور علم الکلام کا ماہر
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خوشحال خان خٹک :-

خوشحال خان خٹک جو غالباً پشتو کا بہترین اور مشہور ترین شاعر تھا ۱۶۱۳ء میں پیدا ہوا۔ وہ طاقتور خٹک قبیلے کے سردار شہباز خان کا بیٹا تھا۔ صاحب سیف و قلم ستائیس سال کی عمر میں اپنے قبیلے کا سردار بنا جب اس کا والد یوسفزئیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ خوشحال خان کے پاس مغل شہنشاہوں کی طرف سے ایک جاگیر تھی اور اس نے کئی شاہجہانی جنگوں میں حصہ لیا جن میں ۱۶۴۴ء میں بدخشان کی ایک مہم بھی شامل تھی۔

خوشحال خان کی شہنشاہ اورنگزیب سے ان بن ہو گئی جو ۱۶۵۹ء میں شاہ جہان کا جانشین بنا تھا۔ اورنگزیب نے شاعر کو سات سال کے لئے متوسط ہند کے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا اور اسی دوران خوشحال کی اکثر بہترین تصانیف لکھی گئیں۔

رہائی کے بعد خوشحال خان واپس اپنے گھر آیا اور شہنشاہ کے خلاف ایک قبائلی اتحاد قائم کیا۔ اس میں اس کے بڑے حلیف آفریدی تھے اور بڑے حریف یوسفزئی۔ آخرکار اورنگزیب نے اس اتحاد کو رشوت اور مناصب کے وعدوں سے توڑ دیا اور خوشحال خان کا اپنا بیٹا بہرام مغلوں سے جا ملا اور کئی دفعہ اپنے والد کی جان لینے کی کوشش

(بقیہ حاشیہ)
المعروف بہ "عالم ملکوتی"۔ سینٹ آگسٹائن کے بعد کیتھولک عیسائیت پر سب سے زیادہ اثر اسی کا ہے۔ اس کی مذکورہ کتاب عام معلومات اور الٰہیات کا خلاصہ ہے (مترجم)

کی۔ قبائل کے افتراق اور اپنے بیٹے کی دغابازی نے خوشحال میں ایک سخت تلخی اور بیزاری پیدا کر دی جو اس کی بعد کی نظموں میں عکس ریز ہیں۔

مُغلوں کے مستقل دباؤ کے تحت خوشحال نے اپنے وفادار بیٹے اشرف کے حق خٹکوں کی سرداری سے دستبرداری اختیار کر لی جو خود بھی ایک معمولی شاعر نہ تھا اور خود چند جان نثاروں کے ساتھ پہاڑیوں میں جا بجا پھرتا رہا جبکہ بے رحم بہرام اس کا تعاقب کرتا رہا۔ ضعیف شاعر بالآخر آفریدی علاقے میں آباد ہو گیا اور ۷۸ سال کی عمر میں خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ اس کی میّت دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ واقع خٹک پہاڑوں میں اکوڑہ کے مقام پر لائی گئی اور خفیہ طور پر دفنا دی گئی تاکہ اسی کے الفاظ میں ؎

اُڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ ۔ مُغل شہسواروں کی گردِ سمند

اس کا مقبرہ آج بھی موجود ہے اور پٹھانوں کے لئے مقدس ہے۔ پٹھان عزت و غیرت کے عین مطابق خوشحال نے روایت کے مطابق وصیّت کی کہ اگر کبھی اس کا کوئی وفادار بیٹا اپنے غدّار بھائی بہرام کو پکڑ سکے تو اسے دو حصّوں میں کاٹ کر ایک حصّہ خوشحال کی قبر کے پاؤں اور دوسرا اس کے سر پہ جلا دیا جائے۔

خوشحال کی تحریریات ایک وسیع میدان پر محیط ہیں۔ رلورٹی کے مطابق خوشحال نے پشتو اور فارسی دونوں میں طب، اخلاقیات، فقہ،

فلسفہ اور شاہین بازی پر لکھا اور ایک خود نوشت سوانح عمری بھی لکھی[۱۶] لیکن اس کی شہرت شاعری پر منحصر ہے۔ کئی سو نظمیں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں ان میں سے بہت سی کا ابھی ترجمہ نہیں ہو سکا۔ منظومات بھی موضوعات کے ایک وسیع میدان پر محیط ہیں یعنی عشق و محبت جنگ و جدل، شکار، فطرت، مذہبی عبادات اور سیاسی معاملات ان تمام میں سے خوشحال خان حقیقت پسندی سے کام لیتا ہے اور اس لحاظ سے وہ پشتو شعراء میں اپنی مثال آپ ہے کیونکہ اکثر پشتو شعراء صوفیانہ انداز میں مادی و جسمانی تشبیہات صرف عشق الٰہی اور صداقت ابدی کو بیان کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

خوشحال خان ساٹھ بیٹوں اور غیر شمار کردہ بیٹیوں کا باپ تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ جب وہ اپنی محبوبہ کے شیریں لبوں، پتلی کمر اور گداز کولہوں کا ذکر کرتا ہے تو وہ کسی صوفیانہ علامت کی بجائے گوشت پوست کی عورت کا ہی ذکر کرتا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنے بڑھاپے کی مندرجہ ذیل تشبیہ کو کئی دفعہ حقیقت بنایا ہوگا۔

"بوڑھے عقاب کی طرح میری پروازیں بھی پہاڑیوں میں ہیں
پھر میں نے بہت سے خوبصورت نوجوان چکور پکڑے ہیں
عقاب جوان اور اناڑی ہو یا بوڑھا اور تجربہ کار، اپنا شکار

۱۶- راورٹی، ایضاً، ص ۷۴۔

خود تلاش کرتا ہے۔ لیکن بوڑھے پرندے کی جھپٹ زیادہ بچی تلی اور تیر بہدف ہوتی ہے۔

"اے خوشحال، معاملات عشق آتشیں اور پُر لوہ ہیں
اور اگر شعلہ بجھ بھی جائے تو دھواں باقی رہتا ہے"[1]

خوشحال خان کی اپنی سرزمین اور اس کے لوگوں سے محبت، ان کے افتراق پر اس کی مایوسی اور مغلوں سے اس کی نفرت بے پناہ اس کی نظموں میں جیتے جاگتے انداز میں بیان کی گئی ہیں۔

"قدیم ایام میں پٹھان ہندوستان کے بادشاہ تھے
اور اب بھی وہ مغلوں سے گوئے سبقت لے جا سکتے ہیں
" لیکن ان میں کوئی اتفاق نہیں اور انہوں نے خدا کے بخشے ہوئے اتحاد کو توڑ دیا ہے۔
لہٰذا وہ ہیچ ہو کر رہ گئے
یا خدا! اگر تو انہیں پیار محبت سے نواز دے
تو خوشحال پھر سے جوان ہو جائے!

---

[1]- اس کتاب میں پشتو شاعری کے ترجمے مختلف ذرائع سے لئے گئے ہیں جن میں زبانی ذرائع بھی شامل ہیں لیکن نظموں کا متن عام طور پر راورٹی اور بیڈلف کے تراجم کا ہی مستوجب ہے۔

خود دار پختون مغل کے ساتھ کیسے صلح کر سکتا ہے؟

وحشی جانور آسانی سے صلح جوئی کر سکتے ہیں

جس کا فخر ہی اس کے کھردرے پہاڑی کپڑے ہوں

اسے نمائشی مغل شال زیب نہیں دیتے

یقیناً پختون سوجھ بوجھ میں کمزور ہیں

وہ قصاب خانے کے دُم کٹے سگ ہیں

انہوں نے مغل سونے کے بدلے حکومت گنوا دی

اور وہ مغل عہدوں کے لئے بے چین ہیں

اگر ایک لدا ہُوا اُونٹ ان کے گھروں میں داخل ہو

تو وہ سب سے پہلے اس کے گلے کی گھنٹی چرانے کی فکر کرتے ہیں۔

وہ قندھار سے شروع ہوتے ہیں اور دمغار تک پھیلے ہوئے ہیں

اور ان کے درمیان رہنے والے سب لوگ بےکار اور نکمے ہیں

اگر پختون لوگ نسل انسانی سے تعلق رکھتے ہیں

تو انداز و اطوار میں وہ بالکل ہندو ہیں

اُن کے پاس نہ کوئی ہنر ہے نہ ذہانت

بلکہ وہ جہالت اور لڑائی میں مست ہیں۔

وہ نہ اپنے آبا و اجداد کے احکام مانتے ہیں

نہ اپنے اساتذہ کرام کی بات سنتے ہیں۔

وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی گھات لگائے رکھتے ہیں

لہٰذا بدبختی اُن پر ہمیشہ مسلط رہتی ہے
پھر بھی او خوشحال! خُدا کا شکر بجا لاؤ
کہ وہ غلام نہیں بلکہ پیدائشی آزاد ہیں!،،

خوشحال خان نے شاعری میں وہی جراُتِ رندانہ اور جذبے کی آنچ بھر دی جس کا مظاہرہ پٹھان لڑائی میں کرتا ہے۔ اسی طرح وہ پٹھان کی خود اطمینانی اور فقدانِ عجز بھی اس میں لایا اور پرُ سکون انداز میں اعلان کیا: "جب میں نے شاعری میں اپنا جنگی پرچم بلند کیا تو میں نے اپنے جنگی گھوڑے پر الفاظ کی دنیا سوار کر دی"۔

لیکن اس میں تقدیر پرستی اور عیش کوشی کا عنصر بھی تھا جو ناگزیر طور پر ہمیں عمر خیام کی یاد دلاتا ہے جیسا کہ اس کی نظم "توصیفِ شراب" میں ہے۔

" میں تو ایک بلانوش ہوں، مجھ سے متانت نہ ڈھونڈو
میں تو صبح سے شام تک جام ہائے بے ریزیہ پیتا رہتا ہوں
اے شراب تیرے چہرے سے حسن آفتاب کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟
سوچ تو ایک چراغ ناتواں ہے جبکہ تو صبح صادق کی مقابل ہے۔
زاہد! ایک دوشیزہ کا چہرہ دیکھنے سے اپنی آنکھیں مت بند کرو
یہ فعل شرعِ عشق میں جائز ہے۔
ساقی! لمحاتِ غم میں اپنی شراب میرے جام میں ڈالدو
تاکہ یہ بلور میں چمکتی ہوئی ابھرے۔

محتسب! اٹھو کہ خوشحال آ گیا
لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ! غسلِ شراب کرو
کیونکہ وضو سچے مسلمان کا اوزار ہے"

بعد کے خٹک :

خوشحال خان کا شاعرانہ جوہر اس کی اولاد میں بھی نمودار ہوا۔ اس کی بیٹی حلیمہ ایک اچھی شاعرہ تھی اور اس کا بیٹا اشرف جس نے اپنی زندگی کے آخری دس سال مُغل قیدی کی حیثیت سے حیدرآباد دکن اور مہاراشٹر میں گزارے۔ پشتو کے نصف درجن بہترین شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ اشرف کی اکثر نگارشات گمشدہ وطن کے افسوس اور جلاوطنی کی آرزوؤں کا ایک دردانگیز اظہار ہیں۔ لیکن وہ اپنے والد کی آتشناکی اور عالگیریت سے بے بہرہ تھا اور اس کی بہت سی تخلیقات ادق اور اس کے معانی مبہم ہیں۔

خوشحال خان کا ایک اور بیٹا، عبدالقادر خان خٹک اکثر پٹھانوں کے نزدیک اپنے بھائی اشرف سے بہتر شاعر تھا۔ قادر نے جامی اور سعدی کی نظموں کو فارسی سے پشتو میں منتقل کیا اور اس کی اپنی تحریرات میں اپنے ممدوح و محبوب ایرانی صوفیوں کے تصوّف کا گہرا اثر ہے۔ قادر اپنے بڑے بھائی کے بعد خٹکوں کی سرداری کا آرزومند تھا لیکن اشرف کے بیٹے 'افضل' نے ایک ہی دن میں قادر، دس دوسرے چچا اور بہت

سے عمر اور موت کے گھاٹ اتار دیئے۔

خوشحال خان کا پوتا افضل اپنی ادبی اور خون آشام صفات کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کی نظمیں بہت کم دستیاب ہیں لیکن اس کی تاریخ مرصع پندرھویں تا اٹھارہویں صدی کے قبائل پر ایک بہترین تاریخی ماخذ ہے[1]

افضل کا بیٹا قاسم خان خٹک (خوشحال خان کا پڑپوتا) ۱۷۲۵ء کے قریب پیدا ہوا۔ وہ اوائل عمری میں ہی اپنی آبائی سرزمین چھوڑ گیا اور کشمیر اور ہندوستان میں پھرتا رہا۔ وہ تھوڑا عرصہ سرہند میں رہا اور پھر رام پور کی روھیلہ ریاست میں آباد ہو گیا۔ اس نے شادی نہیں کی اور جب وہ رام پور میں فوت ہوا تو اس کی میت خٹک پہاڑیوں میں لاکر آبائی قبرستان میں ہی دفن کی گئی۔ قاسم "شیدا" تخلص کرتا تھا اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں سرہندی صوفیا کا ارادت مند رہا۔ اس کی نظموں میں تصوف کی چاشنی ہے اور ان میں کلاسیکی فارسی تشبیہات اور مابعد الطبیعاتی استعارات بہت زیادہ ہیں۔ پٹھان اس کی نگارشات کو بہت محترم گردانتے ہیں لیکن ان میں خوشحال خان کے اشعار کی جذبات انگیزی نہیں ہے

---

[1]- تاریخ مرصع کا جزوی ترجمہ "خالد افغانی" مجموعہ میں مل سکتا ہے۔ مترجم ٹریور چیچیل پلاؤڈن (لاہور، منشی گلاب سنگھ، ۱۸۹۳ء)

اور بہت سے قبائل تو قاسم کے صوفیانہ مطالب کو شاید ہی سمجھتے ہوں گے۔

رحمان بابا

مُلّا عبدالرحمان المعروف بہ رحمان بابا غالباً خٹک مکتب شعر کے باہر سب بڑا شاعر تھا اور پٹھان اس کا ایسے ہی حوالہ دیتے ہیں جیسے عظیم خوشحال خان کا۔ رحمان ایک غوریہ خیل مہمند تھا جو اپنے ولدیتی گاؤں میں الگ تھلگ زندگی گزارتا تھا اور زیادہ وقت مذہبی ریاضت پر صرف کرتا تھا۔ اس کی اکثر نظمیں ۱۶۷۰ء اور ۱۷۱۰ء کے درمیان لکھی گئی ہیں یعنی خوشحال خان سے کم و بیش ایک نسل بعد۔

رحمان بابا کی نظموں میں بھی صوفیانہ رنگ ہے لیکن ایرانی صوفیا اور ان کے مقلّدین کے برعکس اس کی نظمیں سادہ اور دل بدل ہیں۔ اس کی ایک نظم اللہ تعالیٰ کی حمد و مناجات ہے جس میں اسماء الحسنیٰ ایسے گنوائے گئے ہیں جیسے نائسین دستاویز میں[1] اور اسلام کے عدیم

---

[1] عیسائی عقائد کا ایک باقاعدہ منشور جسے نائسیا منعقدہ کونسل نے ۳۲۵ء میں ایک دستاویز کی شکل دی اور جس میں عقیدۂ تثلیث پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشابہت غلط اور گمراہ کن ہے (مترجم)

المثال، اللہ کی جنگ جو یا نہ۔ واحدیت واحدیت پہ بار بار تکرار کے ذریعے
زور دیا گیا ہے۔ رحمان نے اخوتِ انسانی اور تسخیرِ ذات کی بھی ایسی
زبان میں تبلیغ کی جو عیسائی صوفیا کی یاد دلاتی ہے۔ اس کے ابیات
ایسی کہاوتوں سے بھرپور ہیں جیسے "ایک پنڈت اندھا اس آدمی سے بہتر
ہے جو دوسرے کی بیوی پر نظر رکھتا ہے" اور "میں رحمان ہر اس آدمی کا
غلام ہوں جو خدا ترس ہو خواہ وہ اونچے، درمیانے یا نچلے درجے کا ہو"۔
لیکن رحمان بابا میں اتنی پٹھانیت تھی کہ وہ خوشحال خان کے ایک نصف
صدی پرانے چیلنج کا جواب دیے بغیر نہ رہ سکا جب اس عظیم خٹک
نے "دنیا کے الفاظ پر چھا جانے" کی شیخی بگھاری تھی۔ اس نے اپنی ایک
نظم کے مقطع میں کہا "خوشحال خان میرا ایک غلام تھا کیونکہ پشتو زبان
میں میں ہی واحد عالمگیر ہوں"۔ [1]

عبدالحمید

رحمان بابا کا ایک نوجوان معاصر، عبدالحمید بھی مہمند تھا اور
صوفیا کا معتقد تھا۔ وہ موشگافی کا شیدا تھا اور زندگی کے متعلق ایک
طنزیہ اور مزاحیہ تصور رکھتا تھا۔ اس کی ایک بے حد اثر انگیز نظم یوں
شروع ہوتی ہے:

1- عالمگیر مغل شہنشاہ اورنگزیب کا لقب تھا جس نے خوشحال خان کو شکست دی تھی۔

"اے احتیاج! تو کیسی بلائے عظیم ہے!

تو فطرتِ انسان کو فطرتِ سگ میں بدل دیتی ہے

تو مسلمان کو ہندو رسومات منانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے رواج کا پابند بنا دیتی ہے۔

تو شاہوں اور شہزادوں کو اپنے دروازے پر لا کھڑا کرتی ہے

اور انہیں ان کے تخت و تاج سے محروم کر دیتی ہے۔"

عبدالحمید کی ایک اور نظم جو عشق کے موضوع پر ہے اس طنزیہ انداز میں شروع ہوتی ہے۔

"جیسے تخت و تاج بادشاہوں کو

ایسے ہی تباہی و بربادی عاشقوں کو عزیز ہیں"

مرزا خان انصاری ؒ

مرزا خان انصاری عام طور پر روشنیہ فرقہ کے بانی پیر روشن کا ایک پوتا خیال کیا جاتا ہے لیکن کچھ مدح سرا پٹھان اسے سو فیصدی یوسفزئی قرار دیتے ہیں۔ قاسم خان خٹک کی طرح انصاری بھی اپنی پہاڑیوں سے باہر نکل گیا۔ وہ ہرات میں جانا پہچانا جاتا تھا۔ وہ ایک راجپوت ریاست میں کچھ عرصے کے لئے درباری شاعر بھی رہا۔ مُغل شہنشاہ اورنگزیب نے اس کی سرپرستی کی اور اپنی قدامت پسندی کے باوجود انصاری کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا حالانکہ اس کی نگارشات

میں اپنے دادا کی بدعت اور ارتداد اور اس کے اپنے صوفیانہ میلانات
کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آخری ایام میں انصاری سبکدوش ہو کر
واپس تیراہ میں آگیا۔ اپنے بدعتی عقائد سے تائب ہوا اور اس وقت
کے پشاور کے موقت الشیوع مکاتب فکر کا ایک مشہور مذہبی عالم بنگیا۔

خواجہ محمّد بنگش ؒ

خواجہ محمّد بنگش کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور اس
کی صرف چند نظمیں ہی دستیاب ہیں۔ خواجہ محمّد پشتو ادب میں ناقدین
کے شاعر کی ما تند ہیں اور اب بھی بنگشوں کے بعض قبیلے اسے اپنے
آبائی شاعر کی حیثیت سے محترم گردانتے ہیں گو اسے سمجھا کاری دار دئیے
اس نے شہنشاہ اورنگزیب کے دورِ حکومت میں راسخ لاعتقادی کے
محافظ کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کی اور حرمین شریفین کی
زیارتیں بھی کیں تاہم اس کی معدودے چند دستیاب نظموں میں بہت
سے دیگر پٹھان شعراء کی مانند صوفیانہ رجحانات پائے جاتے
ہیں اور اس کا روایتی اخلاقی دینیات سے انحراف اس کے مندرجہ
ذیل شعر سے ظاہر ہے:

اللہ تعالیٰ کے بحرِ رحم وکرم کی مہر آگیں لہروں میں
خواجہ محمد کے چھوٹے چھوٹے گناہ کیا حیثیت رکھتے ہیں؟

پشتو شاعری کی تاریخ میں اور بھی بہت سے اسمائے صغیرہ

ہیں ۔ اس عظیم روایت میں قریباً سب کے سب مشمولہ بہ بہت سے
مذہبی رہنما اہلِ سیف و قلم ہیں ۔ آج کل بھی پشاور یا کابل میں غالباً شعراء
کا اجتماع ہونا دوسرے پشتوں کے مقابلے پر آسان تر ہے سوائے مجاہدوں
کے ۔ اہم ترین باغی ملوک (جو آج کل پختونستان تحریک چلاتے ہیں)
میں سے ایک میرا جان مہمند ہے جو اپنے تخلّص سیال کی بدولت دُور
دُور تک جانا پہچانا جاتا ہے اور اتنا متنازعہ فیہ نہیں رہتا ۔ ایسے ہی
حاجی ترنگزئی ایک مہمند مُلّا تھا جو بیسویں صدی کے ربع اوّل میں انگریز
حکمرانوں کے پہلو میں کانٹا بنا رہا لیکن وہ بہت سے قبائلی دیہات میں
انگریزوں کے خلاف جہاد سے کہیں زیادہ پشتو زبان کے مربّی اور عالم
کی حیثیت سے مشہور تھا۔

احمد شاہ ابدالی !۔

لیکن ان دوسرے قلمکاروں میں سے ایک خصوصی ذکر کا مستحق
ہے اور وہ بنیادی طور پر اس لئے کہ اس کا ادبی ذوق ایک عظیم تاریخی
اہمیت سے مربوط تھا ۔ یہ احمد شاہ ابدالی ہے جو افغانستان کا
اصلاً اور واقعتاً بانی ہے ، جیسا کہ پہلے ذکر ہُوا ۔ احمد شاہ نے ۱۷۴۷ء
میں درانی خاندان کی بنیاد رکھی اور بعد میں ایران کے بیشتر حصّہ
کشمیر اور شمالی ہندوستان پر اپنی حکومت پھیلا کر ۱۷۶۱ء کی تیسری
جنگ پانی پت میں مرہٹہ طاقت کو پاش پاش کر دیا ۔ احمد شاہ نے

فارسی میں کئی نظمیں لکھیں اور غزلوں کا ایک مجموعہ اپنی مادری زبان پشتو میں چھوڑا۔ اپنی خونیں زندگی کے برعکس احمد شاہ کی نظمیں اپنے گناہوں کے لئے خُدا کے رحم و کرم کی التجاؤں اور اپنے جسم کی تصریحات و مطعومات کو زیر کرنے کی قوت کے لئے دعاؤں سے مملو ہیں۔ ایک کا مطلع ہے۔

"میرے اللہ! میں تجھے پکارتا ہوں کیونکہ میں اپنی خطاؤں اور عُدوان پر شرمسار ہوں لیکن میں مایوس نہیں ہوں کیونکہ کوئی بھی تیرے دَر سے رحم کی امید سے خالی نہیں گیا"۔

ایک اور نظم کا مطلع ہے :-

"خُدا تجھے غارت کرے انسانی فطرت! کہ تو ایک مکھی ہے اور کوئی بھی منہ تیری ناپاک لمس سے غیر آلودہ نہیں رہا!"

اپنے گوشت پوست کی لذتوں کے تعاقب سے یہ اظہارِ نفرت سخت کوش ایشیائی قائد احمد شاہ کو کم از کم ایک لحاظ سے قرونِ وسطیٰ اور ابتدائی نشاۃِ ثانیہ کے عیسائی یورپ کے حکمرانوں کے دوش بدوش لا کھڑا کرتا ہے۔

پشتو لوک ادب :-

بہت سے گیت اور قصے جو پٹھان دیہات میں دہرائے جاتے ہیں قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے لوک ادب کی جولاتی کی یاد دلاتے ہیں۔

ایک مشہور ترین گیت کابلی عشقیہ گیت ہے "زخمی دل" جو ایک بدلے ہوئے لہجے اور الفاظ (بے مدعریاں) میں برطانوی راج کے پٹھان سپاہیوں کے کوچ کا پسندیدہ گیت تھا۔ ایک اور نسبتاً آسان اور سادہ عشقیہ گیت دو بیتہ ہے۔ چونکہ مستورات حصّہ نہیں لیتیں لہٰذا محبوبہ کا جواب مجلس کا ایک اور مرد رکن (جو اکثر و بیشتر ایک عورت کے بھیس میں ہوتا ہے) ہی گاتا ہے۔ اس گیت کا کچھ حصّہ درج ذیل ہے۔

"پھول تیرے بالوں میں ماند پڑ جاتے ہیں
اور تمہاری آنکھیں میری محبوب! محبّت کے پھول ہیں۔

اے میری خزانۂ نایاب!
اے میری زندگی! اے میری روح!
اے میری چھوٹی سی پہاڑی کوہسار!
تُو میری ستارۂ صبح ہے:
تُو پہاڑی پر کھِلا ہوا پھول ہے۔
تُو چوٹی کی سفید برف ہے۔

تیری ہنسی آبشار ہے
تیری سرگوشی ہوائے شب ہے۔
اے میری شگوفۂ سیب کی ٹہنی!
تیری آنکھوں میں چاندنی کس نے بھر دی؟
اے میری تتلی!

آؤ اور میرے ساتھ رہو!

اے میرے محبوب! میرے لئے تخت سلیمان پر ایک جھونپڑی

بنادو!

اور میں ایک سنہری چکور کی طرح ناچتی ہوئی وہاں پہنچ جاؤں گی!"

پٹھان قصہ خوانوں کی ایک پسندیدہ کہانی پٹھان کے تیزی سے

بدلتے ہوئے لیکن ہمیشہ عملی تصور زندگی کا آئینہ بھرپور اظہار ہے کہ اس

کا چربہ مکمل لیکن خلاصہ کی شکل میں درج ذیل ہے۔

" ایک دفعہ ایک بادشاہ کی ملکہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کے حسن

کا شاہکار اس کی آنکھیں تھیں جن میں وہ لطائف و عجائب منعکس ہو

جاتے تھے جو وہ دیکھتی یا سوچتی تھی۔ ایک دن بادشاہ نے جو اس پر دل و

جان سے فریفتہ تھا، اس کی آنکھوں میں اُداسی دیکھی۔ حکماء کے علاج کے

باوجود یہ ویرانی بڑھتی گئی۔ بادشاہ نے اپنے تمام مشیروں کو بلایا اور

مشورہ پوچھا۔ شعر گو عمر کا یہ مشورہ تھا کہ بادشاہ کو اس حسن کے لئے

شکر گزار ہونا چاہئیے جس سے وہ پہلے ہی ملکہ کی آنکھوں میں دیکھ کر محظوظ

ہوچکا تھا، اور اسے اس تکلیف کو قبول کر لینا چاہئیے لیکن اسے

آسان بنانے کے لئے اسے اپنے تمام خوابوں کا رنگ اور اپنے دل کی

ساری روشنی ملکہ کی آنکھوں میں انڈیل دینی چاہئیے۔ عمر کا یہ خیال تھا

کہ اس طرح وہ دوبارہ وہی منظر سے یاد کرسکے گا اور سن سکے گا جو

ملکہ کی آنکھوں سے برآمد ہوتے تھے۔

دانشمند خلیل نے کہا "بے ہودہ، خرافات، جھوٹ موٹ! میرے بادشاہ! عقلمند اور عملی بنو۔ دنیا چمکدار آنکھوں کی خوبصورت عورتوں سے بھری پڑی ہے میں آپ کے لئے وادیٔ شمیم سے ایک جھنڈ لے آؤں گا جو آپ کے محل کو موسم گرما کی رات میں ایک جگنو بنا دے گا۔"

غمزدہ بادشاہ غضبناک ہوگیا۔ اس نے خلیل کی داڑھی نوچی اور اسے نکال دیا۔

غیب دان رحمان بولا، "دریا پار کے پہاڑوں میں ایک آدمی رہتا ہے جسے دنیا ایک فقیر کہتی ہے لیکن اس کے دل میں کسی چیز کا ذخیرہ ہے جو ہر بیماری کا علاج ہے کیونکہ اس نے وقت اور موت کو فتح کر لیا ہے۔ میرے اچھے بادشاہ! جاؤ اور اسے تلاش کرلو اور اس سے وہ جادوئی پانی مانگو اور اس کا ایک ایک قطرہ ملکہ کی آنکھوں میں ڈالدو۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت، روشن اور خوابناک ہو جائیں گی۔"

بادشاہ خوش ہوا اور اپنے جان نثاروں کے ساتھ اس فقیر کی تلاش میں نکل پڑا۔

بالآخر اس نے اسے پا لیا اور اس سے پوچھا "تمہارے دل میں کیا ہے؟"

"محبت اور روشنی" فقیر نے ہنستے ہوئے کہا

"کیا تم مجھے ملکہ کے لئے ان کے دو قطرے دے سکتے ہو؟"

"ہاں بشرطیکہ تم ان کی قیمت ادا کر دو"

"بتاؤ" بادشاہ نے کہا۔

"ہنسی کے قطرہ کے لئے تمہاری سلطنت اور محبت کے قطرہ کے لئے تمہارا کبیرونانز" فیقر نے جواب دیا۔

"یہ بہت زیادہ ہے۔ سلطنت اور اس کا تزک و احتشام مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ چونکہ تم اپنے بادشاہ سے اتنے نامہربان ہو لہٰذا میں تمہیں اس خزانے کا نااہل سمجھتا ہوں اور اسے قانون اور لوگوں کے نام پہ ضبط کرتا ہوں"۔

بادشاہ نے فقیر کے بیڑیاں پہنائیں اور اسے اپنے ساتھ لا کر جیل میں ڈال دیا۔

اگلی صبح جب جیل کا دروازہ کھولا گیا تو اللہ تعالیٰ کی حکمت سے وہاں کچھ بھی نہ تھا سوائے چیتھڑوں، کھال اور ہڈیوں کے ایک ڈھیر کے۔ فقیر چلا گیا تھا اور محبت اور ہنسی بھی ساتھ لے گیا تھا۔ جیل کی دیوار پر اس نے ایک پیغام لکھ دیا تھا "بادشاہ سلامت! جو کچھ آپ کے قانون کے ماتحت ہے وہ میں اس قانون کے لئے چھوڑ کر جا رہا ہوں"۔

بادشاہ یہ دیکھ کر سخت طیش میں آیا کیونکہ اس نے اس سے پہلے کبھی شکست نہ کھائی تھی۔ وہ سب اپنے اہلِ دانش پر بھی برہم تھا اور اس نے ان کی داڑھیاں نچوا دیں۔ وہ ملکہ سے بھی سخت خفا تھا کیونکہ اسی کی وجہ سے اسے شکست ہوئی تھی اور اس نے کہا " لعنت بھیجو اس کی آنکھوں پر! پھر اس نے دانشمند خلیل کو بلایا اور اس کی معیت میں اپنے

عمدہ گھوڑے، موسیقار، بازا ور شکاری کتے لے کر وادیٔ شیمم گیا جہاں وہ اس وادی کی بہت سی دل افروز فتوحات میں اپنی اس شکست واحد کو بھول گیا۔

لیکن بے چاری ملکہ .....

وہ قریباً اندھی ہے۔''[1]

مندرجہ بالا سرسری جائزے سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک جاندار پشتو ادب کی ہے جو اپنی قدامت کے باوجود زوال پذیر نہیں ہُوا۔ شاید اس لئے کہ فارسی ادب بلکہ اردو ادب کے بھی برعکس اس کا ارتقاء بالوقفہ ہُوا ہے اور ہنوز تکمیل پذیر ہے۔ لہٰذا یہ کئی لحاظ سے پختونوں کے کردار کا نمائندہ اور ان کے معاشرے کو مضطرب کرنے والے مسائل کا مظہر ہے۔ پٹھانوں کا واحد اہم ثقافتی کارنامہ ادب کے میدان میں ہی ہے۔ اسلامی روایات کے مطابق تصویری فن قبائیلیوں میں شاذونادر ہی پایا جاتا ہے اور پٹھانوں کا دستی ہنر صرف اسلحہ کی ساخت پرداخت پر ہی صرف ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم بدھ گندھارا ثقافت کے آثار، جو سوات اور خیبر ایجنسی

---

[1] - کہانی کا زیادہ مفصل چربہ افغان حکومت خبرنامہ 'باختر' مورخہ ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ دیکھئے ڈار میسٹیٹر ایضاً ص ص ۱۱۰ تا ۱۴۵ محیط بر اسی قبیل کی کئی کہانیاں۔

کے بعض حصّوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں یا بت شکن قبائلیوں کے ہاتھوں بہت بے دردی سے تباہ ہوئے ہیں۔ فن موسیقی بھی زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے اور عام آلاتِ موسیقی ڈھول، بانسری اور سادہ قسموں کی بین ہیں لیکن نغمے سب پرُزور اور لہرانگیز ہیں۔

خٹک ناچ جو اپنے نام کے باوجود کئی قبائل میں مشترک ہے بہت مقبول ہے۔ ناچ کی کئی قسمیں ہیں لیکن سب کی سب انتہائی عسکریانہ اور سب میں کثیر التعداد شرکاء ہوتے ہیں جو صرف مرد ہوتے ہیں۔ اگرچہ خٹک ناچ اکثر و بیشتر پٹھان فوجیوں کا مظاہرہ یا تفریحی عمل ہوتا ہے پھر بھی یہ کبھی کبھار قبائلی دیہات میں بھی دیکھنے میں آتا ہے[1]۔ یوسفزئی اور آفریدی عموماً ناچ سے نفرت کرتے ہیں اور اسے بیہودہ اور نازیبا خیال کرتے ہیں۔

۲۔ قومیّت!

غالباً پٹھانوں کا سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ پٹھان قومیت کا ہے۔ کابل کی زیرِ سرپرستی چلنے والی تحریک "پختونستان" پچھلے دس سالوں میں اتنا زور پکڑ گئی ہے کہ اس کے وجود و عدم وجود کا مسئلہ

---

[1]۔ ا۔ آئیجن شٹیفنز کی "ہارنڈ مون" (لندن، چٹو اینڈ ونڈس، ۱۹۵۳ء) میں ایک خٹک ناچ کی دلآویز تصویر ہے، ص ص ۲۲۵ تا ۲۲۶

ایک علمی مسئلے سے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ کابلی تحریک نے اس مسئلے کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے جو پہلے ہی سادہ نہ تھا۔[x]

پٹھانوں میں جو قومی جذبہ پایا جاتا ہے وہ اس رجحان کا نتیجہ نہیں ہے، جس نے بیسویں صدی میں پورے ایشیاء میں ہل چل مچا دی تھی۔ یہ ایک مختلف اور قدیم تر چیز ہے اور کم از کم خوشحال خان خٹک سے شروع ہوتا ہے۔ پچھلے سالوں میں تحریک 'پختونستان' کے افغان علمبرداروں نے بالخصوص محمد غوری اور میر ویس جیسی تاریخی شخصیات کو پٹھان قوم پرست کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ پیر روشن کو بھی ایک ابتدائی قوم پرست بتایا گیا ہے لیکن وہ بس سیواجی سے زیادہ نہ تھا جو مغلوں کے خلاف لڑنے والا مرہٹہ ڈاکو تھا کیونکہ وہ اس کے دور میں امن دامان کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا باوا آدم بن گیا جس کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۴۷ء میں ایک آزاد ہندوستان میں کانگریس پارٹی نے حکومت سنبھال لی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خوشحال خان خٹک میں واقعی قومی جذبات تھے گو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ جذبات اس وقت ظہور پذیر ہوئے جب مغلوں کے ساتھ اس کے ذاتی اختلافات نمودار ہوئے اور جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان مالی فوائد سے محروم ہو گیا جو اسے ان سے ملتے رہتے تھے۔ پھر بھی خوشحال خان پہلا انسان تھا جس نے

---

[x] ۱- تحریک پختونستان پر آگے باب دوازدہم میں تبصرہ ہے۔

ایک باہم مربوط پٹھان قومیت کا اظہار کیا اور اس کی طویل زندگی کے آخری حصے میں اس کی ہر مغل چیز سے نفرت ایک فوری دشمن کے خلاف ایک قبائلی سردار کی رقابت سے آگے بڑھ گئی۔ خوشحال خان نے پٹھانوں کو مغلوں کے خلاف متحد کرنے کی جو کوششیں کیں اور اپنی تقدیر سازی کے سلسلے میں ان کی اہلیت پر جو اصرار کیا ایک ذاتی جنگِ اقتدار میں اتحادی جیتنے سے کہیں زیادہ تھا۔

لیکن خوشحال خان کی کوششیں قبائل کے باہمی عدم اعتماد کی نذر ہو گئیں جس سے اورنگزیب نے نہایت ہوشیاری سے فائدہ اٹھایا۔ خوشحال خان کے وقت سے کافر برطانوی عیسائیوں نیز سکھوں کے خلاف نفرت اور قومی امنگوں کی بجائے قبائلی رسم و رواج میں بیرونی مداخلت کی مزاحمت حکومت کے خلاف پٹھان بغاوت کے محرکات رہے ہیں۔ اس احساس نے پٹھانوں کو نہ تو برطانوی ہند میں اور نہ ہی اب تک پاکستان میں ضم ہونے دیا، لیکن یہ انہیں ایک علیحدہ قوم بنانے میں بھی ممد و معاون نہیں ہوا حالانکہ بہت سی افریقیائی مملکتوں کے مقابلے پر نسلی و ثقافتی لحاظ سے دس ملین ہم جنس افغان ایک زیادہ ٹھوس قومی اساس کے مالک ہیں۔

یہ واضح کرنا مشکل ہے کہ پٹھانوں میں قومیت کا ارتقاء زیادہ قطعی کیوں نہیں ہو سکا۔ اگر وہ واقعی ایک مملکت بنانا چاہتے تو اس کے سلسلے میں ان کے موجودہ علاقے کی سیاسی و اقتصادی غیر موزونیت حائل نہ

ہو سکتی تھی اور نہ ہی افغانستان یا پاکستان کے ساتھ ان کی تاریخی یا
مذہبی بندھنیں رکاوٹ بن سکتی تھیں ۔

اس میلان کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے جو بیسویں صدی
کی وسیع تر سیاسی رَو سے ہم آہنگ نہیں ہے ۔ غالباً پٹھانوں میں فقدان
قومیت کی اہم ترین وجہ ان کی بین القبائلی حسد و رقابت کی طویل
تاریخ ہے جو ایک ایسے اندازِ حیات میں ڈھل گئی ہے کہ حصول اتحاد
انتہائی مشکل ہو گیا ہے ۔ مزید برآں امکانی طور پر تمر خیز قومی تحریک
جو سترھویں صدی میں خوشحال خان کے گرد نمو پذیر ہو سکتی تھی اسے
اورنگ زیب نے اعلیٰ پالیسی کے تقاضوں کے تحت شعوری اور مؤثر
طور پر قریباً ختم کر دیا ۔

اس پر مستزاد یہ کہ پٹھان سرزمین اتنی الگ تھلگ ہے کہ اس
کے باشندے ان وسیع تر قومی میلانات سے نسبتاً معرّا رہے جنہوں نے
سولہویں اور سترھویں صدیوں میں دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا جو اب بیسویں
صدی میں پھر ہل چل مچا رہے ہیں ۔ مثبت طور پر یہ بھی حقیقت ہے
کہ پٹھان قبائلی ڈھانچہ اتنا مضبوط رہا ہے کہ پٹھان من حیث الفرد
اس کے اندر رہتے ہوئے اپنے مقاصد حاصل کر سکتا ہے اور کر رہا ہے ۔
لہٰذا وہ اسے بدلنے کے محرک سے محروم ہے ۔

اس طرح پٹھانوں کی حیثیت کئی لحاظ سے مغربی ایشیا کے
دوسرے بڑے اور زندہ قبائلی معاشرے یعنی کردوں سے مشابہ ہے ۔

دونوں کرد اور پٹھان جن کی سرزمینیں (برسبیل تذکرہ) کہیں نہیں ملتیں عربوں کے بعض حصوں کے مقابلے پر (جو آزاد مملکتیں بننے میں کامیاب ہو چکے ہیں) بہت سے نقطہ ہائے نظر سے "زیادہ تر قوم" ہیں۔

یہ چونکہ پٹھانوں میں قومیتی دھکیل کا فقدان ہے لہٰذا پاکستان کی قومی زندگی میں ان کے بالآخر انجذاب کے روشن امکانات ہیں گو اس کے لئے ایک لمبی مدت بھی درکار ہو گی اور ان میں قومی قیادت کی قابلیت کا بھرپور اعتراف بھی۔ ان میں سے بہت سے نسلی تصورات پر مبنی قومی نظریے سے اب بھی متاثر ہو جاتے ہیں بالخصوص جب بیرونی ذرائع اسے مسلسل اور چالبازی سے پیش کریں۔ اس طرح پختونستان کا موجودہ افغان تصور خواہ کتنا بھی مصنوعی ہو یہ اس وقت تک مکمل طور پر زائل نہیں ہو سکتا جب تک افغانستان ان تحریکات کو مستقلاً ترک نہیں کرتا جو اس نے پچھلے دس سال میں پیش کی ہیں۔ ایسا کرنے سے افغانستان کیوں گریز کرتا ہے۔ یہ مسئلہ آگے باب دوازدہم میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

---

(۹) باب پنجم

انگریزوں کی آمد

تعارف :

انگریز سرحد پر بہت عرصے سے فعال تھے پیشتر اس کے کہ برطانیہ
نے رسمی طور پر ۱۸۴۹ء میں سکھوں سے یہاں کی حاکمیت حاصل کی چند
جیسے ایلفنسٹن اور برنز محض یہاں سے گزرنے والے تھے جن کا زیادہ تعلق
سلطنت کے بڑے امور سے تھا۔ دوسرے جیسے ولیم مورکرافٹ جو ۱۸۲۴ء
میں وزیرستان میں نفوذ کر گیا اور رچارلس ہین جو اس پورے علاقے میں
تیسرے اور چوتھے عشرے میں پھرتا رہا۔ پٹھانوں میں بہت عرصہ سے
اور ان کی تاریخ اور اطوار کا مطالعہ کرتے رہے۔ پہلے پہل آنیوالوں
میں سے کوئی بھی سکھ نظم ونسق سے متاثر نہیں ہوا۔ میسن رنجیت سنگھ
کی فوج کی زیادتیوں کا شکوہ کرتا ہے اور سکھ رہنماؤں کی حماقت کی طرف
اشارہ کرتا ہے جب اس نے دو دفعہ پشاور کو فوجیں بھیجیں تاکہ وہ
یار محمد خان نے پشاور کے حاکم درانی سرداروں میں سے تھا، ایک پسندیدہ

گھوڑے کا تحفہ اینڈ مسکیں۔ ۱ٓ

برنز ۱۸۳۷ء میں پشاور سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ جنرل ایوی ٹیبل کی گورنری میں "سکھوں نے ہر چیز بدل دی ہے"۔ سارا قرب وجوار ایک وسیع کیمپ ہے اور ۳۰ تا ۴۰ ہزار آدمی میدانوں میں تعینات

۱ٓ۔ میسن ایضاً، I، ص ص ۱۴۴ تا ۱۴۶۔ میسن کا اصلی نام جیمز لیوس تھا اور وہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کا ایک بھگوڑا تھا۔ اس نے اپنا سفر آگرہ سے ۱۸۲۷ء میں شروع کیا اور امریکی مہم جو جوسیا ہرلان سے جا ملا۔ جو رنجیت سنگھ یا دوست محمد کا ملازم بننے کے لئے لاہور اور کابل جا رہا تھا۔ گرفتاری سے بچنے کے لئے لیوس نے اپنا نام میسن رکھ لیا اور اپنے لئے ایک مصنوعی امریکی پس منظر تراش لیا۔ یہ غلط تشخص جاری رہا اور اس کا سفرنامہ سر تھامس ہولڈیچ کی کتاب "دی گیٹس آف انڈیا" (لندن، میکملن، ۱۹۱۰ء) میں "امریکی ایکسپلوریشن" کے عنوان سے بیان کیا گیا۔ ہرلان نے بالآخر برطانوی حکام کو اس کی اصلیت کی اطلاع دے دی اور مفرور قید سے صرف اس شرط پہ بچا کہ وہ اس کے بدلے میں کمپنی کو افغانستان کی خفیہ معلومات بہم پہنچائے گا۔ وہ کئی سال تک یہ کرتا رہا۔ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں میسن کے دستاویزات کا ایک بڑا مجموعہ ہے۔ کمپنی کے اجلاس کی خفیہ کارروائیاں بھی وہیں محفوظ ہیں جن میں اسے بریت دی گئی تھی۔ میسن کے دستاویزات انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران سرحد پر ایک گراں بہا ذریعۂ معلومات ہیں۔

ہیں، مسلمانوں کے رسم ورواج نمائشی ہوگئے ہیں .... ناچ گانے
کی آوازیں ہر وقت سنائی دیتی ہیں اور پنجاب کی خوبصورت گڑیاں
ہندی، کشمیری، فارسی اور افغانی گیتوں سے سپاہیوں کے دل بہاتی
رہتی ہیں[4]،،۔

سکھوں کا نظم ونسق (اگر اسے ایسا کہا جا سکتا ہے) افراتفری
کا نظم ونسق تھا۔ لاہور اور پشاور میں مال کے بہی کھاتوں میں من مانی
رقموں کا اندراج کر دیا جاتا تھا اور جب کچھ سپاہی فارغ ہوتے تو
انہیں لگان وصول کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ سپاہی آتے تو گاؤں خالی
ہو جاتے اور منقولہ جائیداد مشمولہ بہ چوبی کھڑکیاں اور دروازوں کے کواڑ
بھی چھکڑوں پر پہاڑوں میں منتقل کر دیئے جاتے جہاں سکھوں کو
پہنچنے کا یارانہ تھا۔ اس کے جواب میں سکھ سپاہی دیہات کو لوٹتے اور
تباہ کرتے اور کھیتوں کو برباد کر دیتے۔ کبھی کبھار پٹھان مزاحمت کرتے
تھے۔ ایک نیم المیہ نیم طربیہ واقعہ اب بھی صوابی (مردان) کے اردگرد
ایسے سنایا جاتا ہے جیسے یہ چند سال کا واقعہ ہو۔ رنجیت سنگھ کے
تحت ایک سکھ فوج ایک ندی کے مشرقی کنارے پر خیمہ زن تھی اور
طغیانی کی وجہ سے اسے عبور کرنے میں پس وپیش کر رہی تھی۔ پٹھانوں
نے مغربی کنارے پر کوئی بیس گائیں اکٹھی کیں جو سکھوں کے لئے مقدس
ہیں اور انہیں ذبح کر کے غضبناک فوج کی آنکھوں کے سامنے کھایا۔

4۔ برنز۔ ایضاً، ص ۱۲۴

گئے۔ جیسا کہ توقع تھی رنجیت سنگھ اس توہین پر حرکت میں آیا۔ پہلی
پیادہ کمپنیاں جو پانی میں بھیجی گئیں ریلے میں بہہ گئیں اور ڈوب گئیں
اور پٹھان مزے لے لے کر اپنے کباب کھاتے رہے اور آوازے کستے رہے۔
یک لخت منتخب سواروں کا ایک دستہ فرانسیسی جرنیل ایلارڈ کے تحت
درختوں کے ایک جھنڈ کے عقب سے نمودار ہوا اور سیدھا ندی میں
کود پڑا۔ پیشتر اس کے کہ بوکھلائے ہوئے پٹھان اپنے اکل و شرب سے
فارغ ہوتے سوار ندی پار کر گئے اور ان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ سب
پٹھان نیزہ جو ایک دن کے تعاقب سے ان کے قابو آسکے پکڑ لیے
گئے اور نذرِ شمشیر ہوئے۔

سکھوں کی واحد دلچسپی سرحد میں صرف لگان تھی۔ جن علاقوں
پر سکھ اپنی گرفت قائم کر سکے تھے وہاں خوانین پر ۱۰۰ ہزار روپے سالانہ
ٹیکس لگایا گیا اور کاشتکاروں سے تین چوتھائی تک پیداوار بٹور
لی جاتی تھی۔ قطعات زمین بلا تمیز پنجاب کے ہندو ساہوکاروں کو دیئے
گئے اور ان میں سے بعض کو یہاں تک اجازت دی گئی کہ وہ اپنا خراج
روپے کی بجائے جزواً پٹھان سروں کی صورت میں ادا کر سکتے تھے[4]۔ اس

---

[4] - جیمز، ایضاً، ص ۵۴، ایچ۔ سی۔ لمسڈن "رپورٹ آن دی یوسفزئی ڈسٹرکٹ" (۱۸۵۲ء)
سیکشنز فرام دی پبلک کارسپانڈنس آف دی ایڈمنسٹریشن فار دی افیئرز آف دی
پنجاب، II، ص ۳۶۸ ۔

مسلسل جبر و ستم کی وجہ سے باہمت لوگوں نے اپنی زمینیں ہی ترک کر دیں
اور مستقلاً پہاڑیوں میں چلے گئے۔

یہ تھی وہ صورت حال جو اولین برطانوی ناظمین نے ۱۸۴۷ء اور
۱۸۴۸ء میں سرحد میں پائی۔ یہ لوگ برطانوی حکومت یا ایسٹ انڈیا
کمپنی کے براہ راست نمائندے نہ تھے۔ ان میں سے بعض لاہور دربار سے
منسلک کئے گئے تھے تاکہ سکھ سلطنت کو سہارا دیا جا سکے جو رنجیت سنگھ
کی موت کے بعد رو بہ زوال تھی۔

وہ اپنے عارضی آقاؤں کا طرزِ حکومت پسند نہ کرتے تھے لیکن وہ
شروع میں تعمیل احکام پر رضا مند تھے۔ ہربرٹ ایڈورڈز نامی ۱۸۴۷ء
میں بنوں پر محصول اندوزی کے لئے ایک سکھ چھاپے کا آنکھوں دیکھا
بیان کر گئے ہیں۔ سکھ دیوان، دینا ناتھ نے نوجوان برطانوی افسر کو بتایا
کہ بنوں کے ارد گرد کے پٹھانوں کے "آزادی کے متعلق بالخصوص وحشیانہ
خیالات" کی وجہ سے کئی سال سے ایک رہائش پذیر سکھ گورنر کی برکات
سے یہاں کے لوگوں کے لئے مستفید ہونا ممکن نہ رہا تھا۔ نتیجتہً ۶۵ ہزار
روپے کا سالانہ مالیہ بیشتر لوگوں کے ذمہ بقایا تھا۔ ایڈورڈز کو سکھ
سپاہیوں کے ساتھ جانا تھا، زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنے میں ان کی
مدد کرتا تھا۔ ممکنہ حد تک پٹھانوں کو موت کے گھاٹ اتارتا تھا اور
اپنی نگرانی میں مالیہ سکھ خزانے میں جمع کرواتا تھا۔

ایڈورڈز حسب الحکم روانہ ہوا لیکن اس کے اندر سلطنت کی

چنگاری روشن تھی۔ اس نے پیش قدمی کرتے ہوئے سپاہیوں کو اہلِ دیہات کو تنگ کرنے کی اجازت نہیں دی، اور جب وہ بنوں میں داخل اور گامزن ہوئے تو انہیں سخت ضبط میں رکھا۔ یہاں اس نے سفید ریشوں کا جرگہ بلایا اور اپنا مقصد بیان کیا۔

"آپ لوگوں کا سالانہ مالیہ ۶۵ ہزار روپے ہے اور چونکہ آپ لوگ اسے ادا نہیں کرتے لہٰذا سکھ آتے ہیں اور آپ کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ آپ کی فصلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ گھر جلا دیتے ہیں۔ ریوڑ اور گلے لوٹ لیتے ہیں اور بیوی بچوں کو بطور غلام بیچ دیتے ہیں۔ یہ خوبصورت وادی جو قدرت نے آپ کو عطا کی ہے ایک عذاب میں بدل گئی ہے۔ کس لئے؟ آپ کہتے ہیں کہ آپ کی آزادی کے لئے میں آپ کو وہ آزادی دیتا ہوں .... صرف برضا و رغبت اپنے کسی بھی پسندیدہ خزانے میں ۴۰ ہزار روپے سالانہ جمع کرا دو اور کوئی فوج آپ کی وادی میں داخل نہ ہوگی اور کوئی سکھ آپ کی حدود میں اپنا چہرہ نہ دکھائے گا اور آپ اپنے علاقے میں اپنے ہی قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے میں آزاد ہوں گے۔"

جرگے نے اس انقلابی پیش کش پر غور کیا اور اسے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ وہ آزاد اور زیرِ عتاب رہنا پسند کرتے تھے۔ ایڈورڈز نے جواباً سخت تنبیہہ کی۔

"میں آپ کی وادی میں پھرا ہوں اور اس کی زرخیزی کو جانتا

ہوں۔ میں نے آپ کا خفیہ راستہ دیکھ لیا ہے میں نے آپ کے۔۔ ہر قلعے گن لئے ہیں۔ میں نے آپ کے قبائل کا اندازہ لگایا لیا ہے۔ میں ایک نئے راستے سے ایک اور فوج لاؤں گا۔ آپ کے قلعے مسمار کردوں گا۔ آپ کے قبائل سے ہتھیار چھین لوں گا اور علاقے پر قبضہ کر لوں گا۔ آپ کو بہترین قوانین ملیں گے جو روشن ضمیر لوگ آپ کے لئے وضع کر سکتے ہیں لیکن ان قوانین کا نفاذ ایک سکھ گورنر کرے گا۔ وہ آپ پر ظلم نہ کر سکے گا کیونکہ انگریز اس کے اوپر ہوں گے۔ آپ پر منصفانہ حکومت ہو گی لیکن آپ آزاد نہ رہ سکیں گے[1]۔"

ایڈورڈز نے ۱۸۴۸ء میں اپنا وعدہ پورا کر دیا ۱۸۴۹ء میں سکھ گورنر غائب ہو گیا جب ۳۰ مارچ کو انگریزوں نے لاہور کے بڑے دربار میں حاکمیت اختیار کر لی اور پنجاب کی چند روزہ سکھ سلطنت کے دن پورے ہو گئے۔

جب ایڈورڈز بنوں میں سلطنت کا راستہ ہموار کر رہا تھا دوسرے بھی جیسے جیمز پشاور میں، لمسڈن یوسفزئیوں میں، ایبٹ ہزارہ میں اور ٹیلر ڈیرہ جات میں نئے شاہی قانون کے پیشرو بنے ہوئے تھے۔ انتقال حاکمیت کے بعد یہی لوگ نو ساختہ پنجاب کمشن کی زیر ہدایت کام کرنے

۱۔ ہربرٹ ای ایڈورڈز "اے ییر اون دی پنجاب فرنٹیر" دو جلدیں (لندن آر۔ بینٹلی، ۱۸۵۱ء) ص ص ۲۷، ۲ تا ۲۸۔

لگے۔ ان کے سامنے جو مسائل تھے وہ بہت گھمبیر تھے۔

سندھ پار علاقوں کی حدود بھی غیر واضح تھیں۔ مشرق میں سندھ انہیں پنجاب سے علیحدہ کرتا تھا۔ شمال میں وہ غیر واضح طور پر ہمالیہ میں ضم ہو جاتے تھے۔ مغرب میں کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ سکھ صوبہ کہاں ختم ہوتا تھا، اور افغانستان کہاں شروع ہوتا تھا۔ سرحد جس کا انگریزوں[1] نے تعین کیا وہ یہی اسی کے مطابق تھی جو آج کل زیر انتظام ضلعوں اور قبائلی علاقوں کے درمیان موجود ہے[1]۔ انگریزوں نے واضح کر دیا کہ وہ اس خطے سے پرے کوئی اختیار یا ذمہ داری نہ چاہتے تھے اور پہاڑی قبائل کو اختیار تھا کہ وہ آزاد رہیں یا اگر چاہیں تو کابل کے اطاعت گزار بن جائیں[2]۔

---

[1]۔ ٹمپل نے اس وقت اسے یوں بیان کیا "سرحد کی لکیر کا غاق گھاٹی (ہزارہ کے ماتحت) کی چوٹی سے شروع ہوتی ہے جو چلاس کے قریب ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے علاقہ کشمیر کے شمال مغرب کو تے پر اور پھر ہزارہ کی شمال مغربی سرحد کے گرد گھومتی ہے۔ مشرق کی طرف سندھ تا تربیلا، پھر دریا عبور کر کے یہ وادیٔ پشاور کی شمالی اور شمال مغربی سرحد کے گرد گھومتی ہے اور درہ خیبر تک جاتی ہے۔ پھر آفریدی پہاڑیوں کے گرد سے کوہاٹ جاتی ہے پھر ضلع کوہاٹ کی مغربی سرحد کے گرد میرانزئی وادی کے ساتھ ساتھ جا کر سلطنت کابل کی حدود کو چھوتی ہے پھر وزیر پہاڑیوں کے گرد ہو کر بنوں اور کوہ سلیمان کے سر پر آتی ہے اور پھر آخر کار دامن سلیمان سے سندھ اور حکومت قلات کی حدود تک چلی جاتی ہے" دیکھئے ٹمپل، ایضاً ص ا

[2]۔ ایضاً ص ۵۷ ۔

سرحد پار قبائل سے تعلقات!

انگریزوں کا اوّلین اور فوری ترین مسئلہ اپنے نئے مقبوضات کے تحت تحفظ کا تھا۔ پہاڑی قبائل حسبِ معمول ۱۸۴۹ء میں کھسا رہے تھے۔ ان کی بے چینی میں ان کثیر التعداد پٹھانوں کی وجہ سے اضافہ ہو گیا تھا جو سکھ جور و جبر سے بچنے کے لئے میدانوں سے پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ انگریز چند سالوں سے سکھوں کے اتحادی رہے تھے اور دس سال سے بھی کم عرصہ پہلے انہوں نے سکھوں کے ساتھ مل کر امیر افغانستان سے جنگ کی تھی جس سے اکثر پٹھان قدرے اپنائیت محسوس کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سرحد کے نئے آقاؤں سے نفرت خود سکھوں کے مقابلے پر کچھ ہی کم تھی۔ مزید برآں میدانوں میں تبدیلیٔ حکومت کو بھُو کے اہل کوہ ہمیشہ لوٹ مار کا ایک نادر موقع سمجھتے تھے۔ ان کے سمندِ شوق کو کابل نے بھی کسی حد تک تازیانہ لگا دیا جو اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لینے کی امید رکھتا تھا جنہیں فتح کرنے والی سکھ سلطنت اب ملیا میٹ ہو چکی تھی[1]۔

---

[1]- افغان واقعی حملہ آور ہوئے اور بنّوں اور پشاور پر چند روزہ قبضہ کر لیا جب انگریز اور سکھ ۱۸۴۹ء کے شروع میں پنجاب میں الجھے ہوئے تھے لیکن گجرات میں سکھوں پر انگریزی فتح کی جونہی خبر پہنچی وہ رفو چکّر ہو گئے۔

کوہ سیاہ کے حسن زئی "نئی حکومت سے فوراً ہی ٹکرا گئے" جب انگریزوں نے پہلے ان پر ٹیکس لگانے اور پھر پنجاب سے ان کی روایتی تجارت نمک روکنے کی کوشش کی۔ سید احمد کے پیروؤں نے قبائل کی اشتعال انگیزی میں اضافہ کر دیا تاکہ وہ "نئے کفار" کے خلاف بغاوت کر دیں اور بالائی سندھ کے مختلف مقامات پر انگریزوں کے قائم کردہ ناکوں پر وقتاً فوقتاً چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ ۱۸۵۴ء میں ان لوگوں کی مفسدانہ کارروائیاں ٹھگوں کے ایک گروہ کی آمد کی وجہ سے اور بھی بڑھ گئیں جو پشاور کے قریب سڑکوں پر کام کرتے ہوئے برطانوی حراست سے بھاگ آئے تھے۔

سوات کا ہمعصر بادشاہ برطانوی علاقے کے قبائل کو اپنی اطاعت کی دعوت دے رہا تھا اور میدانِ پشاور میں چھاپہ مار پارٹیاں بھیج رہا تھا۔ بہت سے مہمند جو برطانوی علاقے کے اندر رہتے تھے خان لالپورہ کے توسط سے امیر کابل سے کم از کم رسمی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ وہ کم لیٹرے قبائل پر چھاپے مارتے تھے اور تعاقب کیا جاتا تو افغان شہریت کا سہارا لے لیتے۔ درہ خیبر کے آفریدی جو بقول ٹیپل "دغاباز قبائل میں سے دغاباز ترین"[1] تھے خیبر پر اپنی حاکمیت پر مُصر تھے اور اسے اپنی مرضی سے بند کر دیتے تھے۔

---

[1] ۔ ٹیپل، ایضاً، ص ۱۷۔

وادیٔ کرم کے بالائی سرے کے نوری میدان بنوں پہ موسمی چھاپے مارتے تھے اور وادی کا یہ سرا ہنوز امیر کابل کے ایک بیٹے کی جاگیر کا حصہ تھا۔ کابل خیل وزیر اور محسود اپنا دیرینہ جھگڑا قائم رکھے ہوئے تھے اور ارد گرد کے علاقے میں امن و خوشحالی کو مخدوش کرتے رہتے تھے۔ ٹوچی وادی کے دوَر برطانوی حکام سے ربط و ضبط سے منکر تھے اور کہتے تھے کہ وہ امیر کابل کی رعایا ہیں*۔ نئے علاقے کے انتہائی جنوبی سرے پر بلوچی قبائل جن میں سے بہت سے سال کا کچھ حصہ برطانوی علاقے میں گزارتے تھے۔ نئی حکومت کے اختیار کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھے۔ گومل جو اس وقت قریباً اتنا ہی اہم راستہ تھا جتنا خیبر، اکثر بند کر دیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے نظم و نسق کا مسئلہ قوت اور دوربینی سے حل کیا۔ اکثر سکھ دستے لاہور چلے گئے تھے تاکہ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں شریک ہو سکیں جو ۱۸۴۹ء کے اوائل میں شروع ہو گئی تھی اور بالآخر الحاق پنجاب پر منتج ہوئی، جو رہ گئے تھے انگریزوں نے قبضہ کرتے ہی انہیں واپس بلا لیا۔ الحاق کے بعد تھوڑے عرصہ تک پشاور کوہاٹ اور ہزارہ کے اضلاع لاہور میں ہنری لارنس کی زیرِ سرکردگی پنجاب کے لئے قائم شدہ بورڈ آف

---

* ۱۸۵۵ء کے اینگلو افغان معاہدے کے مذاکرات میں انگریز مان گئے تھے کہ امیر دَوروں کو لے سکتا تھا اگر وہ چاہے تو۔

ایڈمنسٹریشن کے براہ راست انتظام میں رکھے گئے لیکن ایک سال کے اندر اندر یہ تینوں ملا کر ایک کمشنر کے تحت باقاعدہ ڈویژن بنا دیئے گئے حتیٰ کہ ۱۸۶۱ء میں ایک علیحدہ کمشنر کے تحت ڈیرہ جات ڈویژن بنا دیئے گئے۔ ۱۸۵۳ء میں پنجاب بورڈ ختم کر دیا گیا اور جان لارنس پنجاب کا چیف کمشنر بنا۔ مؤسس انگریز جلد ہی نئی حیثیتوں کے حصے بن گئے۔ ٹیلر ڈیرہ اسماعیل خان کا ڈپٹی کمشنر بنا۔ ایڈورڈز نے پشاور میں خدمات انجام دیں، اور پھر پہلے کمشنر، میکیسن کا جانشین بنا جب اسے ۱۸۵۳ء میں ایک قبائلی نے قتل کر دیا۔ ایبٹ ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر ہوا۔ بہترین اور تجربہ کار ترین ناظمین جو ہندوستان کے دیگر حصوں سے فارغ کئے جا سکتے تھے اور بہت سے فوجی افسر جو اپنی اپنی رجمنٹوں سے سول فرائض کے لئے منتقل کئے گئے سرحد بھیج دیئے گئے۔ لاہور نے اختیار دے دیا کہ رواں قبائلی وظائف جاری رکھے جا سکتے تھے اور حسبِ ضرورت نئے وظائف جاری کئے جا سکتے تھے۔

ایک خاص فوجی تنظیم جلدی جلدی قائم کی گئی جو ان دنوں کے لحاظ سے کافی ہیبت آفریں تھی۔ اس میں وہ فوجیں شامل تھیں جو انگریزوں نے سکھ سلطنت کو سہارا دینے کے لئے قائم کی تھیں۔ اسے پہلے پنجاب بے قاعدہ فوج کا نام دیا گیا جسے جلد ہی پنجاب فرنٹیئر فورس سے بدل دیا گیا۔ برطانوی ہندوستان کے عسکری دستاویزات میں ان دونوں کے اراکین کو "پیفر" کہا جاتا ہے۔) فرنٹیئر فورس مندرجہ ذیل یہ

مشتمل تھی۔ پانچ پیادہ رجمنٹیں، ہلکے پھلکے فیلڈ توپخانے کی تین بیٹریاں دوگیریژن توپخانے کی بیٹریاں، سفر مینا کی دو کمپنیاں، سندھ شتر کور، پانچ سوار رجمنٹیں اور مشہور و معروف کور آف گائیڈز (منتخب گھوڑ سوار) قریباً سب کے سب سپاہی ہندوستانی تھے اور ان ابتدائی ایام میں بھی بہت سے پٹھان تھے۔

اس فوج کو فوراً ہی تکلیف دہ قبائل پر قابو پانے کی کوشش میں استعمال کیا گیا۔ الحاق کے بعد ایک سال سے بھی کم عرصے کے اندر تین ہزار سے زائد آدمیوں کی ایک مہم درہ کوہاٹ کے آفریدیوں کے خلاف بھیجی گئی تاکہ انہیں پشاور اور کوہاٹ کے درمیان سفر اور تجارت میں مخل ہونے کی سزا دی جا سکے۔ اگلے چھ سالوں میں مزید سولہ مہمات روانہ کی گئیں۔ ان کے اہداف تھے آفریدی، یوسفزئی، میرانزئی، مہمند، اتمان خیل وزیر، شیرانی، توڑی اور سید احمد کے پیرو۔[1] ان میں سے کوئی بھی فوجی نقل و حرکت کامیاب قرار نہیں دی جا سکتی۔

سرحد کے محافظوں نے جلد ہی محسوس کر لیا جیسا کہ مغل اورنگزیب نے تین صدیاں پہلے کیا تھا کہ صرف فوجی طاقت ہی قابو کا موثر ذریعہ نہ تھی۔ سپاہی زیر انتظام ضلعوں کو تو بچا سکتے تھے لیکن جب وہ

---

[1] دی امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، ۲۴ جلدیں (آکسفورڈ کلیرنڈن پریس، ۱۹۰۸ء) نمبر ۴، ۲۰۸ تا ۲۱۰

پہاڑیوں میں داخل ہوجاتے تھے تو چھپ کر اور یک نخت حملہ کرنے والے زیادہ نقصان دہ ہوتے تھے۔ رسد پر اخراجات بے انتہا اور قبائلی گرفت میں تہ آتے تھے۔ اکثر و بیشتر کئی ہزار کا دستہ صرف ایک خالی قلعہ یا گاؤں کو تباہ کر سکتا تھا۔ انگریزوں نے بہت تھوڑے وقت میں ہی قابو پانے کے لئے ایک چالنامہ تیار کر لیا۔ درّہ کوہاٹ کے آفریدیوں کی مثال موجود ہے۔ الحاق کے بعد ایک ماہ کے اندر ہی آدم خیل سے جو درّے کے اہم حصّے کے اندر اور ارد گرد رہتے تھے ۵۰۰۰ روپے سالانہ وظیفہ کا وعدہ کیا گیا تاکہ وہ درّے سے گزرنے والے مسافروں کی حفاظت کریں یعنی ان پر حملہ نہ کریں۔ لیکن ابھی پہلے سال کی ادائیگی بہت دور تھی کہ آدم خیل نے درّہ بند کر دیا اور کھلم کھلا بغاوت پر اتر آئے۔ ہندوستان میں برطانوی افواج کا سپہ سالار سر چارلس نیپیر خود سرحد میں آیا تاکہ آدم خیل کے خلاف مہم کی قیادت کر سکے، ۳۲۰۰ سپاہیوں نے درّے کو عارضی طور پر کھول دیا۔ جونہی وہ واپس ہوئے آفریدیوں نے کاروانوں پر حملے دوبارہ شروع کر دیئے۔

اس دفعہ ایک اورکزئی ملک کو جس کا طائفہ قریب ہی رہتا تھا درّے کو محفوظ کرنے کے لئے ۸ ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ دیا گیا نتیجتاً آدم خیل اور اورکزئی کے درمیان چپقلش شروع ہو گئی اور آفریدی اس میں اتنے الجھے کہ اس درّے کی آمد و رفت میں کوئی مداخلت نہ کر سکے، جسے وہ اپنی آماجگاہ سمجھتے تھے، لیکن یہ کشمکش اس حد تک بڑھی کہ پورے

علاقے میں بھی ہر قسم کی نقل و حرکت معطل کرنا پڑی - اب اس مرحلے پر درے کی حفاظت کے لئے تیسرا وظیفہ بنگش کو دیا گیا۔ اس سے بین القبائلی کشمکش میں جو توسیع ہوئی اور جنگ و جدل درے سے کافی دور ہوگئی بالآخر آدم خیل نے یکم دسمبر ۱۸۵۳ء کو صلح کرلی۔ پندرہ دفعات کے اس معاہدہ میں انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ لوٹی ہوئی یا لوٹی جانیوالی اشیاء کو واپس کر دیں گے یا ان کی قیمت ادا کریں گے۔ برطانوی علاقے کے تمام مجرم مفروروں کو اپنے علاقے سے نکال دیں گے۔ برطانوی علاقے میں قتل کے مرتکب قبائلی کو حوالے کر دیں گے۔ قبیلے کا کوئی فرد برطانوی علاقہ میں جرم کا ارتکاب نہ کرے گا۔ مسافروں کی حفاظت کے لئے درے میں قائم کردہ چوکیوں کا انتظام سنبھالیں گے اور برطانوی علاقے میں رہنے کے لئے یرغمال دیں گے۔ اس کے بدلے انہیں ۵ ہزار روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔[۲]

۱- ٹیلر، ایضاً، ص ۲۰

۲- معاہدے کا متن جو اس قبیلے کا پہلا تھا حکومت ہند کے "سنٹرل ایشیا" پارٹ I ۵ تا ۶ پر موجود ہے۔ بین القبائلی کشمکش جو انگریزوں نے ۱۸۵۰ء میں مول لی ایک بڑے جرگے کے ذریعے ۱۸۵۶ء میں تصفیہ پذیر ہو سکی جس نے تمام مقتولین و مجروحین کے معاوضہ کا فیصلہ کیا اور مزید طے کیا کہ ہر فریق درے کی سڑک کے ساتھ ساتھ اپنی چوکیاں بنائے گا بشرطیکہ ہر چوکی "سڑک اور دیگر چوکیوں سے بندوق کا فاصلے پر ہو"۔ اس معاہدے کا متن پی۔ایل۔ایچ۔ کا ڈگتری کی "رپورٹ آن دی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ قابلِ ذکر ہے کہ انگریز اب تک قبائل کو قابو کرنے کے لیے مغلوں کے نقش قدم پر چل رہے تھے یعنی (۱) وظائف (۲) ایک قبیلے کی دوسرے کے خلاف برانگیخت اور (۳) آئندہ اچھے رویے کی یقین دہانی کے طور پر یرغمال۔ یہ تینوں طریقے مغلوں ہی کے تھے۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد درہ کوہاٹ کے آفریدیوں کے منتظم کرنل کوک نامی نے قابو پانے کے چالنامہ میں ایک اور تصور پیش کیا۔ اس نے فتنہ کی صورت میں مندرجہ ذیل طریقہ وضع کیا:

درے کو فوراً بند کر دینا، اضلاع پشاور، کوہاٹ میں موجود تمام آفریدیوں کو پکڑ لینا۔ مردوں کو جیل میں ڈال دینا، ان کے مویشی بیچ ڈالنا، آفریدیوں کے تمام درہ الاؤنس بند کر دینا اور جب معاملے کا تصفیہ ہو جائے تو ان کے نقصانات کا ازالہ کر دینا۔ ان کے ضبط شدہ الاؤنسوں میں سے نہیں بلکہ ان الاؤنسوں میں سے جو تصفیہ کے بعد شروع ہوں گے۔ [1]

کرنل کوک کا وضع کردہ قبائل کی اجتماعی ذمہ داری کا یہ اصول

(بقیہ حاشیہ)

کوہاٹ پاس آفریدیز" میں مل سکتا ہے۔ سلیکشنز فرام دی ریکارڈز آف دی گورنمنٹ آف دی پنجاب اینڈ اٹس ڈی پنڈنسیز نیا سلسلہ ۱۸۸۳ء ص ۲۵ رپورٹ ۱۸۶۷ء میں لکھی گئی تھی۔

[1] - گورنمنٹ آف انڈیا، سنٹرل ایشیا رپارٹ I ، II ص ۶

۱۹۴۷ء تک برطانوی قبائلی پالیسی کا بنیادی اصول بنا رہا۔ یہ سیدھا سادہ اور قابلِ تعریف حد تک عملی تھا۔ مختلف پٹھان قبیلے بلا استثنا ایک اکائی کی حیثیت سے سوچتے اور محسوس کرتے تھے گو اس کے افراد کبھی کبھار من مانی کر لیتے تھے۔ اگر پورا گروہ اپنے بعض افراد کے افعال کا ذمہ دار بنا دیا جائے تو یہ ایسے افعال پر قابو پانے کی طرف زیادہ مائل ہوگا اور بصورتِ دیگر اس کے خلاف جوابی کارروائی آسان ہوگی چونکہ اکثر پہاڑی قبائل اپنی ضروریات زندگی کے لئے زیرِ انتظام علاقے پر منحصر تھے اور اس کے بہت سے افراد کسی دیئے ہوئے وقت پر وہیں ہوتے تھے لہٰذا پکڑ دھکڑ اور ناکہ بندی کے طریقے واقعی بہت مؤثر تھے۔

ایڈورڈز اکتوبر ۱۸۵۴ء میں پشاور ڈویژن کا کمشنر بنا تو اس نے جلد ہی ناکہ بندی کے طریقے کو انتہائی مؤثر بنا دیا۔ اس نے ارابیب[1] اور مہذب، پٹھان مخبروں کو برطرف کر دیا جنہیں اس کے پیشرو نے رکھا ہوا تھا اور وہ پہاڑی ملوک سے براہ راست معاملات کرنے لگا جب کوئی قبیلہ نئی حکومت کے تصورِ حق و انصاف کو للکارتا تھا تو ایڈورڈز پورے گروہ کو پشاور منڈی سے بند کر دیتا تھا اور یوں پوری برادری

---

[1] - پشاور وادی کے ارباب خاندان مغل دور کے ہیں جو قبائل کے ساتھ تعلقات میں دلال ہوتے تھے ان میں سے اکثر وادی کے متمول اور تعلیم یافتہ زمین دار ہیں بڑے بڑے ارابیب پشاور کے قریبی دیہات لانڈی اور تہکال بالا سے تعلق رکھتے ہیں۔

کو جرم میں شرکت یا اس کے انسداد اور سزا کے سلسلے میں تغافل کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا۔[1] کسی قبیلے کو پشاور منڈی سے روکنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے اپنی ضروریات زیادہ فاصلے سے درآمد کرنا پڑتی تھیں یا اپنے ہمسایوں سے حاصل کرنا ہوتی تھیں۔ جو اس خدمت کا بھاری جرمانہ وصول کرتے تھے۔

۱۸۵۳ء کے آخر میں کچھ کوکی خیل آفریدیوں نے خیبر میں ایک ایلچی کو روک لیا۔ جو کابل میں انگریزوں کے ایک مقامی نمائندہ کے لئے ڈاک کو ہین کی ایک بوتل لئے جا رہا تھا۔[2] ایڈورڈز نے فوراً حکم دیا کہ برطانوی علاقے میں موجود ہر کوکی خیل کو قید کر دیا جائے۔ عمل کو تیز کرنے کے لئے اس نے ہر پکڑے جانے والے قبائلی کے لئے ۲۰ روپے اور ملک کے لئے پچاس روپے انعام مقرر کیا۔ دیگر قبائل کے لوگوں پر اس کا اتنا اچھا اثر ہوا کہ اعلان کی شام سے پہلے پہلے ۲۰۰ روپے کے کوکی خیل پشاور جیل میں پہنچ چکے تھے۔ اگلی شام کوکی خیل معتبرین آئے اور کو ہین واپس کر گئے۔ ایڈورڈز نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے محدود بجٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے ۲۰۰ روپے وصول کر لئے[3] اور پھر قیدی چھوڑ دیے

۱۔ ہربرٹ بی ایڈورڈز "میموریلز آف دی لائف اینڈ لیٹرز آف میجر جنرل سر ہربرٹ بی ایڈورڈز" مؤلفہ ایماسڈنی ایڈورڈز (لندن کیگن پال ٹرینچ ۱۸۸۶ء)۔ دو جلدیں I، ص ۲۳۰

۲۔ لیبریا ایک قبائلی دوا تھی اور کو ہین جو انگریزوں نے متعارف کروائی جلد ہی لوٹ مار کے لئے اتنی مقبول ہو گئی جیسے رائفل اور کارتوس۔

۳۔ ایضاً، I ص ۲۲۲ تا ۲۲۳

ناکہ بندی کا طریقہ بعد میں زیادہ پیچیدہ اور غیر شخصی تیز برطانوی

نوکر شاہی بڑھنے کی وجہ سے کم مؤثر ہو گیا لیکن ایڈورڈز اپنے دور میں

اس کا ماہر تھا۔ وہ قبائلیوں کی عزت کرتا تھا اور قبائلی اس کی عزت

کرتے تھے۔ شاید اس عزت کی جزوی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ کبھی کبھار

مقامی رسم ورواج کی خاطر انصاف کے اپنے تصور کو خیر باد کہہ دیتا

تھا۔ بے حد سرکش زکا خیل آفریدیوں کے ساتھ ۲۴ راگست ۱۸۵۷ء

کا معاہدہ اس کی زندہ مثال ہے۔ دستاویز کی دفعہ پانچ یہ تھی "برطانوی

علاقے کے کسی باشندے کی بیوی یا بیٹی کو اغواء کرنے کے جرم میں قبیلے

کے کسی فرد پر جرمانہ عائد نہ ہوگا لیکن اگر وہ منقولہ اشیاء بھی لے گیا

ہو تو وہ واپس کی جائیں گی۔ اگر فریق اشیاء گیری سے انکار کریں تو

انہیں قرآن مجید پر قسم اٹھانا ہوگی" [۱۷]

سپاہیوں کی بغاوت ۱۸

ایڈورڈز نے زکا خیل کو اتنی رعایت دینے پر کیسے رضامندی

دے دی؟ اس کا سراغ دستاویز کی تاریخ سے مل سکتا ہے۔ اس

معاہدے پر ۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوتِ سپاہ کے دوران دستخط کئے گئے

تھے جب دلّی ابھی تک باغیوں کے قبضہ میں تھا۔

---

[۱۷] - اصلی انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔

۱۸۵۷ء کے موسم بہار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کی پچپنویں اور چونسٹھویں بنگال نیٹو انفنٹری بھی قلیل التعداد پنجاب فرنٹیئر فورس کے علاوہ سرحد میں آ گئی تھیں۔ مئی میں میرٹھ میں بغاوت کی پشاور میں پہلی اطلاع ملتے ہی برطانوی افسروں نے سپاہیوں کی ڈاک کو سنسر کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں پتہ چلا کہ بہت سے سپاہی سوار رسالہ میں سید احمد کے پیروؤں سے خط و کتابت کر رہے تھے جو اپنی جگہ بنگال پریذیڈنسی کے باغیوں سے اپنا رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے۔

کور آف گائیڈز کو فوراً ہی جنوب کی طرف روانہ کیا گیا تاکہ باقی ماندہ برطانوی افواج سے مل سکے۔ بنگال نیٹو انفنٹری کو قبائلی علاقے کے سرے پر بھیج دیا گیا گویا کہ اس طرف سے حملہ متوقع تھا۔ ایڈورڈز اور نکلسن (جو بعد میں تسخیر دہلی میں مارا گیا) دونوں نے پٹھانوں سے نئے لیوی بھرتی کرنے کی کوشش کی تاکہ جنوب کو بھیجے گئے سپاہیوں کی جگہ لے سکیں۔ قبائلی بھرتی پر رضامند تھے اور حکومت کلکتہ مزید مقامی فوجی بھرتی کرنے پر خوفزدہ تھی لہٰذا یہ کوشش ترک کر دی گئی۔

تناؤ کے چند ہفتوں کے بعد نوشہرہ اور مردان کے متعینہ دستے باغی ہو گئے لیکن ان کا رویہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مقابلے پر مودبانہ تھا۔ انہوں نے صرف احکام ماننے سے انکار کیا تھا۔ نوشہرہ گیریژن کو آمادہ کر کے پشاور لایا گیا اور وہاں بلا تشدد ان سے ہتھیار

لے لئے گئے۔ مردان گیریژن (۵۵ ویں بی۔ این۔ آئی) سے ان کے
کرنل کی مرضی کے خلاف ہتھیار لے لئے گئے۔ اس پر وہ بھاگ گئے اور
برطانوی کرنل نے مایوس ہو کر اپنے سر میں گولی مار لی۔ چند ہفتے بعد دو
مفرور سپاہی ضلع ہزارہ میں پکڑے گئے اور ۱۲ جون کو انہیں ایک بڑے
مجمع کے سامنے توپ زد کر دیا گیا جسے بلایا ہی اس لئے گیا تھا کہ وہ
بغاوت کا حشر دیکھ سکے۔ ۵۵ ویں نیٹو انفنٹری کا بڑا حصہ قریباً
۶۰۰ آدمی سوات میں جا گھسے تھے۔ انگریزوں نے مقامی قبائل کے
ذریعے انہیں وہاں سے نکلوا دیا۔ میدانوں کی طرف واپسی کا امکان
نہ تھا لہٰذا وہ پہاڑوں کے ساتھ ساتھ مجبوراً کشمیر کو چل پڑے کہ
شاید مہاراجہ پناہ دے دے۔

انہوں نے سندھ پار کیا اور مشرق کی طرف چلتے رہے لیکن قبائل
انہیں مسلسل تنگ کرتے رہے۔ جولائی کے شروع میں وہ وادی کاغان
میں پہنچ گئے اور دشوار گزار علاقے اور دشمن قبائیوں کی وجہ سے
ان کی تعداد بھی ۲۰۰ سے کم رہ گئی۔ اس کے بعد انہوں نے انگریزوں کے
سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اگلے ہفتوں میں وہ سب کے سب موت کے
گھاٹ اتار دیئے گئے جن میں سے ہزارہ کے طول و عرض میں نہایت احتیاط
سے برپا کردہ تقریبات میں توپ زد کئے گئے۔ ان میں سے بعض کی قبریں
ایبٹ آباد میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران
سرحد میں ہونے والے کشت و خون کا یہی خلاصہ تھا۔

تاہم ۱۸۵۷ء کا موسم گرما سرحد میں برطانوی حکومت کے لئے ایک نازک وقت تھا۔ اگر پہلے چند دنوں کے بعد سپاہیوں سے خطرہ نسبتاً کم بھی تھا تو بھی انگریز طاقتور دشمنوں کے نرغے میں تھے جن میں سے کوئی بھی چاہتا تو اُن پر کامیاب چوٹ مار سکتا تھا۔ اس میں ذرا سا بھی شک نہیں کہ سرحدی قبائل تیسا حملے کے پیرؤ اور افغان متحدہ اقوام سے انگریزوں کو سندھ پار دھکیل سکتے تھے۔ ایسی صورت میں پنجاب بھی بغاوت پر اتر آتا۔ اسی کے پیش نظر پنجاب کے چیف کمشنر، سر جان لارنس نے جو تھڑدلا ہرگز نہ تھا، ابتدائے جون میں مشورہ دیا تھا کہ انگریز سرحد بشمول ڈیرہ جات خالی کردیں، امیر کابل دوست محمد کو دعوت دیں کہ وہ اپنے سابقہ علاقوں پر قبضہ کرلے اور اس کی وفاداری کے بدلے بغاوت کے بعد بھی اسے ان پہ قابض رہنے دیں۔

اس مشورے کی ہیوگ جیمز نے پرزور مخالفت کی جو سرحد میں اہلکاروں میں سے تھا اور اب جان لارنس کا سیکرٹری تھا۔ ایڈورڈز اور نکلسن نے بھی پشاور سے اس پر اعتراضات کئے۔ لارنس نے یہ معاملہ فیصلے کے لئے کلکتہ بھیجنے سے اتفاق کیا، ۷ اگست کو گورنر جنرل لارڈ کیننگ سے ایک تار موصول ہوئی "آخر دم تک پشاور میں جمے رہو۔"[1]

---

[1] سابقہ پیروں میں واقعات کا سلسلہ کئی ذرائع سے اخذ کیا گیا ہے جن میں سے اہم ترین ایڈورڈز "میموریلز" I ص ص ۳۶۰ تا ۵۷۴ اور II ا تا ۲۵ ہے۔

اور یہی ہوا، ۲۰ ستمبر کو دہلی پہ دوبارہ قبضہ کیا گیا اور مغل شہزادے جنہیں غلط طور پر بغاوت کے ذمہ دار سمجھا گیا، میجر ہوڈسن نے بہت بے دردی سے مار دیئے۔ جو پرانا سرحدی کارکن اور گائیڈز کا سابقہ کمانڈر تھا۔[1] آفریدی اور ان کے ساتھی قبائلی پہاڑیوں میں رہے اور مسلسل جرگے کرتے رہے لیکن کوئی کارروائی نہیں کی۔ سید احمد کے پیروؤں نے دل چھوڑ دیا جب انہیں پیغام ملا کہ ان کے بعض ساتھی ہندوستان میں شکست کھا گئے تھے، اور انہوں نے اپنی سرگرمیوں کو اپنے پہاڑی قلعہ سے گاہے ماہے چھاپے مارنے تک ہی محدود رکھا۔ دوست محمد نے بوجہ ۱۸۵۵ء کے اینگلو افغان معاہدۂ پشاور کے عین مطابق انگریزوں سے دوستی کے وعدوں کا پاس کیا۔ ایسا کر کے اس نے غالباً کھوئے ہوئے صوبوں کی بازیابی کے لئے افغانستان کا آخری موقع بھی کھو دیا۔

۱۔ ڈبلیو۔ ایس۔ آر ہوڈسن "اے سولجرز لائف ان انڈیا" (لندن جے پارکر ۱۸۵۹ء) ہوڈسن کی کتاب حق اور بربریت کی آمیزش کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے جس سے انگریزوں اور ہندوستانیوں نے دوران بغاوت کام لیا۔ ہوڈسن کی کتاب ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۴ء میں سرحد میں اس کی ملازمت کا بھی حال بتاتی ہے۔ وہ وہاں کام کرنے والے روشن خیال افسروں میں سے نہیں تھا اور اس کے خطوط میں کوئی عظمت و رفعت نہیں ہے۔

بغاوت کے دوران سرحد پر اپنی گرفت برقرار رکھنے میں انگریزوں کی کامیابی ہمعصر برطانوی افسر اور بعد کے مورخین متفقہ طور پر اس وقت کے صبر و استقامت سے منسوب کرتے ہیں جس نے مقامی لوگوں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ برطانوی راج کی سخت جانی سے مرعوب ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایڈورڈز اور اس کے رفقاء نے بہت ہمت و مہارت سے کام لیا اور ایک نازک دور میں امن قائم رکھنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن غالباً فیصلہ کن امر یہ تھا کہ پنجاب وفادار رہا۔ اگر وہاں کے جنگجو سکھ اور مسلمان اٹھ کھڑے ہوتے تو بغاوت یقیناً سرحد میں بھی پھیل جاتی۔

مزید برآں صوبہ بنگال میں سپاہیوں کی بغاوت میں برائے نام ہی پٹھانوں کی کوئی ذاتی دلچسپی تھی اور ان میں بعض اگر اس کے متعلق کچھ سوچتے بھی تھے تو وہ اسے غیر ملکیوں کے دو گروہوں کے درمیان ہی ایک جنگ سمجھتے تھے یعنی انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان۔ اس وقت کے پٹھانوں کو بھاری بھر کم نوکر شاہی اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کبھی کبھی کے جابرانہ اقدامات کا تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا اور وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا حصہ نہ سمجھتے تھے۔ وہاں جو بھی نفرت تھی وہ بعد میں ظہور پذیر ہوئی جب نئی حکومت ہند کے بعض برطانوی افسروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمے کے بعد بغاوت کا زیادہ الزام (اور سزا بھی) غلط طور پر ہندوستان کے مسلمان عناصر کے سر تھوپا

دیا۔

بغاوت کے خاتمہ اور تاجِ برطانیہ کو انتقال حکومت ہند سے سرحد میں کوئی خاص تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ اس کی اہمیت ہمیشہ سے اقتصادی کی بجائے عسکری رہی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے سرحدی سرزمین کو کوئی توجہ نہ دی تھی۔ لیکن اس تبدیلیٔ اقتدار نے پٹھانوں نیز وہاں کام کرنے والے برطانوی افسروں کی نگاہوں میں برطانوی راج کے دوام کا نقش جما دیا۔ کم از کم کچھ عرصے کے لئے اس علاقے میں تحفظ کو کوئی بڑا خطرہ نہ رہا اور یوں انگریز اور پٹھان دونوں دیگر مسائل کی طرف اپنی توجہات مبذول کرسکے۔

بندوبستِ اراضی۱؎

ان میں سے اہم ترین مسئلہ اراضیاتی نظام کے قیام کی ضرورت تھی۔ پٹھانوں کو ایسے نظام کی اشد ضرورت تھی تاکہ ان کے روایتی ڈھانچے۱؎ میں کوئی ترتیب بحال ہوسکے جو پہلے ہی بے انتہا تقسیم در تقسیم کی وجہ سے کافی کمزور ہوچکا تھا۔ پیشتر اس کے کہ سکھا شاہی نے اس کو چکنا چور کر دیا۔ انگریزوں کو ایک نظام مطلوب تھا جو لگان بھی دے اور ان کی پٹھان رعایا کی شورش انگریزی کو بھی کم کرے۔ برطانوی ارباب

۱؎۔ دیکھیئے باب سوم گزشتہ

وروبست یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ اپنے زیرِ انتظام علاقے میں زرعی حالات بہتر کرکے پشاور اور ڈیرہ جات ڈویژنوں کے آئین پذیر پٹھانوں اور پہاڑیوں میں ان کے آئین گریز بھائیوں کے درمیان بندھنوں کو کم کرسکیں۔

بندوبست اراضی کا عمل برصغیر میں برطانیہ کا ایک بہتر کارنامہ تھا۔ بنگال میں پہلا بندوبست ۱۷۸۶ء میں لارڈ کارنوالس کے دور میں کیا گیا تھا۔ جب تک انگریزوں نے سکھوں سے سرحد کا قبضہ لیا وہ ہندوستان کے زمینی نظام کو ایک نئی وضع دینے میں کافی تجربہ حاصل کرچکے تھے۔ لیکن سرحد کے حالات بنگال کے حالات سے مختلف تھے قبائلی زمینوں کی ابتدائی مساویانہ تقسیم کا ڈھانچہ قائم رہا لیکن بہت سے آقاؤں نے بعد میں مختلف تقسیمات کر دیں۔ جو کسی وقت کی مخصوص سیاسی صورتحال کے مطابق کبھی نافذ ہوئیں اور کبھی نہ ہوسکیں۔ بہت سی حالتوں میں ایک ہی قطعۂ زمین کے بارے میں کم از کم تین مختلف قسم کے دعوے موجود تھے یعنی پٹھان دفتر، مغل جاگیر اور سکھ عطیہ۔

سکھ دربار کے تحت ملازمت کرنے والے برطانوی افسروں نے الحاق سے پہلے ہی زمینی نظام کو معقول بنانے کی کچھ کوششیں کی تھیں ایڈورڈز نے ۱۸۴۸ء میں بنوں میدان کے سرے پر رہنے والے بعض وزیر قبیلوں کے اس طرح دل جیت لئے تھے کہ اس نے میدان کے سرے پر واقع بعض زمینوں پر ان کے حقوق تسلیم کر لئے تھے۔ الحاق کے

بعد بندوبست جاری رہا اور پنجاب کمیشن مالیات کی کمی کے باوجود وسے اپنی اولین ترجیحات میں رکھتا تھا۔

خوانین یا جاگیرداروں کی بجائے نچلی سطح کے قائدین سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی۔ ہر گاؤں کا سربراہ گاؤں کے مالیہ کے لئے حکومت کے سامنے ذمہ دار قرار دیا گیا اور گاؤں میں مختلف قطعات زمین پہ مالکانہ حقوق سربراہ اور اہلِ دیہہ کے درمیان باہمی اتفاق کے بعد درج کئے گئے۔ یہ اصل میں تحصیلداری نظام کا آغاز تھا جو آج تک جاری ہے۔ دیرینہ تنازعات کے فیصلے اکثر و بیشتر نوجوان برطانوی بندوبست افسروں نے اپنی ہی مرضی سے کر دیئے جن کی مقامی رسم و رواج سے ناواقفیت کی وجہ سے بعض اوقات ناانصافیاں بھی ہوئیں[۱۲]

---

[۱۲] - دیکھئے ڈلسڈن، ایضاً ص ص ۲۷۹ تا ۲۸۱ برائے ابتدائی بندوبست۔ نیز ہیوگ۔ آر۔ جیمز "رپورٹ ریفنیٹ جیمز سمری سیٹلمنٹ آف شہت نگران ڈسٹرکٹ آف پشاور" (۱۸۵۱ء) سیلیکشنز فرام دی پبلک کارسپانڈنس آف دی ایڈمنسٹریشن فار دی افیئرز آف دی پنجاب ۱۸۵۷ء جلد اوّل جیمز انعام (قبائلی شاملات میں حصہ) پر انفرادی حقوق نہیں مانے اور یہ ضد رہا کہ ایک آدمی کا وفتر (زمینی حقوق) گاؤں یا کھیتوں میں صرف اس کے بخرہ (مقرر کردہ حصہ) تک محدود تھا (دیکھئے باب سوم گزشتہ) اس طرح شاملات بالآخر کسی قبائلی رہنما (اکثر خان) کے نام پر لکھی گئی جس نے اس کا مالیہ ادا کرنے کی ذمہ داری پر اس کی ملکیت حاصل کر لی۔

بندوبست کا عمل کئی سال تک جاری رہا۔ اس کے مکمل ہونے پر سرحد کو ایک عملی اور معقول حد تک منصفانہ نظام ملکیت و مالیہ مل گیا۔ محصولاتی ڈھانچے میں دلالوں کی تعداد کم سے کم کر دی گئی اور چھوٹے چھوٹے آزاد زمینداروں کی کافی بڑی تعداد کو اپنی زمین پہ واضح اور محفوظ حقوق مل گئے۔ مالیہ مخصوص ادوار کے لئے مقرر کیا گیا اور ان غلطیوں سے احتراز کیا گیا جو نصف صدی پہلے بنگال میں کی گئی تھیں جہاں دوامی شرح مقرر کر دی گئی تھی جس کے نتیجہ میں مرور زمان کے ساتھ فصلوں اور سکوں کی بڑھتی گھٹتی قیمتوں سے خلفشار برپا ہوا۔ اس سے پشاور اور ڈیرہ جات ڈویژن میں جو زرعی خوشحالی آئی تو یہ ڈویژن چند سالوں کے لئے اشیائے خوردنی کے برآمدی علاقے بن گئے اور ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۶ء کے دوران دوسو تا ڈھائی سو کشتیاں گندم، جوار، باجرہ، دالیں، تیل کے بیج، کپاس اور اون کا ملا جلا سامان لے کر ضلع بنوں کی دریائی بندرگاہوں (زیادہ تر کالا باغ) سے سندھ اور زیریں پنجاب پہنچاتی رہیں[1]۔

ارتقا پذیر نظم و نسق دور

پچھلے عشرے میں سرحد میں نظم و نسق کا جو ڈھانچہ قائم

---

[1] ایچ۔ یل۔ او۔ گیرٹ "نوٹس آن دی بنوں ڈسٹرکٹ، سلیکشنز فرام دی ریکارڈز آف

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کیا گیا وہ اگلے تیس سال میں کچھ زیادہ نہیں بدلا لیکن نوکر شاہی بڑھ گئی اور ناظمین کا وہ معیار قائم نہ رہ سکا۔ جیسے جیسے حکومت کا تانا بانا، جو پولیس، رفاہی امور، آبپاشی اور بے شمار دیگر معاملات میں ظاہر ہوتا تھا۔ بتدریج زیرِ انتظام اضلاع پر پھیلتا گیا۔

برطانوی ہند کی قانونی عدالتیں بمعہ اپنے بے شمار ہندو نیم تربیت یافتہ وکلاء (جو بات بات پر مقدمہ بازی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے) صوبے میں قائم کر دی گئیں اور جلد ہی پٹھانوں کے ذاتی مناقشات کے تسلسل کا ذریعہ بن گئیں۔ اس کے چند سال بعد فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز یعنی ایف سی آر کا پہلا سیٹ ۱۸۷۲ء میں نافذ کیا گیا تو پٹھانوں نے قدرے سکھ کا سانس لیا۔ ایف سی آر جیسا کہ وہ اب بھی مشہور ہے جمہوری ہرگز نہ تھا لیکن اس نے سرحد کے لئے ایک علیحدہ مجموعۂ قوانین ضرور نافذ کیا جو کم از کم جزوی طور پر مقامی رواج پہ مبنی تھا۔ ایف سی آر نے ڈپٹی کمشنروں کے منتخبہ سرکاری جرگوں کے ذریعے مقدمہ کی سماعت کا انتظام کیا۔ شہادت کے عام قواعد و ضوابط ساقط

(بقیہ حاشیہ)

دی گورنمنٹ آف دی پنجاب اینڈ اِٹس ڈسٹرکٹ اینڈ مینیئر ڈی بیسری) ۱۸۶۶ء ص ۳ پر واضح نہیں ہے کہ سرحدی اضلاع کب اور کیوں غذائی طور پر فاضل علاقوں سے خسارہ کے علاقے بنے گو آبادی میں اضافہ کا اس پر بلاشک و شبہ کچھ اثر ضرور ہوا۔ بہرحال انیسویں صدی کے آخر تک یہ تبدیلی واضح طور پر پیدا ہو چکی تھی۔

کر دیئے گئے اور خارجی قانونی وکلاء کی ضرورت بہت کم ہو گئی۔

پہاڑی قبائل ضلعوں میں ان نئی تبدیلیوں کو انتہائی شک وشبہ سے دیکھتے رہے اور ان سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ وظائف، ناکہ بندی اور تخریب زدگی کے باوجود وہ ویسے کے ویسے ہی سرکش رہے اور شاذ ہی کوئی سال گزرا ہوگا جب پہاڑیوں میں کوئی مہم نہ بھیجی گئی ہو۔[1] یہ مہمات بقول سرولیم بارٹن (شاید سرحد کا لائق ترین اور بیدار مغز ترین ناظم) "جلاؤ اور تباہ کرو" کی پالیسی پر عمل کرتی تھیں۔ چونکہ فوج قبائلیوں سے دو بدو لڑائی تو شاذ و نادر ہی کر سکتی تھی لہٰذا وہ کھیت جلا دیتی تھی، گھر تباہ کر دیتی تھی، پھلدار درخت کاٹ ڈالتی تھی اور بعض حالتوں میں تو زمین پر نمک بھرے ہل چلا دیتی تھی۔ یہ چالیں اس لئے چلی جاتی تھیں کہ جارح قبیلہ کو برطانوی قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کا مزہ چکھا دیا جائے اور اس طرح اسے آئندہ قانون شکنی سے باز رکھا جائے۔ قبائلی نگاہوں میں یہ مہمات اکثر و بیشتر محض انگریزوں کے خلاف بدلہ کا وزن بڑھا دیتی تھیں۔

انیسویں صدی کے ربع سوم میں قبائل پر قابو پانے کا روز افزوں مسئلہ انگلستان اور ہندوستان میں بہت سی عالمانہ بحث کا موضوع بنا رہا۔ یہ بحث بعض دوسری جنگ افغان (۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۰ء)

---

[1] ۱۸۴۹ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان ۴۲ مہمات بھیجی گئیں۔

کے قریب بہت زور پکڑ گئی جب سامراجی روس جنوب اور مشرق کی طرف اتنا بڑھ آیا کہ سلطنت زار کی بیرونی چوکیاں برطانوی ہندوستانی سرحد سے صرف پیدل فاصلے پر پہنچ گئیں۔ اس وقت دو اہم مکاتب فکر منظر تاریخ پر آئے جن میں سے ہر ایک کم از کم چالیس سال سے ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔

کلوز بارڈر سسٹم (بند سرحد کا نظام)

ان میں سے زیادہ قدامت پسند نظام بند سرحد کا تھا، بنیادی طور پر اس کے مطابق برطانوی ہندوستانی حکومت کو کسی ایسے علاقے کی ذمہ داری قبول نہ کرنی چاہیے جس پر اپنی سلطنت کے جزو لاینفک کی طرح نظم و نسق قائم کرنے کی اہل یا رضامند نہ تھی۔ اس مسئلے پر بھی مختلف اوقات میں آرا بدلتی رہیں کہ برطانوی ہند کی شمال مغربی سرحد کہاں شمار کی جائے۔ وائسرائے لارڈ لارنس (۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۸ء) اس پر آمادہ تھا کہ دریائے سندھ پر واپس آ جائیں جو ایک قدرتی جغرافیائی اور ثقافتی حد تھا لیکن اکثر افسران اس سرحد کو مانتے تھے جو انہیں سکھوں سے ورثے میں ملی تھی یعنی پشاور اور کوہاٹ کمشنریوں کی مغربی سرحد جس کی حیثیت مناسب بین الاقوامی سرحد کی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ علاقہ ۱۸۴۹ء سے مسلسل (خواہ ہمیشہ کامیابی سے نہ سہی) زیر انتظام رہا تھا۔

لیکن جیسا کہ ہر ایک جانتا تھا کہ مسئلہ خط سرحدی کھینچنے سے کہیں زیادہ اس کے ماروا علاقے پر مرکوز تھا کیونکہ پہاڑیوں کے خونخوار اور طاقتور قبائل کو نظر انداز کرنا صاف طور پر ناممکن تھا۔ یہ مسئلہ کلوز بارڈر کے حامیوں کے نزدیک بنیادی طور پر ڈپلومیٹک یا سیاسی تھا اور اس طرح یہ زیر انتظام ضلعوں کے انتظامی مسئلہ سے کافی حد تک علیحدہ تھا۔ ان کے خیال میں سرحد پار قبائل پر سیاسی قابو زیر انتظام ضلعوں کے اندر سے رکھا جا سکتا تھا اور اس کا ذریعہ وظائف، ناکہ بندی، قبائلی معاملات میں گاہے ماہے مداخلت اور بوقت ضرورت انتقامی مہمات کی پالیسی ہو سکتی تھی۔ اس کا مقصد دوگونہ تھا یعنی زیر انتظام ضلعوں کو تحفظ مہیا کرنا اور کسی غیر مقامی طاقت کو سرحد پار علاقے سے دور رکھنا جو فوری و قریبی طور پر تو امیر کابل تھا لیکن انتہائی اہم طور پر زار روس۔ یہ پالیسی جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ۱۸۴۹ء میں ایڈورڈز نے شروع کی تھی۔

فارورڈ پالیسی (پیش قدمی کی پالیسی):

فارورڈ پالیسی اس بات کی حامی تھی کہ بین الاقوامی سرحد کو مغرب اور شمال کی طرف جہاں تک جغرافیائی طور پر ممکن ہو بڑھا دیا جائے اور پھر تعلیم اور زور اسلحہ سے اس توسیع یافتہ علاقے میں موجودہ حالات کو تبدیل کر دیا جائے اور اس پورے علاقے پر مکمل حاکمیت سے کام لیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ اسلوب زود یا بدیر ہندوستان اور روس کو وسط ایشیا میں روبرو لے آتا۔ اس پر مختلف آراء تھیں کہ یہ آمنا سامنا کہاں ہو۔ کچھ کے خیال میں ہندوستان کی سرحد سیحوں پر تھی جبکہ دوسرے ہرات اور ہندوکش پر مطمئن تھے۔[1] دوسری جنگِ افغان کے دوران اور بعد میں کابل سے بذریعہ غزنی قندھار تک "سائنسی سرحد" کی تجویز بہت مقبول ہوئی (انگریز ان تینوں شہروں پر ۸۰-۱۸۷۹ء میں واقعی قابض تھے)۔

یہ بات کہ بعض حالات میں قبائلی علاقوں میں نظم و نسق کو پھیلانا ممکن تھا کرنل رابرٹ سنڈیمن نے بلوچستان میں ثابت کر دیا۔ سنڈیمن سسٹم فارورڈ پالیسی کا ہی ایک مشفقانہ رُخ تھا اور یہ اس لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا کہ اس کا بنیادی مقصد قبائل کی فلاح و بہبود تھا۔ سنڈیمن کا نظریہ یہ تھا کہ علم اور ہمدردی کی بدولت ان کی سرزمینوں میں "پُرامن نفوذ" کیا جائے۔ اس کے عقب میں یہ مفروضہ کارفرما تھا کہ اگر انہیں اقتصادی بہتری کا موقع دیا جائے تو قلاش اہل کردہ اپنی قزاقانہ عادت کو چھوڑ دیں گے اور پُرامن مہذبانہ اطوار اپنا لیں گے۔ ایسی بہتری کا فوری ذریعہ قبائلیوں کو لیویز اور سڑکوں کی تعمیر وغیرہ کی صورت میں روزگار مہیا کرنا تھا۔

---

[1]- یہ موجب دلچسپی ہے کہ ۵۰ سال سے بھی زیادہ عرصے کے بعد شریف النفس مہاتما گاندھی نے بھی یہی سوچا کہ ہندوستان کی اصل سرحد ہندوکش تھی۔

سنڈیمن سسٹم بلوچستان میں بہت کامیاب رہا اور قریباً شروع سے ہی نظم و نسق برطانوی علاقہ مفاد کی آخری حدود تک پھیلا دیا گیا۔ لیکن بلوچ سرحدی قبائل پٹھانوں کی نسبت کم سرکش تھے۔ ان کی قبائلی ثقافت اتنی ترقی یافتہ نہ تھی اور انہوں نے ماضی قریب میں ہی امیران سندھ اور خان قلات کے بدعنوان اور مطلق العنان دور کا مزہ چکھ لیا تھا جس کے مقابلے پر برطانوی حکومت، ہلکی پھلکی اور مہربان تھی۔ مزید برآں وہ تعداد میں پٹھانوں سے بہت کم تھے۔

فارورڈ پالیسی عشرۂ آخری میں :

بالآخر ۱۸۹۰ء میں انگریزوں نے اپنا اڈہ کلوز بارڈر سے پرے جما دیا۔ نہایت موزوں طور پر سنڈیمن نے راستہ دکھایا۔ ژوب (بلوچستان) سے وہ گومل کے اوپر چڑھا، یہاں پکٹ قائم کی اور کلیدی مقامات پر لیویز کی چوکیاں قائم کیں۔ خضرزئی شیرانیوں نے توسیع کی مخالفت کی تو انہیں ایک مہم کے ذریعے مغلوب کر لیا گیا، اور انہیں اپنے علاقے میں لیویز چوکیوں کے قیام سے اتفاق پر مجبور کر دیا گیا۔

۱۸۹۱ء میں اورکزئیوں کے خلاف ایک باقاعدہ انتقامی مہم بھیجی گئی اور اس کے فوراً بعد اعلان کر دیا گیا کہ کوہ سلیمان کی ایک اونچی گھاٹی یعنی سامانہ چوٹی جو وادی میرانزئی اور جنوبی تیراہ پر غالب و نگران تھی واقعتاً برطانوی سرحد تھی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ پکٹیں

بھی تعمیر کر دی گئیں۔ اگلے سال چوکیاں وادیٔ کرم تک بڑھا دی گئیں اور شیعہ توریوں کی رضامندی سے جو اپنے سُنی ہمسایوں کے امکانی جہادِ بیم مرگ میں مبتلا تھے۔ وادی کو ایک انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے زیرِ انتظام کر دیا گیا۔

۱۸۹۳ء میں میر عبدالرحمان والیٔ کابل نے باولِ ناخواستہ اپنی مشرقی سرحد کی حد بندی پر اتفاق کر لیا جس خطِ سرحدی پر امیر اور سرمارٹیمر ڈیورنڈ کا فیصلہ ہوا اس کی حد بندی ۹۵-۱۸۹۴ء میں کی گئی اور وہ آج بھی بین الاقوامی سرحد ہے۔[1] حد بندی کے دوران محسودوں نے وانا

---

[1] ڈیورنڈ لائن جیسا کہ یہ مشہور ہوئی اس وقت سے افغانستان اور برطانوی ہند (بعدہٗ پاکستان) کے درمیان ایک وجہ تنازع بنی رہی ہے۔ امیر عبدالرحمان نے بار بار انگریزوں پر زور دیا کہ وہ پہاڑی قبائل کو اپنی سرحدوں میں شامل نہ کریں۔ اس نے وائسرائے لارڈ لینڈز ڈاؤن کو مشہور پیراگراف میں لکھا: "اگر آپ انہیں میری حکومت سے نکالتے ہیں تو وہ نہ آپ کے کام آئیں گے نہ میرے۔ آپ ان کے خلاف ہمیشہ لڑائی یا کسی اور فتنہ میں الجھے رہیں گے اور وہ ہمیشہ لوٹ مار کرتے رہیں گے جب تک آپ کی حکومت مضبوط اور با امن ہے آپ انہیں بزور تابو رکھ سکیں گے لیکن جونہی کوئی بیرونی دشمن ہندوستانی سرحدات پر نمودار ہوگا یہ سرحدی قبائل آپ کے بدترین دشمن ثابت ہوں گے۔ ان سرحدی قبائل کو مجھ سے کاٹ کر جو میری قومیت اور مذہب کے لوگ ہیں آپ میرا وقار میری رعایا کی آنکھوں میں گرا دیں گے اور مجھے کمزور کر دیں گے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں برٹش باؤنڈری کمیشن کا کیمپ حملہ کر کے جلا ڈالا جس کے بعد وہاں ایک مضبوط گیریژن تعینات کر دی گئی۔ تھوڑے عرصہ بعد وادی ٹوچی پر بھی قبضہ کر لیا گیا جہاں کے دَوَروں نے کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ وہ بھی توریوں کی طرح انگریزوں کی موجودگی کو اپنے ہمسایوں کے خلاف باعثِ رحمت سمجھتے تھے۔

انتہائے شمال میں ایک انگریز پولیٹیکل ایجنٹ ۱۸۷۷ء سے گلگت میں عارضی ریذیڈنٹ تھا۔ پامیر کے نیچے چترال اور گلگت پر مرکوز ہونے والا وسیع علاقہ تکنیکی طور پر مہاراجہ کشمیر کی حاکمیت کے ماتحت تھا۔ مہاراجہ نے اپنی جگہ ۱۸۴۶ء میں برطانوی حاکمیت قبول کر لی تھی جب کشمیر کو پنجاب کی سکھ سلطنت سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ نویں عشرے تک انگریز عام طور پر مہاراجہ کے توسط سے شمالی علاقے پر کم سے کم اثر ڈالتے تھے، لیکن ۱۸۸۹ء میں ایک علیحدہ گلگت ایجنسی قائم کی گئی اور انگریزوں نے مہتر چترال امان الملک کی موت پر پیدا ہونے والے خلفشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چلٹ اور ہنزہ میں ۱۸۹۲ء میں اپنے گیریژن تعینات کر دیئے۔ ۱۸۹۵ء میں ایک سڑک درّہ مالاکنڈ کے راستے بنائی گئی اور درّے، دریائے سوات کی جائے عبور اور خود چترال میں چوکیاں قائم کر دی گئیں۔

(بقیہ حاشیہ)
اور میری کمزوری آپ کی حکومت کے لئے ضرر رساں ہے" عبدالرحمان "دی لائف آف عبدالرحمان امیر آف افغانستان" مرتبہ میر منشی سلطان محمد خان، دو جلدیں (لندن۔ جے مرے ۱۹۰۰ء) ۲، ص ۱۵۸۔

۱۰ ستمبر ۱۸۹۵ء کو روس کے ساتھ پامیر باؤنڈری ایگریمنٹ کے تحت پامیر کے علاقے میں روسی افغان سرحد کا تعین ہوا اور یوں افغانستان کی بین الاقوامی سرحدوں کا کام مکمل ہوا۔ پامیر باؤنڈری مشرق میں ڈیورنڈ لائن کے شمالی ترین نقطہ پر ختم ہوتی تھی۔ ان دونوں کا درمیانی علاقہ جو کہیں کہیں صرف نصف درجن میل ہی چوڑا تھا افغانستان کی واخان پٹی پر مشتمل تھا اور امید کی گئی کہ یہ برطانیہ اور روس کے مقبوضات کو واضح طور پر اور ہمیشہ کے لئے علیحدہ رکھ سکے گا۔

ڈیورنڈ لائن کی نشان بندی نے کلوز بارڈر اور فارورڈ پالیسی کے درمیان تنازعہ کو اور زیادہ شدید کر دیا۔ برطانوی ہند کی اب دو واضح سرحدات تھیں جن سے اس کا تعلق تھا۔ ایک تو کلوز بارڈر یا بند سرحد جو ۱۸۴۹ء میں ملی اور جو پشاور اور ڈیرہ جات ڈویژن کے مغربی کناروں کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اور دوسری افغانستان کی مشرقی سرحد جو پہاڑیوں کی بلندیوں کے ساتھ ساتھ تھی اور پہلی سرحد سے ۱۵ تا ۶۰ میل کے فاصلے پر مزید مغرب میں اس کے متوازی چلتی تھی (انتہائے شمال میں انتظامی سرحد مشرق کی طرف مڑتی تھی اور ۲۰۰ میل کا قبائلی علاقہ ان دونوں خطوط سرحدی کو جدا کرتا تھا) یہ دونوں خطوط جنوباً شمالاً کوئی ۱۲۰۰ میل اکٹھے چلتے تھے۔ ان کے درمیان قریباً ۲۵ ہزار مربع میل کا ٹکڑا بے مالک تھا جس میں پہاڑی قبائل آباد تھے، اور جہاں برطانوی قانون نہ چلتا تھا۔ لیکن برطانوی نفوذ کی

انگلیاں، گومل، ٹوچی، کرم، خیبر اور مالاکنڈ سے اوپر چترال میں صاف واضح تھیں۔

ان انگلیوں پر جنوبی وزیرستان، شمالی وزیرستان، کرم اور مالاکنڈ نیز خیبر ایجنسیاں (جو ۱۸۸ء میں قائم ہوئی تھیں) مرکوز تھیں۔ اگر جنوباً شمالاً انہیں ایک نقشے پر ظاہر کیا جائے تو پانچوں برطانوی انگلیاں ایک ہاتھ کا تصور دیتی ہیں جس کی ہتھیلی اوپر کی طرف ہو اور مالاکنڈ اس کا انگوٹھا ہو۔ بہت سے ماہرین حربیات نے واقعی اسے سرحد میں برطانوی طاقت کا "مضبوط و ستارہ ساست" قرار دیا تھا جو ایک مکا بن کر ہندوستان کی طرف روسی پیشقدمی کو توڑ پھوڑ سکتا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ انگلیاں اگر ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہو جائیں یا ڈھیلی پڑ جائیں تو ان کی درمیانی گھاٹیوں میں رہنے والے دشمن قبائل انہیں بری طرح زخم خوردہ کر دیں گے۔ فارورڈ پالیسی کے علمبردار جو عشرے کے ابتدائی حصہ میں پیشرفت کی وجہ سے ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے زور دیتے تھے کہ ڈیورنڈ لائن تک کے پورے علاقہ میں امن و امان اور نظم و نسق پھیلایا جائے خواہ پُرامن نفوذ کے ذریعے خواہ وحشیانہ طاقت کے ذریعے جس نے پہلے بھی پیشں غلبہ قائم کیا تھا۔

کلوز بارڈر کے حامی اب قدرے مدافعت پر آ گئے تھے۔ یہ دلیل دیتے تھے کہ روس کے ساتھ ۱۸۹۵ء کے معاہدے نے افغانستان کی قطعی

حد بندی کر کے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک بفر سٹیٹ بنا دیا تھا اور اس طرح روس کے ساتھ تصادم کے امکانات کو بہت حد تک کم کر دیا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ قبائلی علاقے پر قبضہ کا مطلب یہ تھا کہ خزانے پر بوجھ بہت بڑھ جائے گا اور اس میں پہلے سے پیوست پانچ انگلیوں کا خرچ برداشت کرنے پر ہی زور دیتے تھے۔

آخرالذکر حقیقت ۹۸-۱۸۹۷ء کی مہیب قبائلی بغاوت نے نمایاں کر دی جب بقول سر ولیم بارٹن "سرحد ٹوچی سے مالاکنڈ تک شعلہ بار ہو گئی"[1] ۱۸۹۷ء کی بغاوت کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا[2] یہاں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس بغاوت میں ۴۰ ہزار باقاعدہ سپاہیوں کو میدانِ جنگ میں کودنا پڑا تاکہ وہ "مضبوط دست راست" کو محفوظ رکھ سکیں جو ایسے حالات میں روسی پیشقدمی پر کوئی مانع ضرب نہ لگا سکتا تھا۔

نیا نظام ۱؎

۹۸-۹۷ء کے خونی تعطل کے بعد فوراً ہی ایک نئے نظام کے خد و خال واضح ہونے لگے۔ اعلان کیا گیا کہ آئندہ برطانوی سرحدی پالیسی تین نکات پر مبنی ہوگی (۱) افواج کا ارتکاز (۲) قبائل میں غیر ضروری مداخلت سے

۱- بارٹن "ایضاً" ص ۶۷

۲- دیکھئے باب نہم

گریز اور (۳) اسلحہ کی ناجائز تجارت پہ قابو۔

یہ نکات بکسی حد تک دونوں مکاتب فکر کا امتزاج تھے۔ قبائلی علاقے میں پہلے سے پیوست انگلیوں کو برقرار رکھنا تھا لیکن ان کے ارگرد رہنے والے قبائل کو حلقۂ نظم ونسق میں لانے کی کوئی کوشش نہ کرنا تھی۔ تاہم اضافی اسلحہ سے انکار کر کے قبائل کی قوت خارجہ کو حتی الوسع کم ضرور کرنا تھا۔ اس کی اہمیت کا احساس ۹۸-۱۸۹۷ء کی لڑائی میں ہوا جب قبائل نے جدید اسلحہ کے مالک ہونے اور اس میں مہارت کا مظاہرہ کیا۔ برسبیل تذکرہ، قبائلی اسلحہ کو محدود کرنے کی کوشش پورے آئندہ پچاس سال تک جاری رہی لیکن یہ کبھی کامیاب نہ ہوسکی۔ پٹھان اپنا اسلحہ رشوت اور چوری کے ذریعے ہندوستان اور افغانستان سے حاصل کرتے تھے۔ وہ اسے برطانوی سپاہیوں سے کبھی چپکے سے اور کبھی کھلم کھلا حملے سے حاصل کرنے میں ناقابلِ یقین چابکدستی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ انہیں بسا اوقات کابل کے اسلحہ خانہ سے بھی اسلحہ مہیا ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی گن فیکٹریاں بہت عرصہ پہلے قائم کر لی تھیں۔ ۱۸۹۰ء سے خلیج فارس اور ساحل مکران سے وسیع پیمانے پر ناجائز درآمدی تجارت بھی قائم کی تھی۔ انگریز ۱۹۱۰ء تک اسے کم کرنے میں تو کامیاب ہوگئے لیکن وہ قبائلی علاقے میں اسلحہ کی فراہمی کو پوری طرح کبھی

۱:- "گریٹ برٹین"، پارلیمنٹری پیپرز ۱۸۹۸ء (۶۳)، این ڈبلیو ایف کانڈ، ۸۷۱۴، ص ص ۱۱ تا ۱۷-

نہ روک سکے[1]

ظاہر ہے کہ اگر نئی پالیسی کو نافذ کرنا تھا تو اس کے لئے ایک نئی انتظامی تشکیل ضروری تھی۔ حکومت پنجاب ۱۸۴۹ء میں اس کے قیام کے بعد ایک زبردست نوکر شاہی بن چکی تھی جس کے روح رواں لاہور اور امرتسر کے گرد کے زرخیز میدان تھے۔ دوسرے لفظوں میں سرحد کا نظم و نسق بائیں ہاتھ سے چلایا جاتا تھا۔ بہت سے مسائل کی حربیاتی نوعیت کی وجہ سے کلکتہ کو اکثر مداخلت کرنا پڑتی تھی۔ لندن بھی ملوث تھا کیونکہ وائٹ ہال تکنیکی طور پر (حکومت ہند کے توسط سے) افغانستان کے خارجی تعلقات کی نگرانی کرتا تھا اور وسط ایشیا میں ایک قابلِ قبول مقام کے لئے مستقلاً سینٹ پیٹرز برگ سے رابطہ قائم رکھتا تھا۔ قبائل کے خلاف بے شمار مہمات نے فوج کے کردار کو غیر معمولی طور پر اہم بنا دیا تھا۔ سندھ پار کے پُر شورش اور ثقافتی طور پر مختلف اضلاع کو بھگتانے کے علاوہ لاہور کے گلے میں اب قبائلی علاقہ میں نفوذ کا جُوا بھی تھا۔

۱۸۴۹ء سے کئی دفعہ سندھ پار علاقے کو پنجاب سے جُدا کرنے کی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ دوسری جنگ افغان کے بعد لارڈ لٹن

---

[1] - دیکھئے ٹریولیس، ایضاً ص ۱۷۵ تا ۱۸۷، نیز آرنلڈ کیبل "دی گن رننگ اینڈ دی انڈین نارتھ ویسٹ فرنٹیئر" (لندن: جے مرے، ۱۹۱۱ء)

اور لارڈ رابرٹس نے بھی علیٰحدگی پر زور دیا تھا لیکن نہ وہ اور نہ اس خیال کے دوسرے زبردست حامی لندن کو اس کی قبولیت پر آمادہ نہ کر سکے۔ بالآخر ۱۸۹۸ء میں جب سرحد میں لڑائی کچھ شکست پڑ گئی تھی تو انڈیا آفس نے سرحد پر عملداری کو ایک نئے زاویے سے دیکھا اور نتیجہ نکالا کہ موجودہ انتظامات تسلی بخش نہیں ہیں"[۱۸]
جنوری ۱۸۹۹ء میں کیڈلسٹن کا لارڈ کرزن وائسرائے ہند بنا۔ وہ کئی سال سے ہندوستانی معاملات میں گہری دلچسپی لے رہا تھا اور وسط ایشیا میں بہت سیر و سیاحت کر چکا تھا۔ وہ انڈیا آفس کے تجزیے سے بالکل متفق تھا اور اپنے ساتھ صورتحال کو بہتر بنانے کا اختیار بھی لایا۔

ایک سال سے زیادہ کے غور و خوض کے بعد کرزن نے ایک طویل اور مدلل یادداشت میں تجویز پیش کی کہ سرحدی اضلاع کو ایک علیحدہ یونٹ بنا دیا جائے اور قبائلی علاقے کو براہ راست حکومت ہند کے ماتحت رکھا جائے۔ اس کے خیال میں ایسا کرنے سے قبائلی انتظام و انصرام خاصتاً ان لوگوں کے سپرد ہو سکے گا جو قبائل کو جانتے ہیں۔"[۲۰]
کرزن کی خواہش ۹ نومبر ۱۹۰۱ء کو پوری ہو گئی جب صوبہ سرحد کی

---

[۱۸] پارلیمنٹری پیپرز ۱۸۹۸ء، جلد تریسٹھ این ڈبلیو ایف، کمبائنڈ ۸۷۱۴، ص ۳

[۲۰] پارلیمنٹری پیپرز ۱۹۰۱ء جلد ۴۹ ویں ۱۰ این ڈبلیو ایف کمبائنڈ ۶ ۴۹ ص ۱۵۰

طور پر معرضِ وجود میں لایا گیا اور قبائلی علاقہ پر حکومت ہند کی براہ راست گرفت قائم ہوئی۔

نئی انتظامیہ کے مسائل اور ان کے حل کرنے میں اس کی کامیابی پر تبصرہ ایک آئندہ باب میں کیا جائے گا[1] لیکن انیسویں صدی کے افراد کو چھوڑنے سے پہلے ان تبدیلیوں کا مختصر سا ذکر مفید ہوگا جو پچاس سالہ برطانوی دورِ حکومت میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان میں سے بعض اہم ترین دستاویزات میں واضح نہیں ہیں اور انہیں صرف بعد میں آنے والے انتظام کاروں کے رویّوں اور پٹھانوں کے ردِ عمل سے ہی اخذ کیا جا سکتا ہے۔

ابتدائی ایام کے برطانوی انتظام کار حیرت انگیز لوگ تھے بہت سے کنوارے تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگیاں ان لوگوں کے عادات و اطوار کو سمجھنے پر صرف کر دیں جن پر وہ حکومت کر رہے تھے یا حکومت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اکثر سفر پہ رہتے تھے اور تمام رہنماؤں اور قبائلیوں کی اکثریت سے دوستانہ نہیں تو کم از کم گہرے تعلقات ضرور رکھتے تھے۔ وہ خالصتاً اسی موضوع پر اپنے وطن میں اپنے خاندانوں، ہندوستان کے دیگر حصوں میں اپنے ہم پیشہ رشتہ داروں اور لاہور اور کلکتہ میں اپنے رفقائے کار کے ساتھ ایک طویل و

---

[1] - دیکھئے باب ہفتم، آگے۔

خط و کتابت کرتے تھے۔ وہ شاذ و نادر ہی چھٹی لیتے تھے اور دورانِ کار تفریح نہ کرتے تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت، دوسری جنگ افغان اور قریباً مسلسل قبائلی بغاوتوں کے دوران وسط ایشیا میں اپنی سلطنت کے پیش غلبہ پر ڈٹے رہے۔ پٹھانوں کو راہِ راست پہ لانے اور رکھنے سے جو تھوڑی بہت فرصت انہیں ملتی تھی وہ اسے لاہور، کلکتہ اور وہائٹ ہال کو قائل کرنے پر صرف کرتے تھے کہ پٹھانوں کو اپنی ہی زندگی گزارنے کی اجازت دی جائے اور یہ بخوبی سمجھ لیا جائے کہ سرحد اپنے کچھ مخصوص مسائل پیش کرتا تھا۔

بعد میں صدی کے دوران جب پاؤں مضبوط ہو گئے اور پھیل کر قبضے میں بدل گئے تو بڑے بڑے خاندان مشرق میں آ گئے تاکہ سرحد میں ایک "چھوٹا سا انگلستان" قائم کریں۔ جن لوگوں کی زیادہ دلچسپی اور ترقی کے امکانات بہت دور لاہور یا شملہ میں مرکوز تھے وہ سرحد میں اپنا وقت کڑھ کڑھ کر گزارتے تھے۔ فوجی افسر جن کی پٹھانوں میں واحد دلچسپی یہ تھی کہ وہ ان کے ذریعے اپنے نئے لشکروں کو خون لینے اور خون دینے کا چسکا مہیا کرتے تھے۔ انتظام معاملات میں روز افزوں اہم کردار ادا کرنے لگے۔ پولیٹیکل افسران (جن سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مقامی عادات و اطوار میں دلچسپی لیں، پٹھانوں کا تحفظ کریں اور جنہیں حقارت آمیز انداز میں معاف کر دیا جاتا تھا) اور لشکری و کشوری انتظامیہ میں تمیز شدید ہوتی گئی۔

انتظامی فیصلوں کے لیے لاہور یا کلکتہ سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ وسیع تر پالیسی لندن میں بنتی تھی اور وہ بھی اکثر و بیشتر سینٹ پیٹرز برگ کے ساتھ لمبے چوڑے جوڑ توڑ کے بعد۔ اکثر و بیشتر پٹھانوں کے مفادات یا فلاح و بہبود کا اثر کسی فیصلے پر برائے نام ہی ہوتا تھا۔ ویسے تو انگریز اور پٹھان دونوں اپنے اپنے راستوں پہ نہایت ہمت و ذہانت سے چلتے رہے تاہم ان کے درمیان ایک سدِ سکندری کھڑی ہو گئی جسے چھاؤنیوں میں رہنے والی انگریز خواتین کے خوف اور بداعتمادی نے اور بھی مضبوط کر دیا جو وہ اپنے مردوں کے برعکس خاموش اور پُراسرار پہاڑیوں سے محسوس کرتی تھیں۔ ماضی پر نگاہ ڈالیں تو ایک عجیب طنزیہ سا احساس ہوتا ہے ا۱۹۰ء میں جب صوبہ سرحد ظہور پذیر ہوا تو سرحد میں انگریز حکومت پہلے ہی اپنے نصف سے آگے گزر چکی تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا خیال چھاؤنیوں کے انگریز شرفا اور ان کی بیگمات کے تصور میں بھی نہیں ہو گا جو نئے وائسرائے یا ضعیف ملکہ کے جام صحت نوش کرتے تھے۔ وہ تو ایسے سوچتے اور کام کرتے تھے گویا وہ ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہیں گے۔

---

(۱۰) باب ششم

عظیم مقابلہ

تعارف ۱۔

۱۹۲۲ء میں ایک خصوصی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر انکوائری کمیٹی نے ایک صدی سے زیادہ پرانی برطانوی پالیسی کا لب لباب یوں پیش کیا۔ "ہماری پوری سرحدی پالیسی کا آخری مقصد ہندوستان کا تحفظ ہے۔ ہماری شمال مغربی سرحدی پالیسی کا فوری ہدف سرحد پار قبائل کو قابو میں رکھنا ہے تاکہ ہمارے سرحدی اضلاع میں جان و مال محفوظ رہے۔"[1]

فوری ہدف کو حاصل کرنے کے لئے انیسویں صدی میں برطانوی

---

[1]۔ گورنمنٹ آف انڈیا۔ رپورٹ آف دی ویسٹ فرنٹیئر انکوائری کمیٹی اینڈ منٹس آف ڈائسنٹ بائی مسٹر ٹی رنگاچاریہ اینڈ مسٹر این۔ ایم۔ سامرتھ (دہلی گورنمنٹ سنٹرل پریس، ۱۹۲۴)، ص ۶

مساعی کا بیان پچھلے باب میں ہوا لیکن یہ ہمیشہ آخری مقصد کے ہی
سیاق و سباق میں کی گیئں جو ہندوستان کے علاوہ ایشیا میں عمومی برطانوی
حیثیت کو روس سے بچاتا تھا۔ اس کی وجہ سے "عظیم مقابلہ" جسے کپلنگ
رومانوی انداز میں بیان کرتا ہے۔ سو سال سے کچھ زیادہ ہی جاری رہا۔
سرحد میں برطانوی پالیسی کو سمجھنے اور جاننے کے لئے کہ یہ ہندوستان
کے دیگر حصوں میں برطانوی پالیسی سے کیوں مختلف تھی، اس عظیم مقابلہ
کے متعلق کچھ سمجھنا ضروری ہے، خواہ اس کی بعض چالیں سرحدی
پہاڑیوں سے بہت دور اور ان پر برطانوی قبضے سے سالہا سال پہلے
چلی گیئں۔

ہرات کے لئے کشمکش!

پیشتر اس کے کہ کانگریس آف ویانا (ستمبر ۱۸۱۴ء تا جون ۱۸۱۵ء)
یورپ کے نقشے کی تشکیل نو کرتی انگلستان ایشیا میں روسی خطرے کے مقابلہ
کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ ۱۵ نومبر ۱۸۱۴ء کو ایران اور انگلستان نے معاہدۂ
طہران پر دستخط کئے۔ اس کی دفعات کے مطابق (۱) ایران نے ضمانت دی کہ
وہ اپنے علاقے میں سے کسی یورپی فوج کو ہندوستان نہ جانے دیگا اور
خیوا، بخارا اور خوقند کے خوانین پر بھی زور ڈالے گا کہ وہ بھی ایسا ہی کریں۔
(۲) روس اور ایران کی دونوں مملکتوں کی حدود کا تعین برطانیہ عظمیٰ، ایران
اور روس کے باہمی اتفاق سے ہوگا۔ (۳) ایران اور برطانیہ عظمیٰ جنگ

کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے سوائے اس کے کہ (۴) اینگلو افغان جنگ کی صورت میں ایران ایک لشکر برطانیہ کے سپرد کر دے گا لیکن (۵) افغان ایرانی جنگ کی صورت میں برطانیہ عظمیٰ مداخلت نہیں کرے گا اور صرف فریقین کی استدعا پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے گا۔[1]

کوئی بیس سال بعد ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ کے دورِ حکومت میں (۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۲ء) وسط ایشیا میں تبدیلیوں کی افواہیں جن سے برطانیہ ڈرتا تھا لندن اور کلکتہ پہنچیں۔ ہرات پر (جو "ہندوکش" کے مغربی سرے پر ایک اہم جنگی مقام تھا اور برطانوی اور روسی مقبوضات کے قریباً درمیان تھا) قبضے کے لئے امیر کابل، شاہ ایران، افغان سرداران قندھار اور خان خیوا کے درمیان ایک کثیر الجہت مقابلہ شروع ہوا۔ متقابلین میں سے کوئی بھی برطانوی مفادات کا حامی نہ سمجھا جا سکتا تھا اور کم از کم دو پر (ایران اور خیوا) روسی ترغیب کے تحت حرکت کرنے کا شبہ تھا۔[2]

وسط ایشیائی ٹیپ پر شطرنج کا کھیل جلد ہی شروع ہو گیا۔ ستمبر ۱۸۳۶ء میں لارڈ آک لینڈ نے امیر کابل، دوست محمد کے ساتھ تعلقات

۱۔ متن انگریزی بزبان "برٹش اینڈ فارن سٹیٹ پیپرز" ۱۸۱۲ تا ۱۸۱۴، پارٹ ۲ جلد اوّل (لندن، رجوے، ۱۹۳۹ء) ص ص ۲۶۱ تا ۲۶۴

۲۔ سر ہنری ولسن "انگلینڈ رشیا ان دی ایسٹ" (لندن جے مرے ۱۸۷۵ء) باب تین

قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس نے ابتری کے دور کے بعد اپنا تخت دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ ابتری شاہ شجاع کو معزول کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی جس کے تحت ایلفنسٹن نے ۱۸۰۹ء میں معاہدہ کیا تھا۔ لارڈ آک لینڈ نے کیپٹن الیگزنڈر برنز کو اپنا ایلچی چنا۔ برنز ستمبر ۱۸۳۷ء میں کابل پہنچا۔ دو ماہ بعد شاہی روسی فوج کا کیپٹن واکووچ بھی کابل میں نمودار ہوا۔ واکووچ کی آمد نے برطانوی شکوک و شبہات کی تصدیق کر دی اور دونوں بڑی سلطنتوں کے درمیان ایک گمبھیر رسہ کشی شروع ہو گئی۔[1]

روسی طہران میں بھی اسی وقت حرکت میں آئے۔ شاہ کے روسی وزیر کاؤنٹ سائمونچ نے زور دیا کہ ایرانی ہرات پر قبضہ کر لیں پیشتر اس کے کہ خیوا یا کابل (جنہیں روسی بھی اس بات پر اکسا رہے تھے) ایسا کریں۔ جب یہ خبر لندن پہنچی تو وزیر اعظم لارڈ پامرسٹن نے طہران میں برطانوی وزیر، سرہنری ایلس کو حکم دیا کہ وہ روس پر انگریزی حکومت

---

[1] برنز، ایضاً، ص ص ۱۲۱؛ فوریر، جان ولیم کائی، ہسٹری آف دی وار ان افغانستان" ۳ جلدیں (لندن)؛ رچرڈ بینٹلی ۱۸۵۷ء) III واکووچ اور برنز کے درمیان توتو میں میں کا حال ایک تیسرے فریق کی نگاہ سے دیکھئے میسن ایضاً II روسی ذرائع پر مبنی پہلی جنگ افغان کے واقعات کے حال کے لئے دیکھئے فلپ ای موسلی "رشین پالیسی ان ایشیا ۱۸۳۸ تا ۱۸۳۹ء" دی سلاونک ریویو، چہارم (لندن، اپریل ۱۹۳۶ء) ص ص ۱ تا ۱۱

کے اعتراضات کو واضح کر دے جو ہرات میں تبدیلی قبضہ پر وارد ہوں گے۔ ایلس نے ایسا ہی کیا اور اصول مانرو[1] کی دوٹوک زبان میں سائمونیچ سے کہا "افغانستان کو ہماری سلطنتِ ہند کی سرحد سمجھنا ہوگا۔ کوئی یورپی قوم اس ملک کے ساتھ تجارتی یا سیاسی تعلقات رکھنے کی مجاز نہیں۔"[2]

یہ کابل میں سلسلہ جنبانی اور افغانستان میں کسی تیسرے فریق کی توسیع کی حمایت کے خلاف روس کو ایک صاف تنبیہ تھی۔ یوں انگریزوں نے یکطرفہ طور پر افغانستان کو اپنا ایک سرحدی علاقہ قرار دے دیا جبکہ ان کی سرحد واقعی طور پر بارہ سال بعد صرف دریائے سندھ کے پار پہنچی اور لارڈ کرزن نے پچھتر سال بعد آکسفورڈ میں اپنے مشہور رومانیز لیکچر میں کلاسیکی انداز میں باقاعدہ مارچ لینڈ تھیوری یعنی سرحدی علاقہ کا نظریہ پیش کیا۔[3] یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ الفاظ "یورپی قوم" سے ہندوستان اور اس کی آزاد ریاستیں اس ممانعت سے مستثنیٰ تھیں۔ اس میں ایک اور بنیادی برطانوی پالیسی بھی مضمر تھی

---

۱ - جیمز مانرو امریکہ کا پانچواں صدر تھا، ۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۵ء۔ اس نے ۱۸۲۳ء میں یورپی اقوام کو امریکہ میں مداخلت سے روک دیا اس کا نعرہ تھا "ہینڈز آف امریکہ" یعنی خبردار جو امریکہ کو ہاتھ لگایا۔ یہی اس کا اصول تھا (مترجم)

۲ - پارلیمنٹری پیپرز، ۱۸۳۹ء، جلد چالیس ویں، افغانستان، ۱۰

۳ - لارڈ کرزن "فرنٹیئرز" دی رومانیز لیکچر فار ۱۹۰۷ء آکسفورڈ: کلیرنڈن پریس ۱۹۰۷ء

جسے پرزور اور مسلسل افغان اعتراضات کے باوجود ۱۹۲۱ء تک جاری رکھا گیا یعنی یہ کہ اینگلو افغان تعلقات حکومت ہند کے توسط سے قائم رکھے جائیں نہ کہ براہ راست لندن اور کابل کے درمیان۔ شاہ ایران اس کھیل میں مضبوط ترین مہرہ تھا اور اسی نے اس سامراجی کشمکش میں پہلا بحران پیدا کیا۔ ۱۸۳۷ء کے موسم خزاں میں جب ابھی برنز کو افغان عزائم پر اثر ڈالنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا اور طہران میں ایلس کی تنبیہات کے باوجود محمد شاہ نے ہرات پر حملہ کر دیا۔ سائیمونچ نے ایلس کے اعلان کو نظر انداز کر دیا اور شاہ کو کھلم کھلا حمایت کا یقین دلایا۔ روسی کاؤنٹ بذاتِ خود محاصرہ کرنے والی فوج کے ساتھ گیا اور جنگی کارروائی کی پیش رفت میں اہم کردار ادا کیا۔

ہرات اس وقت افغانستان میں شامل تھا اس کا انحصار نقشہ نگار کی قومیت پر تھا۔ ایلس کا بیان واضح کرتا ہے کہ انگریز اسے افغانستان کا ہی حصہ سمجھتے تھے۔ لندن نے سائیمونچ کی شاہ نوازی پر سینٹ پیٹرز برگ سے احتجاج کیا[1] پامرسٹن نے کہا "وہ مسلمہ طور روس کے آلہ کار کی حیثیت سے کام کر رہا ہے اور افغانستان میں روسی اقدامات برطانوی ہند کی طرف آتی ہی براہ راست پیش قدمی ہیں

---

[1] - پارلیمنٹری پیپرز' ۱۸۳۹ء جلد ۴۰ یبسویں' افغانستان' ص ۱۷

جتنی کہ وہ اس وقت حتی المقدور کر سکتا ہے[1] سینٹ پیٹرز برگ نے سائیمونچ کے فعل سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور "شاہ کو کسی وقت بھی اور کسی حالت میں بھی جنگ جاری کرنے سے روکنے" کے احکامات کا حوالہ دیا۔ تاہم محاصرہ جاری رہا اور روسی سفارتکار ہرات کے سامنے شاہ کے کیمپ میں موجود رہا۔ انگریزوں نے اب ایک نیا راستہ آزمانے کا فیصلہ کر لیا، جون ۱۸۳۸ء میں ایک بحری مہم بمبئی سے خلیج فارس بھیجی گئی خرک پر قبضہ کر لیا گیا اور افواہیں پھیل گئیں کہ ایک برطانوی لشکر جرار شیراز کی طرف بڑھ رہا تھا اور اپنے راستے کے سارے علاقے کو تہہ و بالا کر رہا تھا۔ یہ افواہیں ہرات پہنچیں تو شاہ کے لشکر میں کھلبلی مچ گئی۔ قدرتی طور پر انگریزوں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ کو ایک دفعہ پھر مطلع کیا کہ ہرات یا افغانستان کے کسی بھی حصہ پر ایرانی قبضہ "انگلستان کے خلاف ایک مخالفانہ اقدام تصور کیا جائے گا، اور یہ کہ ایک بحری مہم پہلے ہی خلیج فارس میں پہنچ چکی تھی اور اگر شاہ چاہتا تھا کہ حکومت برطانیہ اپنی بحالی عزت کے لئے زیر عمل اقدامات سے باز رہے تو اسے فوراً ہرات سے واپس آجانا چاہیئے"[2]

---

[1] سر اے ڈبلیو وارڈ اور جی.پی. گوچ مدیران "دی کیمبرج ہسٹری آف برٹش فارن پالیسی" ۳ جلدیں کیمبرج دی یونیورسٹی پریس ۱۹۲۳ء جلد اول ص ۲۰۵

[2] کائی - ایضاً جلد اول، ص ص ۲۸۲ تا ۲۸۴

دو ماہ بعد سائیمونچ کی طوالت محاصرہ کے لئے کوششوں کے باوجود ایرانی فوج نے محاصرہ اٹھا لیا اور طہران واپس روانہ ہوئی۔ سائیمونچ کو شاہی روسی حکومت نے واپس بلا لیا اور اس کے جانشین کو ہدایت کی گئی کہ وہ شاہ کو مطلع کر دے کہ "روس افغان سرداروں کی خانہ جنگی یا ان کے خاندانی تنازعات میں کوئی حصہ نہ لے گا جو ہماری مداخلت پر کوئی حق نہیں رکھتے"۔[۲]

پہلی جنگ افغان ۱:

جب انگریز طہران میں سائیمونچ کے خلاف حیلہ آزمائی کر رہے تھے تو کابل میں ایک اور کھیل جاری تھا۔ جب الیگزنڈر برنز ۲۰ ستمبر ۱۸۳۷ء کو ایک "تجارتی" مشن کابل پہنچا تو امیر دوست محمد نے اس کا نہایت والہانہ استقبال کیا کیونکہ اسے ایرانیوں کے اپنے مشرق کی طرف حملوں کے خلاف برطانوی امداد کی امید تھی۔ اپنی آمد کے چار دن بعد برنز نے امیر کے ساتھ اپنی نجی ملاقات میں زور دیا کہ وہ ایرانیوں کو ہرات سے نکال باہر کرے اور افغانستان کے مغربی حلقوں پر اپنا رعب داب قائم کرے۔ دوست محمد ہرات تو واقعی چاہتا تھا لیکن انگریزوں کے ساتھ مشترکہ محاذ بنانے کے لئے جو قیمت وہ مانگتا

۲- پارلیمنٹری پیپرز، ۱۸۳۹ء، جلد چالیسویں، افغانستان، ص ۱۰۲

تھا وہ صرف مغربی سرحد پر ایرانیوں کے خلاف امداد ہی نہیں تھی بلکہ
اس کی مشرقی سرحد کا تحفظ بھی اس میں شامل تھا گویا وہ یہ ضمانت
چاہتا تھا کہ پشاور اور سرحدی اضلاع جو سکھوں نے قبضا لئے تھے
اسے بحال کئے جائیں۔

برنز نے مبہم سے وعدے کئے کہ بحالیٔ پشاور کے لئے رنجیت سنگھ
سے کوئی انتظام کیا جائے گا۔ اس کے جواب میں دوست محمد نے ایرانی
مہم کی سرگرمی سے مخالفت شروع کی۔ اس نے سردار قندھار پر
زور دیا کہ وہ ہرات پر حملہ میں شاہ ایران سے گٹھ جوڑ کرنے سے باز رہے
جس کا وہ منصوبہ بنا چکا تھا۔ اس نے مغرب کی طرف بھیجنے کے لئے لشکر
اندوزی شروع کی۔ اس خوشگوار فضا میں دربار میں یہ خبر پہنچی کہ ایک
روسی سفیر کابل کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔

کیپٹن واکوویچ ۱۹ دسمبر کو کابل میں داخل ہوا اور کاؤنٹ
سائیمونچ اور زارِ روس کی طرف سے خطوط پیش کئے۔ برنز فوراً ہی
اتنا سراسیمہ اور متفکر ہوا کہ اس نے لارڈ آک لینڈ کو ہدایات کے لئے
ایک فوری استدعا ارسال کی۔ اسے یہ ہدایات جنوری میں ملیں ان
میں ایک سخت ڈانٹ ڈپٹ بھی شامل تھی کہ اس نے دوست محمد کے
ساتھ پشاور کو زیر بحث لا کر اپنے اختیار سے تجاوز کیوں کیا؟۔
وائسرائے نے لکھا کہ سکھ ہندوستان میں انگریزوں
کے مضبوط ترین اتحادی تھے اور پشاور ان کا تھا اور انہی کا

رہے گا۔[1]

دریں اثنا ء وِ اکووِچ نے دوست محمد کو بتایا کہ ۵ ہزار کی روسی فوج ہرات پر افغان حملے میں مدد کے لیے تیار کھڑی تھی جو اس شہر کی تسخیر کے بعد سکھوں کے خلاف صف آرا ہوگی اور دوست محمد کو پشاور اور پنجاب کا کچھ حصہ واپس دلا دے گی۔[2] اگر یہ تجویز بہت عملی نہ تھی تو بھی اس لالچ کے باوجود دوست محمد برنز پر ہی زور دیتا رہا کہ ایک ایسا معاہدہ ہو جائے جس میں پشاور کی بحالی شامل ہو۔ موصولہ احکامات کے پیش نظر، برنز کچھ بھی نہ کر سکتا تھا ۲۱ مارچ ۱۸۳۸ء کو دوست محمد نے بنفسِ نفیس آک لینڈ کو مراسلہ لکھا کہ "افغانوں کی

۱۔ کائی، ایضاً جلد اول، ص ۲۰۲۔ اپنے ایک نجی خط میں برنز نے اس صورتحال کو یوں بیان کیا جس میں وہ گھر گیا تھا۔ "ہم یہاں ایک کھلبلی میں ہیں۔ ہرات محصور ہے اور ہتھیار ڈال سکتا ہے جس نے دوست محمد کو رنجیت سنگھ سے پنجہ آزمائی کے لئے سرمائے کی پیش کش کی ہے۔ میں اپنی آنکھوں اور کانوں کا اعتبار نہیں کرتا لیکن کیپٹن وِاکووچ (جو اس ایجنٹ کا نام ہے) یہاں ایک تین فٹ لمبے شاندار خط کے ساتھ پہنچا میں نے فوراً اپنے لارڈ کو ایک مکتوب بھیجا کہ وہ از راہِ کرم غور کرے کہ اس کے پیش روؤں نے اس کے لئے کیا کانٹے بوئے تھے اور اس کے بعد نہیں جانتا کہ کیا کچھ رونما ہو سکتا ہے اور اب روس اور ہمارے درمیان ورشی بدورشی دوڑ جاری تھی۔"

۲۔ موہن لال "مسلک دی لائف آف دی امیر دوست محمد خان آف کابل" ۲ جلدیں (لندن، لانگ مین، براؤن، گرین اینڈ لانگ مینز، ۱۸۴۶ء) جلد اول ص ۳۰۴

شکایات کا ازالہ کیا جائے اور انہیں تھوڑی سی تسلی اور قوت دی جائے۔"[42] ایسا لگتا ہے کہ وائسرائے اس کا جواب دینا پسند ہی نہ کرتا تھا چنانچہ ۲۶ راپریل ۱۸۳۸ء کو بے چارہ برنز مایوس اور شرمسار ہو کر کابل سے چلا گیا اور دوست محمد نے واکووچ کی جانب رجوع کیا۔

ظاہر ہے کہ واکووچ کابل میں کافی کامیاب رہا تھا۔ انگریز سفیر بے عزتی سے نکالا جا چکا تھا۔ روسی اثر و رسوخ قائم ہو گیا تھا اور برطانوی ہند کے خلاف آئندہ روسی افغان اتحاد کی بنیاد رکھ

---

[42]- کائی، ایضاً جلد اول ص ۲۰۸، کابل میں برنز کے مشن اور پہلی جنگ افغان کے ابتدائی وجوہات کے متعلق سرکاری خط و کتابت کا واضح اور مکمل ریکارڈ ملنا مشکل ہے۔ اس باب میں بیان شدہ سلسلۂ واقعات ماخوذ ہے برنز سے ایضاً، ص ص ۱۴۰۔ نوریؤ میین ایضاً، جلد سوم، کائی ایضاً جلد اول، ص ص ۱۹۶ ر تا ۲۱۰، پارلیمنٹری پیپرز ۱۸۵۹ء، جلد پچیسویں، افغانستان سے۔ کائی نے الزام لگایا ہے کہ آکلینڈ کی برپا کردہ جنگ کا جواز پیدا کرنے کے لئے ریکارڈ کو توڑ مروڑ، گھٹا بڑھا اور مسخ کر دیا گیا۔ اس نے اپنی کتاب میں "سر الیگزنڈر برنز کی غیر مطبوعہ خط و کتابت" سے بہت اقتباسات دیئے ہیں۔ ۱۸۵۹ء کے پارلیمنٹری پیپرز میں مزید مواد موجود ہے لیکن پھر بھی پوری خط و کتابت نہیں جس کا ایک حصہ ۱۸۳۹ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔

دی گئی تھی۔ لطف یہ ہے کہ اس سب کو روکنے کے لئے ہی انگریزوں نے ایران میں اتنا جوڑ توڑ کیا تھا۔

اس صورتحال کا سامنا کرتے ہوئے برطانوی پالیسی ایک دفعہ پھر طاقت کے استعمال پر اتر آئی۔ وہ خاص لمحہ جس میں دوست محمد کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا گیا واضح نہیں ہے۔ لیکن یہ غالباً اس کے فوراً بعد آیا جب برنز کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ پشاور سکھوں کے قبضے میں ہی رہے گا۔ یکم اکتوبر ۱۸۳۸ء کو لارڈ آک لینڈ نے گورنر جنرل ہند کی حیثیت سے متنازعہ فیہ شملہ مینی فیسٹو جاری کیا۔ اس فصیح و بلیغ دستاویز نے برطانوی ہند، مہاراجہ رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع (جو کابل کا ایک معزول امیر تھا اور اپنے چند ہزار مہاجر جاں نثاروں کے ساتھ ہندوستان میں مقیم تھا) کے درمیان ایک اتحاد کا اعلان کیا "تاکہ افغان لوگوں کی وحدت، آزادی اور خوشحالی بحال کی جا سکے اور تاج برطانیہ کے مقبوضات کے تحفظ کا سامان ہو سکے"۔[1] اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے شاہ شجاع کو تخت پر بحال کرنا تھا جس سے وہ قریباً بیس

---

[1] ۔ متن کے لئے کائی، ایضاً، جلد اول ۳۳۷ تا ۳۴۷، نیز "ٹریٹی آف ایلائنس اینڈ فرینڈشپ ایگزیکیوٹڈ بٹوین مہاراجہ رنجیت سنگھ اینڈ شاہ شجاع الملک ود دی ایپروبیشن آف اینڈ ان کنسرٹ ود دی برٹش گورنمنٹ، جون ۲۶، ۱۸۳۸ء"
[2] متن کے لئے دیکھئے (ایضاً۔ ص ص ۳۴۰ تا ۳۴۵)

سال پہلے محروم کیا جا چکا تھا۔

یہ سب جنگی تیاری ہرات پر روسی شہ کے سہارے ایرانی قبضے کو روکنے کے پیشِ نظر کی گئی۔ منشور کی تشہیر کے تھوڑے ہی عرصہ بعد آک لینڈ کو یہ خبر ملی کہ ہرات کا محاصرہ اٹھا لیا گیا تھا۔ برطانوی افغان اور سکھ افواج پہلے ہی فیروزپور میں جمع ہو رہی تھیں۔ اب کیا کرنا تھا؟

آک لینڈ نے جنگ کا راستہ اختیار کیا۔ ۸ نومبر کو اس نے اعلان کیا کہ ہرات سے شاہ ایران کی واپسی برطانوی ہند کی حکومت اور اس کے اتحادیوں کے لئے ایک صحیح وجہ تہنیت (تھا) لیکن وہ وائسرائے بحیثیت صیغۂ نمائب) پوری قوت سے ان اقدامات کو جاری رکھے گا جن کا اعلان کیا جا چکا ہے تاکہ افغانستان کے مشرقی صوبوں میں ایک مخالفانہ طاقت کی بجائے ایک دوستانہ نعم البدل مل سکے[1]۔

نومبر ۱۸۳۸ء کے دوران لشکر سندھ، فیروزپور میں جمع ہوا۔ یہ بنگال آرمی کے تمام حصوں کے ۹۵۰۰ آدمیوں پر مشتمل تھا اور ایک یورپی رجمنٹ کے کچھ حصے بھی اس میں شامل تھے۔ ۲۵ ہزار کی امدادی نفری اس کے علاوہ تھی۔ شاہ شجاع ۶ ہزار افغان لیویز کے ساتھ شامل ہوا۔ سکھوں کا ایک بڑا دستہ رنجیت سنگھ کے ماتحت لاہور سے آیا اور رنجیت سنگھ گورنر جنرل آک لینڈ کے ساتھ ۲۹ اور ۳۰ نومبر کو

---

[1]- ایضاً، جلد اوّل، ص ص ۳۸۳ تا ۳۸۴

تمام افواج کی ایک عظیم الشان پریڈ کے دوران معائنہ سٹینڈ پر رہا۔ چند دن بعد رنجیت سنگھ اور اس کے سکھ یہ وعدہ کرکے واپس پنجاب چلے گئے کہ وہ کابل پر حملے کے لئے خیبر کے راستے ایک فوج بھیج دیں گے (جس کی تعداد نہیں بتائی گئی)۔

لشکر سندھ کو حرکت میں لانے کے لئے ۳۰ ہزار اونٹ درکار تھے لیکن یہ جلد ہی قندھار براستہ کوئٹہ روانہ ہو گیا۔ راستے میں بمبئی آرمی کا قریباً ۳ ہزار آدمیوں کا ایک بریگیڈ بھی آ ملا جو کراچی کے راستے آیا تھا۔ لشکر درہ بولان سے گزرا اور ساڑھے چار ماہ کے سفر کے بعد اس نے ۲۵ اپریل ۱۸۳۹ء کو قندھار پر قبضہ کر لیا۔ پھر یہ شمال کی طرف مڑا۔ جولائی کے آخری ہفتے میں اس نے غزنی میں متعینہ فوج کو موت کے گھاٹ اتارا اور ۷ اگست کو قریباً بلا جنگ کابل میں داخل ہو گیا۔ دوست محمد پہلے ہی رخصت ہونے والے روسی مشن کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ شاہ شجاع کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ سکھ خوش تھے کہ انگریزوں نے ہی سارا کام کر دیا اور وہ کبھی فوج کی صورت میں شامل نہ ہوئے البتہ ایک علامتی سا دستہ کابل پر قبضہ کے بعد برطانوی افواج سے آملا۔ ایک کم و بیش مستقل قابض فوج کابل میں چھوڑی گئی تاکہ وہ مخالف رعایا کے خلاف شاہ شجاع کی مدد کر سکے، اور اس سے وعدوں کی تعمیل کروائے۔ اس کے دربار میں بھی ایک سرکاری مشن قائم کر دیا گیا۔

ایک سال تک سب ٹھیک رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روسیوں

کو افغانستان سے مؤثر ترین ممکنہ ذریعہ سے نکال دیا گیا تھا یعنی پیشگی برطانوی فوجی قبضہ کے ذریعے۔ پھر اگست ۱۸۴۰ء میں پورے افغانستان میں علمِ بغاوت بلند ہوا۔ ایک ماہ کے اندر اندر کابل محاصرے میں آ گیا اور برطانوی گیریژن کو لڑ کر ہی باہر نکلنے کی کوشش کرنا پڑی۔ کابل افواج میں سے شاید ہی کوئی ہندوستان واپس آ سکا۔ ایلگزنڈر برنز جو مشن کا انتظام سنبھالنے والا تھا راستے میں ہی مارا گیا۔ جنوری ۱۸۴۱ء تک انگریز اور شاہ شجاع ملک سے بیک بینی و دو گوش نکال دیئے گئے۔

۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۲ء میں ابتری پھیلی رہی۔ لارڈ آک لینڈ نے اس انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی عزت بحال کرنے کے لئے ایک برق رفتار دستہ کابل بھیجا۔ اس نے کابل کا بڑا بازار نذرِ آتش کر دیا لیکن مسلسل حملے اور ہراس کی وجہ سے فوراً ہی واپس آ گیا۔

جنوری ۱۸۴۳ء میں دوست محمد شمال سے واپس آیا جہاں وہ جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا اور اپنے ملک کا دوبارہ اقتدار سنبھال لیا "امیرِ اعظم" واپس اپنے تخت پر آیا تو وہ انگریزوں کے خلاف سرتاپا نفرت سے بھرا ہوا تھا ایک ایسی نفرت جس میں اس کے لوگ بھی شریک اور جسے کابل کا لبہ مسلسل جگائے رکھتا تھا۔

جنگ کی اہمیت!

ایک فوجی مشن کے طور پہ افغانستان میں ۱۸۳۹-۴۰ء میں

برطانوی مہم آزمائی ناکام رہی ۔ بہت سے ناقدین تو یہ کہتے ہیں کہ یہ سرے سے ہی مستحسن نہ تھا۔ تقریباً تمام متعلقہ حضرات تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ہرات کا محاصرہ اٹھنے کے بعد غیر ضروری ہو گیا تھا۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ کامیاب رہا۔ برطانوی اموات بہت زیادہ تھیں ۔ برطانوی سلطنت میں ایک گز بھر علاقے کا بھی اضافہ نہ ہو سکا اور انگریزوں سے افغانوں کی گہری اور تلخ نفرت کی بنیاد پڑ گئی جو آج تک جاری ہے، لیکن اگرچہ لینڈ کی خواہش ہو یا نہ ہو جنگ کے کچھ پہلو ضرور ایسے تھے جو "عظیم مقابلہ" کے لئے سازگار تھے۔ اس کی وجہ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ روس کے ایک اہم عصر واقعہ کی طرف ایک لمحہ کے لئے توجہ دی جائے ۔

۱۸۳۹ء میں جب انگریز ابھی کابل میں محفوظ تھے ۵ ہزار آدمیوں کی ایک روسی مہم بمعہ بائیس بڑی توپیں اور ۱۰ ہزار اونٹ اورن برگ سے روانہ ہوئی تاکہ خیوا کے ازبکوں کے قبضے سے روسی غلاموں کو آزاد کرایا جا سکے۔ اورن برگ اس وقت شاہی روسی حکومت کی مشرقی ترین چوکی تھا۔ خیوا سے اس کا فاصلہ قریباً وہی تھا جو کراچی کا کابل سے ہے (قریباً ایک ہزار میل)

ہر ایک جانتا تھا کہ ازبک خوانین قیدیوں سے کیسا سلوک کرتے ہیں اور انگریز بھی یہ ماننے کے لئے تیار تھے کہ مہم کا جواز موجود تھا لیکن یہ خیال بھی ناگزیر تھا کہ یہ شاید مقابلے کی چوٹ تھی اور انگریز کابل میں بے حد خوفزدہ ہو گئے۔ منصوبہ بنایا گیا کہ سکھوں کو

عبور کرکے بخارا کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا جائے جس پر دوست محمد کا

کسی وقت قبضہ تھا اور جہاں وہ بھاگ کر گیا تھا۔

لیکن کارروائی سے پہلے ہی یہ خبر مل گئی کہ جنرل پیروفسکی کے

تحت آنیوالی روسی فوج سٹیپ کی آب وہوا اور نوعیت علاقہ کی وجہ سے

بری طرح تہس نہس ہوگئی تھی اور بھاری نقصانات اٹھا کر اورن برگ

واپس چلی گئی تھی۔ کابل میں نبضیں معمول پر آگئیں اور سحوں پار کا منصوبہ

ترک کر دیا گیا۔[1]

خیوا پر روسی پیش قدمی کا محرک سرکاری طور پر کبھی بیان نہیں

کیا گیا، لیکن یہ سمجھنا نامناسب نہ ہوگا کہ روس اس جوابی مظاہرہ سے یہ

ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ بھی وسط ایشیا کے اندر تک ایسے ہی اور اتنی

ہی پھرتی سے ایک فوج بھیج سکتا ہے، جیسے برطانیہ، پیروفسکی کی کوشش

بری طرح ناکام ہوئی اور اس کا نتیجہ بالکل الٹ نکلا لیکن عجیب بات

ہے کہ فوجی ناکامی ایک سیاسی کامیابی پر منتج ہوئی کیوں کہ ازبکوں

نے روسی قیدی بعد میں رہا کر دیئے۔[2]

---

[1] راولنسن، ایضاً ص ص ۱۵۱ تا ۱۵۲

[2] خیوا کے شمال میں اُست اُرت صحرا کے برفانی طوفانوں کی وجہ سے پیروفسکی

کی فوج کی تباہی کے بعد روسی سیاسی نفوذ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ یہ کم از کم جزوی کامیاب

رہا کیونکہ خانِ خیوا اور شاہی روسی حکومت کے درمیان ۱۸۴۲ء میں ایک

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"عظیم مقابلہ" کے نقطۂ نظر سے ۱۸۳۹ - ۴۱ء کے عسکری جوڑ توڑ کی اہمیت یہ تھی کہ برطانیہ نے دو دفعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہندوستان میں اپنے اڈے سے اٹھ کر وسط ایشیاء میں معرکے جیتنے کا اہل تھا، جبکہ روسی اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کر سکے۔ یہ حقیقت کہ انگریز اس مقبوضہ علاقے کو سنبھال نہ سکے۔ مقابلے کے ابتدائی مرحلے میں اتنی اہم نہ تھی۔ یہ ظاہر تھا کہ "سلطنت کی ڈیوڑھی" بشرط ضرورت بچائی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف روسیوں نے کابل میں اپنی سفارتی کامیابی سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک قازق کو بھی یحوں کے جنوب میں بھیجے بغیر انگریزوں کو وسط ایشیا میں ورطۂ اضطراب میں ڈال سکتے تھے اور انہیں مقامی آبادی کے ساتھ متصادم کرا سکتے تھے۔

افغانستان میں طاقت کے اس پہلے مقابلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے بیس سال تک حالات جوں کے توں رہے۔ اس عرصے میں روس نے خوانین کے خلاف کوئی علانیہ حرکت نہیں کی اور کابل سے بھی پوری احتیاط سے دامن بچاتے رہے۔ ان حالات میں انگریزوں نے بھی کوئی تعرّض

(بقیہ حاشیہ)

معاہدۂ امن و اتحاد کیا گیا (ڈبلیو۔ کے۔ فریزر ٹیلر۔ "افغانستان۔ اے سٹڈی آف پولیٹیکل ڈیویلپمنٹس ان سنٹرل ایشیا" لندن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۲ء ص ۱۲۱)

نہ کیا حالانکہ دوست محمد کابل میں ایک برطانوی سفیر کو قبول کرنے سے مسلسل انکار کرتا رہا، اور اس نے سرحد پر پہاڑی قبائل کے دباؤ کو کم کرنے کے لئے حکومت ہند سے تعاون کے سلسلے میں اپنی دیرینہ نار. ضامندی قائم رکھی۔ لارڈ لارنس کے تحت برطانوی پالیسی کو "تساہل استادانہ" کہا گیا اور انگلستان کی کنزرویٹو پارٹی ان الفاظ کو ہمیشہ حقارت کے ساتھ استعمال کرتی رہی۔

دوسری جنگ افغان!

۱۸۶۸ء میں وسط ایشیائی کش مکش پر مہر سکوت کے ٹوٹنے کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اس سال شاہی روسی حکومت نے لڑائی کے بغیر سمرقند پر اپنی حاکمیت قائم کر لی جس کا کسی وقت امیر بخارا دعویدار تھا۔ دوست محمد ۱۸۶۳ء میں راہئ ملک عدم ہو چکا تھا اور حسب معمول انتشار کا دور دورہ ہوا حتیٰ کہ ۱۸۷۰ء میں اس کے بیٹے شیر علی نے تخت کابل پر جلوہ افروز ہونے میں کامیابی حاصل کر لی۔

اس وقت تک برطانیہ نے ہندوستان کے اکثر باقی ماندہ آزاد حصے بھی قبضے لئے تھے اور برصغیر اسی جغرافیائی اور انتظامی حالت میں آ چکا تھا جیسا کہ یہ قریب قریب آزادی اور بٹوارے کے وقت ۱۹۴۷ء میں تھا۔

لارڈ لارنس جیسا نرم ترین اور محتاط ترین وائسرائے بھی اپنے

عہد کے آخری سال میں حکومت انگلستان کو یہ سفارش کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ ایک قطعی پالیسی وضع کی جائے اور وسط ایشیا میں روس کے ساتھ ایک باہمی طور پر اطمینان بخش سرحدوں کے سلسلے میں تصفیہ پر توجہ دی جائے[1]۔ انگلستان کی انگریزی سیاست بھی ایک نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔

فروری ۱۸۶۸ء میں ڈسرائیلی لارڈ ڈربی کی جگہ وزیر اعظم بنا اور زیادہ سرپھرا لارڈ میو لارڈ لارنس کی جگہ وائسرائے مقرر کیا گیا جس سے "تساہل استادانہ" کی پالیسی منسوب تھی۔

لیکن بلیشتر اس کے کہ قدامت پسند حکومت وسط ایشیا میں فارورڈ پالیسی کے نفاذ پر پوری توجہ دیتی یہ دسمبر ۱۸۶۸ء میں گلیڈسٹون کی وزارت سے مغلوب ہو گئی۔ برسر اقتدار آنے کے قریباً جلد ہی بعد لبرل حکومت نے لارنس کی تجویز پر عمل کیا اور سینٹ پیٹرز برگ سے استدعا کی کہ وسط ایشیا میں ایک ایسے غیر جانبدار علاقے پر اتفاق کر لیا جائے جس میں دونوں میں سے کوئی طاقت بھی نفوذ نہ کرے۔

روسی ردعمل خوشگوار تھا اور وزیر خارجہ گورچاکوف نے رائے پیش کی کہ افغانستان ایک مثالی "آزاد خطہ" ہو سکتا تھا۔ اس نے ازراہ کرم مزید کہا کہ شاہی حکومت افغانستان سے کوئی سروکار نہ رکھنے کا ارادہ رکھتی

۱۔ وارڈ اور گوچ، ایضاً جلد سوم، ص ۷۳

تھی۔[1] ممکن ہے روسی تجویز حکومت لندن کو قابلِ قبول ہوتی کیونکہ اس میں لاتعلقی کا کھلم کھلا اور غیر مشروط اظہار تھا جو برطانیہ کی افغان پالیسی کا بنیادی اصول تھا۔ لیکن بظاہر لارڈ میو نے اسے کلکتہ میں ٹھکرا دیا۔[2] بہرکیف برطانوی وزیر خارجہ لارڈ کلیرنڈن نے جوابی تجویز پیش کی کہ دریائے آمو (جیحون) کو ایسا خط سمجھا جائے جسے کوئی طاقت کے ساتھ عبور نہ کرے۔

سہ سالہ تبادلۂ مراسلات کے دوران انگریزوں نے افغان بقر کی دور افتادہ سرحد سے پرے ایک غیر جانبدارانہ خطے کا خیال ترک کر دیا اور ایک ایسا خط تقسیم قبول کر لیا جو کم از کم بقر کے دور افتادہ

---

[1] ۔ برٹش اینڈ فارن سٹیٹ پیپرز، جلد تریسٹھ (۷۲-۱۸۷۳ تا ۱۸۷۳ء) (لندن رجوے، ۱۸۷۹ء) ص ۶۵۹۔

[2] ۔ سرکاری ذرائع میں میو کے اعتراضات کا کوئی ریکارڈ نہیں لیکن روسی تجویز پر میو کا اعتراض ولیم ہیبرٹن کی "اینگلو رشین ریلیشنز کنسرننگ افغانستان ۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء الی نوائس سٹڈیز اِن سوشل سائنسز" جلد ۲۱، نمبر ۳، ص ۲۴۲ (اربانہ یونیورسٹی آف الی نوائس ۱۹۳۷ء) میں بیان ہوا ہے۔ ہیبرٹن نے اسے الفنسن سے منسوب کیا ہے۔ ایضاً ص ۲۰۹) لیکن رالنسن خود بھی اس نقطہ پر واضح نہیں ہے۔ اغلب یہ ہے کہ کلیرنڈن کی جوابی تجویز میو کی خواہش کے مطابق تھی یعنی جیحوں کو خطِ فاصل بنانا۔ کلیرنڈن کی تجویز " برٹش اینڈ سٹیٹ پیپرز جلد ۶۳ (۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۹ء) ص ص ۶۶۰ تا ۶۶۱ پر موجود ہے۔

سرے پر تھا۔ آخرکار ۱۸۷۳ء کا معاہدہ کیا گیا اور جیحوں کو افغانستان کی ہنوز بے فیصلہ شمالی سرحد کی بنیاد قرار دیا گیا۔[1] اس کے اہم نتائج مندرجہ ذیل تھے: (۱) افغان اور روسی علاقے کے درمیان دریائے جیحوں بطور خط فاصل پر اتفاق (۲) روس کے دائرہ اثر سے افغانستان کا رسمی اخراج اور (۳) برطانیہ کا اتفاق کہ روس بالآخر جیحوں کے شمال کی تمام خانیوں کو جذب کر سکتا ہے جن میں وہ علاقے بھی شامل ہوں گے جو کسی وقت امیر کابل کی حاکمیت میں رہے تھے۔ اس معاہدے میں نہ انگریزوں نہ روسیوں نے امیر سے کوئی مشورہ کیا۔

یہ تھی صورتحال جب ۱۸۷۴ء میں گلیڈسٹون کی لبرل حکومت کا بوریا بستر لپیٹا گیا۔ ڈسرائیلی دوبارہ وزیراعظم بنا۔ لارڈ ڈربی وزیر خارجہ مقرر ہوا اور لارڈ لٹن وائسرائے ہند۔ نئی ٹیم گلیڈسٹون کی صابرانہ سفارتکاری کے درمیانے سے نتائج سے قطعاً مطمئن نہ تھی۔ اس نے فارورڈ پالیسی سے اپنی عقیدت کو صیغہ راز میں نہیں رکھا اور نہ ہی طاقت کے استعمال کے عزم کو، اگر حصول مقصد اس کا متقاضی ہو۔ اس مقصد کو ایک حمایتی نے یوں بیان کیا۔ "وسط ایشیا میں اپنی تقدیر کے

۱۔ ۱۸۷۳ء کا معاہدہ اصل میں صرف آخری تبادلہ مراسلات ہے اکثر خطوط کا تبادلہ برطانیہ سے لارڈ کلیرنڈن اور لارڈ گرینوائیل اور روس سے شہزادہ گورچاکوف کے درمیان ہوا۔ یہ برٹش اینڈ فارن سٹیٹ پیپرز، جلد ۶۳ (۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۳ء) میں موجود ہے

حصول کے لئے روسی خطرے اور گستاخی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ"۔[1]

لٹن کی ہندوستان میں آمد کے بعد تناؤ تیزی سے بڑھنے لگا۔ روسیوں نے امیر شیر علی سے مراسلت شروع کی۔ لٹن نے افغان امیر کو ۱۸۷۶ء میں پشاور میں ایک کانفرنس پر آمادہ کر لیا لیکن کابل میں ایک برطانوی مشن بھیجنے پر اس کی رضامندی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ شیر علی نے برملا اعتراف کیا کہ وہ روسیوں سے خط و کتابت کر رہا تھا اور اس نے اسے بند کرنے سے انکار کر دیا۔[2]

جب شیر علی ایک سال سے زیادہ برطانوی مطالبے سے سرگردانی کرتا رہا تو لٹن نے کابل کو مشن بھیجنے کا فیصلہ کر لیا باوجود اس کے کہ افغان امیر بارہا اعلان کر چکا تھا کہ وہ اسے خوش آمدید کہنے سے انکار کرے گا۔ افغان سپاہیوں نے ۲۵ اگست ۱۸۷۸ء کو جنرل چیمبرلین کے تحت جانے والے مشن کو درہ خیبر سے واپس بھیج دیا۔[3]

وسط ایشیا میں بڑھتی ہوئی سرگرمی اصل میں روسو ترکش جنگ میں برطانوی مداخلت پر روسی غیظ و غضب کا نتیجہ تھی۔ برطانوی حکومت میں اس بات پر اختلاف پیدا ہو گیا کہ خیبر کی سبکی کا کیا کیا جائے۔ ڈسرائیلی '' سالسبری (جو وزیر خارجہ بن چکا تھا) ابھی ابھی برلن میں مذاکرات

۱۔ آر۔ ایس۔ جیمس "ان ماسٹرلی اِن ایکٹیویٹی اِن سنٹرل ایشیا" (لندن، ازمنگی ۱۹۷۲ء) ص ۱۷

۲۔ پارلیمنٹری پیپرز ۱۸۸۱ء، جلد ۹۸، سنٹرل ایشیا، نمبر ۱

۳۔ وارڈ اور گوچ، ایضاً جلد سوم، ص ۸۵

سے فارغ ہوئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر برطانیہ نے اس وقت وسط ایشیا میں حملہ کیا تو روس ترکی سے اپنی فوجوں کے جبری انخلاء پر پہلے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا لہٰذا وہ فوراً شعلہ زن ہو جائے گا۔ اس لئے ڈسرائیلی اور سالسبری شیر علی کو بہلانا پھسلانا ہی بہتر سمجھتے تھے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ لارڈ لٹن جسے ڈسرائیلی اور سالسبری نے خاص طور پر اپنی فارورڈ پالیسی پہ عملدرآمد کے لئے چنا تھا اور لارڈ گرین بروک جو سالسبری کی بجائے سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا بنا تھا۔ دونو بضد تھے کہ شیر علی کو فوراً سبق سکھانا ضروری تھا بالآخر انڈیا آفس کے لوگ جیت گئے۔ کابل کو الٹی میٹم بھیجا گیا کہ فوراً واقعہ خیبر پہ معذرت کی جائے اور برطانوی مشن قبول کرنے سے اتفاق کیا جائے ورنہ شیر علی کو دشمن قرار دے دیا جائے گا۔ الٹی میٹم ۲ ، نومبر ۸ ، ۱۸ء کو بھیجا گیا اور ۲۰ ، نومبر کو اس کی میعاد ختم ہو گئی☆ شیر علی نے تلافی کرنے کی کوشش کی لیکن انگریزوں نے اس کی مساعی کو نظر انداز کر دیا اور دوسری جنگ افغان شروع ہو گئی۔

پہلی جنگ افغان کی طرح برطانوی فوج کثیر تعداد میں تھی۔ اس میں بہت سے خدمت گاروں کے علاوہ قریباً ۲۵ ، ہزار جنگجو تھے اور یہ تین دستوں میں افغانستان میں داخل ہوئی۔ ایک خیبر سے ، ایک کرم سے

☆ وارڈ اور گوچ ، ایضاً ، جلد سوم ۵۸ تا ۴۰۶

اور ایک درّہ بولان سے۔ چالیس سال پہلے کے پیشروؤں کے برعکس یہ صرف برطانوی سپاہیوں پر مشتمل تھی اور ایسے علاقے سے روانہ ہوئی جو براہ راست قبضے میں تھا۔ جلال آباد، قندھار اور پیوار کوتل پر چند دنوں میں قبضہ کر لیا گیا۔ شیر علی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شمال کی طرف ترکستان کو بھاگ گیا۔ اس کے ساتھ وہی سلوک ہوا۔ اسے کوئی مدد نہ دی گئی اور اسے کہہ دیا گیا کہ وہ واپس گھر جائے اور انگریزوں سے دوستی کر لے۔

در بدر امیر جنوب کی طرف مڑا اور مزار شریف تک آیا لیکن اس کا کبھی پتہ نہ چل سکے گا کہ کیا وہ دوستی کرنے آیا تھا یا مزاحمت کرنے۔ کیونکہ وہ وہیں ۲۱، فروری ۱۸۷۹ء کو انتقال کر گیا۔ اس کا بیٹا یعقوب خان انگریزوں سے ابواب کابل پر ملا اور اس نے تمام برطانوی مطالبات مان لیے[1]۔ ان میں اہم ترین یہ تھے کہ کابل میں مستقل برطانوی مشن کی قبولیت، تمام افغان امور خارجہ کا برطانوی حکومت کے توسط سے انتظام و انصرام، بیرونی ملکوں سے کسی قسم کا معاہدہ نہ کرنے کی یقین دہانی اور برطانوی مرضی کے بغیر کسی سے جنگ نہ کرنے کا عزم۔ کرّم، پشین اور سبی جو جنوب میں آمد و رفت کے لیے مستعمل تھے برطانوی ہند کو دے دیے گئے اور

---

[1]۔ ایضاً جلد سوم، ۸۷، جنگ کی مفصل کہانی سڈنی۔ ایچ۔ شیڈبولٹ کی "دی افغان کیمپینز آف ۸۰-۱۸۷۸ء" دو جلدیں (لندن، ایس لو۔ مارسٹن، سرلے اور ریوِنگٹن ۱۸۸۲ء) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ہمہ جہتی اہم خیبر اپنی پوری لمبائی کے ساتھ برطانوی تصرف میں آ گیا۔[1]
سر لوئیس کاوگنری کے تحت ایک برطانوی مشن جلد ہی کابل پہنچ گیا۔
شیر علی فوت ہو چکا تھا اور اس دفعہ کوئی معزول امیر شمال میں آتشِ فتنہ
بھڑکانے کے لئے موجود نہ تھا۔ قندھار اور جلال آباد مکمل طور پر خالی کر دئیے
گئے اور کابل میں صرف ایک علامتی فوج رکھی گئی۔ جنگ جو اتنی تیز کامیاب
اور کم خرچ معلوم ہوتی تھی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو کاوگنری اور اس کے رفقاء کار باغی افغان
سپاہیوں اور ایک ہجوم نے قتل کر دیئے جنہیں یعقوب خان نہ روک سکا
یا جنہیں روکنا نہ چاہتا تھا۔ برطانوی افواج جو ابھی تک قریباً ویسی
ہی منظم تھیں دوبارہ مغرب کی طرف مڑ گئیں اور حیرت انگیز رفتار
کے ساتھ سارے افغانستان پر مسلط ہو گئیں۔ لارڈ رابرٹس ایک برق رفتار
دستے کو لئے ہوئے ۱۲ اکتوبر کو کابل پہنچا اور امارت سے یعقوب
خان کا استعفیٰ قبول کر لیا۔ بدنصیب یعقوب کو ہندوستان جلا وطن کر
دیا گیا اور بقول اس کے وہ "امیر افغانستان کی بجائے انگریزی کیمپ میں
ایک گھسیارا بننا پسند کرے گا"۔ عملی طور پر رابرٹس اس کی بجائے "آقا" ئے

---

[1] معاہدہ گنڈمک جس پر ۲۶ مئی ۱۸۷۹ء کو دستخط ہوئے۔ متن کے لئے دیکھئے
پارلیمنٹری پیپرز جلد ۵۶، ۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۰ء، افغانستان ص ص
۳ تا ۵

افغانستان" بن گیا۔[1]

انگلستان میں ایک قدامت پسند حکومت برسر اقتدار تھی جو ایک مضبوط فارورڈ پالیسی کی علمبردار تھی۔ افغانستان مکمل طور پر برطانوی فوجی قبضہ میں آ چکا تھا۔ بہت سے حلقوں میں یہ سوچا جا رہا تھا کہ برطانیہ نصف افغانستان کو "سائنسی سرحد" کے اندر شامل کر کے سلطنت ہند کے کونوں کو برابر کرے گا جس کے لئے قدامت پسند بہت عرصے سے چلا رہے تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پہلی پالیسی جس کی کوشش کی گئی تقسیم کی تھی۔ کابل، قندھار، ہرات اور دیگر صوبے ہندوستان کے نمونے پر آزاد مقامی ریاستوں میں بدل دیئے جاتے۔ وہ کسی بھی سردار کو دی جا سکتی تھیں جو اتنا مضبوط ہو کہ اپنی ریاست قائم رکھ سکے لیکن اتنا مضبوط بھی نہ ہو کہ دوسروں کو اپنے ساتھ ملا لے۔

دسمبر ۱۸۷۹ء تک رابرٹس کا تخت غیر آرام دہ ہوتا جا رہا تھا۔ ۱۸۴۰ء کے آثار پھر ہویدا ہو رہے تھے۔ کابل کے اردگرد قبائلی بغاوتیں شروع ہوئیں اور تیزی سے پھیل گئیں۔ چند ہفتوں کے اندر اندر ایک درجن سردار اپنی اپنی جگہ انگریزوں کے خلاف ہمہ جہتی جنگ

---

[1] لیڈی بیٹی بیلفور "دی ہسٹری آف لارڈ لٹن ز انڈین ایڈمنسٹریشن ۱۸۷۶ء تا ۱۸۸۰ء" (لندن لانگ مین، گرین اینڈ کو ۱۸۹۹ء) ص ص ۳۶۶ تا ۳۶۹۔ رابرٹس کو واقعی لارڈ رابرٹس آف قندھار کا خطاب ملا تھا۔

لڑ رہے تھے۔ فروری ۱۸۸۰ء تک وائسرائے لٹن اس خلفشار سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ اس نے کابل میں مشن کے نئے سربراہ، پیپل گرفن کو لکھا کہ کابل پہنچتے ہی اس کا پہلا کام یہ ہوگا کہ "اس چوہے دان سے نکلنے کا راستہ بنایا جائے"۔ اس کے لئے لٹن نے چار اہم نکات تحریر کئے (۱) سابقہ امیر کو بحال نہ کرنا (۲) مغربی افغانستان کو شمال مغربی افغانستان سے مستقل طور پر علیحدہ کر دینا (غالباً ہرات اور کابل کی علیحدگی) (۳) موخرالذکر کا نہ الحاق نہ اس پر مستقل قبضہ اور (۴) کسی بھی حاکم کو تسلیم کر لینے پر رضامندی جسے افغان برطانوی افواج کے انخلاء پر مذاکرات کا اختیار دیں[1]

مارچ کے پہلے ہفتے میں مطلوبہ حکمران کے شخص کا سراغ مل گیا۔ کابل میں خبر آئی کہ شیر علی کا ایک بھتیجا، عبدالرحمان خان جو پچھلے دس سال سے روسی ترکستان میں رہ رہا تھا شمالی افغانستان میں واقع بلخ میں آ گیا تھا۔ یہ افواہ دُور دور تک، پھیل گئی کہ عبدالرحمان کو روسیوں نے واپس ملک میں بھیجا تھا تاکہ وہ انگریزوں کی خطرناک صورتحال سے فائدہ اٹھا سکے۔ پھر بھی گرفن نے اس کے ساتھ گفت و شنید شروع کی اور چار ماہ بعد ۲۲ جولائی کو عبدالرحمان کو کابل کے دربار میں امیر بنا دیا گیا۔ عبدالرحمان نے لٹن کے اہم نکات سے کوئی سروکار نہ رکھا بلکہ

---

[1] بیلفور، ایضاً ص ۴۰۸۔

نو یافتہ ملک میں کاروبار سلطنت شروع کرنے سے بھی انکار کر دیا جب تک برطانوی مشن کابل سے نہ چلا جائے۔ لیکن وہ اس پر رضامند ہو گیا کہ باہمی رضامندی سے برطانوی حکومت کا کوئی مسلمان ایجنٹ کابل میں تعینات کیا جا سکتا تھا تاکہ رابطہ میں آسانی رہے"۔[1]

ایک سال کے اندر اندر عبدالرحمان نے پورا افغانستان اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور ابھی رخصت ہونے والی برطانوی فوج شہر کی دیواروں سے اوجھل بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے قندھار سے سدوزئی حکمران کو نکال باہر کیا۔ معاہدہ گندمک ختم ہو گیا۔ یہی حشر لٹن کے نظریہ کا ہوا جس کے تحت وہ افغانستان کے ٹکڑے کر کے اس پر قابو رکھنا چاہتا تھا۔[2]

بہت سے انگریزوں نے دوسری جنگ افغان کو بھی پہلی کی طرح ناکام قرار دیا۔ کابل میں اب بھی کوئی تسلی بخش مشن نہ تھا۔ بہت تھوڑے سے علاقہ کا ہی سلطنت میں اضافہ ہوا (جتنا بھی اضافہ ہوا وہ بعد میں قیمتی ثابت ہوا) تخت افغانستان پر ایک آزاد اور مضبوط

---

[1] - وارڈ اور گوچ، ایضاً، جلد سوم، ص ۹۰

[2] - اس انسان کی دلکش سوانح کے لیے جس نے "خود غیر مہذب رہتے ہوئے اپنے لوگوں کو مہذب بنایا" دیکھیے میر منشی سلطان محمد خان کی تالیف کردہ "دی لائف آف امیر عبدالرحمان" ۲ جلدیں (لندن، جے۔ مرے ۱۹۰۰ء)

حکمران بیٹھ گیا۔ برطانوی لشکر نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا تھا کہ وہ افغانستان کو فتح کر سکتے لیکن قبضہ برقرار رکھنے کے لئے اس کی اہلیت کافی حد تک مشکوک ہو گئی۔

پہلی جنگ افغان کی طرح ۸۰-۱۸۷۸ء کا برطانوی جوڑ توڑ سینٹ پیٹرزبرگ میں تشویش کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ غالباً جوابی مظاہرہ کے طور پر ترکستان کے کمانڈر انچیف میجر جنرل ایل۔ این۔ سوبی لیف نے ۸۱-۱۸۸۰ء کی سردی میں ٹکے ترکمانوں کے خلاف ایک مہم کی کمان کی۔ سوبی لیف ترکمانوں میں "خونیں چشم" مشہور تھا اور اس نے ۲۰ ہزار آدمی، عورتیں اور بچے مار دیئے اور ترکمان قلعوں کو زیر کر لیا لیکن روسی فوج کو آب و ہوا اور زمینی نوعیت سے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔[1]

غالباً جنرل سوبی لیف کی مہم سے کئی گنا اہم تر اس کی سہ جلدی کتاب تھی جس میں اس نے افغانستان میں برطانوی مہم کا تجزیہ کیا۔ یہ جلدیں الگ الگ ۱۸۸۰ء، ۱۸۸۱ء اور ۱۸۸۲ء میں سینٹ پیٹرزبرگ سے شائع کی گئیں اور ان میں ہندوستان اور وسط ایشیا میں برطانوی پالیسی اور اس کی کامیابیوں کا مذاق اڑایا گیا۔ تاہم سوبی لیف نے

۱۔ سوبی لیف کی مہم کے حال کے لئے دیکھئے چارلس مارون "دی آئی وٹنس اکاؤنٹ آف دی ڈزاسٹرس رشین کمپین اگینسٹ دی اخال ٹکے ترکمانز" لندن۔ ڈبلیو، ایچ۔ ایلن، ۱۸۸۰ء

دیکھا اور لکھا کہ انگریز دس دنوں کے اندر اندر ۴۶۰۰۰ لاکھ آدمیوں (یہ ماننا ہوگا کہ ان میں سے ۸۰ فیصد خدمتگار تھے)، ۱۵۱۹۷ گھوڑوں، ۹۲۲۷ بیلوں، ۱۳۸ توپوں اور ۴۲۲۷۰۰۰ پاؤنڈ سامان جنگ کو حرکت میں لے آئے اور انہیں شمالی ہندوستان میں نقطہ ہائے ارتکاز پر جمع کر لیا۔[1]

سرحد کے نقطۂ نظر سے دوسری جنگ افغان کا اہم ترین نتیجہ درہ ہائے خیبر، کرم اور بولان پر برطانوی قبضہ تھا جسے وہ معاہدہ گنڈمک سے بچا لائے تھے۔

پنجدہ :-

گو دوسری جنگ افغان کے خاتمے کے بعد سے افغانستان اور برطانوی ہند کے آئندہ تعلقات انتہائی غیر تسلی بخش رہے تاہم "عظیم مقابلہ" میں ایک اہم حقیقت واضح طور پر منکشف ہوگئی۔ جہاں تک روس کا تعلق تھا برطانیہ بغیر علاقے میں بڑا عنصر رہتا تھا جو دونوں سلطنتوں کو جدا کرتا تھا۔

مسئلہ اب یہ تھا کہ افغانستان کی حدود کی نشاندہی کر دی جائے

---

[1] - ایل۔ این سوبالیف: دی اینگلو افغان سٹرگل" مترجمہ ڈبلیو۔ ای اگوان (کلکتہ سپرنٹنڈنٹ آف گورمنٹ پرنٹنگ ۱۸۸۵ء)، ص ۴۸

۱۸۸۴ء میں شاہی روسی فوجوں نے مرو نخلستان پر قبضہ کر لیا جو افغانستان کے جنگی طور پر اہم لیکن غیر واضح شمال مغربی کونے کے عین شمال میں واقع تھا۔[1] برطانیہ کے پاس روسی کارروائی کے خلاف شکایت کے لئے کوئی ٹھوس بنیاد نہ تھی کیونکہ کسی انگریز مدبر کو نہ کبھی وقت ملا اور نہ اس نے کبھی تکلیف کی کہ وہ مرو کو افغانستان کا حصہ بنائے۔ تاہم سینٹ پیٹرز برگ سے فوراً استدعا کی گئی کہ وہ مرو کے مزعومہ روسی عزائم کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔[2] جواب آنے سے پہلے ہی وسط ایشیاء سے نئی خبریں ملیں۔

بتایا گیا کہ روسی مرو سے مغربی افغانستان کے ضلع پنجدہ میں اپنے پاؤں پھیلا رہے تھے ۱۸۷۳ء کے معاہدہ کے مطابق پنجدہ کا علاقہ قطعی طور پر امیر افغانستان کی قلمرو کا حصہ تھا۔ سینٹ پیٹرز برگ کے نام لارڈ گرین وائیل کے مراسلات کا لب و لہجہ تیز ہوتا گیا۔ برطانیہ کے اصرار پر افغانستان کی شمالی اور مغربی حدود کی نشاندہی کے لئے ایک

---

[1] - اس سے انگلستان میں بہت خوف و ہراس پھیلا جسے ڈیوک آف آرگائیل نے ”مرو ریس نیس یا مروئیت کا شدید مظاہرہ“ قرار دیا۔ دیکھئے جارج ڈگلس کیمبیل ڈیوک آف آرگائیل ”دی افغان فرنٹیئر“ ۲ جلدیں، لندن سٹراہان ۱۸۷۹ء جلد دوم، ص ۳۱۰۔

[2] - پارلیمنٹری پیپرز ۸۵-۱۸۸۴ء جلد ۸۷، سنٹرل ایشیا نمبر ۱۹، ص ۱۷۔

باؤنڈری کمیشن قائم کر دیا گیا[1]۔ ۱۸۸۴ء کے آخر میں مشہور سرحدی انتظام کار، سر پیٹر لمسڈن جسے کمیشن میں برطانوی مندوب مقرر کیا گیا تھا، سرخس پہنچ گیا۔ جہاں کمیشن کے ارکین نے مل کر کام کرنا تھا۔ لمسڈن نے وہاں کوئی روسی رفیق کار نہ پایا لیکن اسے پچاس میل جنوب میں عین افغان علاقے کے اندر قازق پکٹیں ضرور ملیں۔ لمسڈن کو ۸۵-۱۸۸۴ء کی سردی میں سرخس میں طویل انتظار کرنا پڑا جبکہ لندن اور سینٹ پیٹرز برگ کے درمیان مراسلات کا تانتا بندھا رہا۔ صورتحال بہتر نہ ہوئی تو وکٹوریہ نے خود مارچ ۱۸۸۵ء میں الیگزنڈر کو تار ارسال کی کہ وسط ایشیا میں مسلح تصادم کو روکا جائے[2]۔

۳۰ مارچ ۱۸۸۵ء کو روسی افواج نے پنجدہ پر قبضہ کر لیا اور افغان مدافعت کاروں کو بھگا دیا جن میں سے ۵۰۰ کھیت رہے۔ یہ خبر سینٹ پیٹرزبرگ پہنچی تو برطانوی سفیر تھارنٹن نے کہا "جنگ ناگزیر ہے"۔[3] پارلیمنٹ میں گلیڈسٹون نے ۱۱ ملین پاؤنڈ کا قرض مانگا جس میں سے ½۶ ملین براہ راست جنگی تیاریوں کے لئے درکار تھے

۱- ایضاً

۲- ایضاً نیز ہیبرٹن، ایضاً، ص ۵۳

۳- لارڈ ایڈمنڈ فرٹز مارس "دی لائف آف گرینوائیل' جارج لیونسن گورنر سیکنڈ ارل آف گرینوائیل" ۲ جلدیں (لندن جے مرے، ۱۹۰۵ء) جلد دوم ص ۱۹۰

جو پنجدہ واقعہ کے بعد ضروری ہو گئی تھیں۔[1]

واقعہ پنجدہ کے وقت امیر عبدالرحمان وائسرائے لارڈ ڈفرن کے ساتھ راولپنڈی میں ایک کانفرنس میں شریک تھا۔ امیر اپنے علاقے پر مزید روسی دست درازی سے خوفزدہ تھا اور اپنے علاقے کے شمال مغربی کونے میں صورت حال کو مستحکم کرنے کے لئے اتنا ہی مضطرب تھا جتنے انگریز۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ دو بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ میں پھنس جائے اور برطانوی افواج کو دوبارہ اپنے ملک میں دیکھے۔ اس نے لارڈ ڈفرن سے کہا کہ پنجدہ روسیوں کے تصرف میں رہنے دیا جائے بشرطیکہ درہ ذوالفقار جو وسطی افغانستان کی سطوح مرتفع کی حربیاتی کلید تھا۔ افغانوں کے ہاتھ میں رہے۔ اس سے سینٹ پیٹرز برگ نے اتفاق کیا اور جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔[2]

۱۰ ستمبر ۱۸۸۵ء کو ایک پروٹوکول پر دستخط کئے گئے جس نے علاقہ پنجدہ میں روسی افغان سرحد کی نشاندہی کر دی۔ جولائی ۱۸۸۷ء میں ستمبر کے پروٹوکول کے تحت ایک باؤنڈری کمیشن نے کام شروع کیا

۱۔ وارڈا ور گوُچ، ایضاً جلد سوم، ص ۱۹۰

۲۔ عبدالرحمان، ایضاً، جلد اول، ص ۲۸۵۔ پارلیمنٹری پیپرز ۸۵-۱۸۸۴ء جلد ۸۷، سنٹرل ایشیا، ص ۲۳۹

کمیشن نے جون ۱۸۸۸ء میں اپنا کام پورا کر لیا اور اسی سال ۱۲ جون کو قطعی سرحدات کی تصدیق کر دی گئی[1]

سرحد پامیر:

اس کے بعد "عظیم مقابلہ" کی دلچسپی کا مرکز مشرق اور شمال کی طرف منتقل ہو گیا۔ کشمیر، چترال اور گلگت کی ہندوستانی ریاستیں بدخشاں اور واخان کے افغان صوبے اور بخارا کی زبردست روس حکومت سب عظیم سلسلۂ پامیر میں ملتی تھیں۔ اب تک اونچی اونچی چوٹیاں اس علاقے میں کسی اہم سرگرمی کے راستے میں حائل رہی تھیں لیکن یہ سب پر واضح تھا کہ "مقابلہ" ختم ہونے سے پہلے انگریزوں کو یہاں روسی چستی و مستعدی کا سامنا کرنا ہوگا۔

۱۸۹۱ء کے موسم خزاں میں ایک برطانوی محقق، کیپٹن ینگ ہسبنڈ، وادیٔ واخان میں ایک روسی جماعت سے دوچار ہوا۔ اب واخان بالائی سیحوں کا ایک معاون ہے اور پامیر عظیم کے عین جنوب اور ہمالیہ کے مشرقی سرے کے شمال میں ایک تنگ وادی سے گزرتا ہے۔ ینگ ہسبنڈ کو روسیوں نے وہاں سے نکال دیا اور زور سے کہا کہ وہ اس علاقے کو اپنا سمجھتے تھے[2] عین اس وقت یہ اطلاعات

---

[1] پارلیمنٹری پیپرز ۱۸۸۵ء، جلد ۷۷، سنٹرل ایشیا، نمبر ۱ ص ص ۲۴ تا ۳

[2] سر فرینک ای ینگ ہسبنڈ، دی ہارٹ آف اے کانٹی نینٹ" (لندن ۱۸۹۶ء) مرتبہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھی ملیں کہ روسی پارٹیاں چترال اور کشمیر کے نلک بوس پہاڑوں کے گرد بھی پھر رہی تھیں۔ گلگت کی ایک ذیلی ریاست، ہنزہ کے حکمران نے روس کی حمایت کا اعلان کیا تو ایک برطانوی مہم اس کا دماغ سیدھا کرنے کے لئے اس کے سر پر پہنچ گئی۔

لندن اور سینٹ پیٹرز برگ کے درمیان دوبارہ مذاکرات شروع ہو گئے۔ طرفین کے اخبارات میں ایک لمبی چوڑی جیھ بیھ اور سفارتی سطح پر لین دین کے بعد بالآخر مارچ ۱۸۹۵ء میں روس اور افغانستان کے درمیان سرحد پامیر پہ اتفاق ہو گیا۔ افغانستانی سرحدات کا آخری حصہ بھی متعین ہو گیا اور دو بڑی سلطنتوں کے درمیان

(بقیہ حاشیہ)

۱۸۹۶ء) ص ص ۱۷۱-۲-۲۴ معاملہ بہترین وکٹوریائی روایت کے مطابق کیا گیا بقول ینگ ہسبنڈ "کیمپ چھوڑتے ہوئے میں نے گورکھا محافظ سے روسی افسر کو سلامی دلوائی اس کے بعد ہم جدا ہو گئے اور کپتان گروم چیف نے مجھ سے کہا کہ ہم پھر ملیں گے بصورت امن سینٹ پیٹرز برگ میں یا بصورت جنگ ہندوستانی سرحد پہ اور کوئی بھی صورت ہو میں ایک پرتپاک استقبال کا یقین رکھ سکتا تھا۔ میں ایک روسی افسر سے اس ملاقات سے بہت لطف اندوز ہوا۔ ہم اور روسی حریف ہیں لیکن مجھے یقین ہے روسی اور انگریز افسر فرداً فرداً ایک دوسرے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بجائے ان اقوام کے افراد کے جو ان کے حریف نہیں ہیں ہم دونوں ایک بڑے مقابلے میں شریک ہیں اور ہم اس حقیقت کو چھپا کر ذرا بھر بھی اس سے مختلف نہیں ہو سکتے۔"

وسط ایشیائی کش مکش ختم ہو گئی۔

انگریزوں کو اب افغانستان کے خارجی معاملات پر بلا شرکت غیرے قابو حاصل ہو گیا جو ایک واضح بفر سٹیٹ بن گیا اور جسے روسیوں نے اپنے حلقہ اثر سے باہر قرار دیا۔ باقی سب کچھ روسیوں کا ہو گیا۔ "عظیم مقابلہ" کا خطرناک ترین مرحلہ گزر گیا۔

صدی کے موڑ پر روسیوں نے آخری کوشش کی۔ یہ اصل میں ایک پرانے سوال کا اعادہ تھا جو کشمکش کے ابتدائی مراحل میں بہت نمایاں تھا یعنی افغانستان کے خارجی تعلقات پر خالص برطانوی تصرف۔ ۶ فروری ۱۹۰۰ء کو جب انگریز افریقہ میں الجھے ہوئے تھے۔ روس نے اعلان کیا کہ "سرحدی نظم و نسق کے معاملات کے بارے میں روس اور افغانستان کے درمیان تعلقات کی بحالی ناگزیر ہے۔"[۱۷]

ایک لمبی سفارتی جنگ شروع ہو گئی۔ روس نے سیحوں کے شمال میں چھوٹے چھوٹے پیمانے پر فوجی نقل و حرکت کے ذریعے دباؤ ڈالنے کی کمزور سی کوشش کی۔ حکومت ہند نے وائسرائے لارڈ کرزن کے تحت نیا صوبہ سرحد قائم کیا اور سرحد میں ایک نئی مختلف الجہت فوجی تنظیم

۱۷- گریٹ برٹن، مدیران جی پی گوچ اور ہیرلڈ ٹیمپرلی "برٹش ڈاکومنٹس آن دی اوریجنز آف دی وار، ۱۸۹۸ء تا ۱۹۱۴ء، ۱۰ جلدیں (لندن، ہز مجسٹیز سٹیشنری آفس ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۸ء) جلد اول ص ۳۰۷ -

ظہور پذیر ہوگئی۔

لیکن خارجی دنیا کے واقعات نے اس آخری راؤنڈ کے نتیجہ کا فیصلہ کر دیا۔ افریقہ میں برطانوی فتح کے بعد یہ واقعات انگریزوں کے لئے سازگار بن گئے، ۱۹۰۴ء میں اینگلو جاپانی معاہدۂ اتحاد پر دستخط ہوئے، ۱۹۰۵ء میں معاہدہ میں ترمیم کی گئی جس میں ہندوستان کے صوبہ سرحد کا خصوصی ذکر کیا گیا اور باہمی دفاع کی اصلی دفعہ کی بجائے "جو دو یا زیادہ اقوام کے حملے کی صورت میں کارگر تھی۔ یہ دفعہ شامل کی گئی کہ کسی بھی طاقت کے خلاف متحدہ کارروائی کی جائے گی جو شریکان دستخط پر حملہ کرے گی۔

روس مزید الگ تھلگ ہوگیا جب فرانس جو یورپ میں زار کا واحد بڑا اتحادی تھا، ۱۹۰۴ء میں برطانیہ کے ساتھ اتحاد ثلاثہ میں شامل ہوگیا۔ ۵-۱۹۰۴ء کی روسی جاپانی جنگ میں شاہی روسی حکومت کا یہ دابین روسی وقار کو مزید لے ڈوبا۔

بالآخر ۳۱ اگست ۱۹۰۷ء کو سینٹ پیٹرز برگ میں "ایران، افغانستان اور تبت کے متعلق کنونشن" پر دستخط ہوگئے۔ یہاں بھی برطانیہ نے اپنی مضبوط حیثیت کی بناء پر ذرا سی رعایت دیگر مغز اپنے ہی پاس رکھا۔ کنونشن نے روس کو یہ حق دے دیا کہ وہ مقامی سرحدی معاملات براہ راست افغان سرحدی افسروں کے ساتھ طے کر سکتا تھا۔ نیز اسے تجارتی اور دیگر سہولیات بھی دے دی گئیں۔

(روسی عبارات)[1] لیکن اہم نکتہ واضح طور پہ بیان کر دیا گیا جس کا متن گورچ ٹمپیرلی (ایضاً جلد چہارم ص ص ۶۱۸ تا ۶۲۰) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ روس پہلی جنگ افغان سے بھی پہلے سے افغانستان میں برطانیہ کی تجارتی اجارہ داری کے متعلق مسلسل شکایت کرتا رہا تھا لیکن دونوں سلطنتوں کو انیسویں صدی کے نصف اوّل میں وسط ایشیا کی منڈیوں کے متعلق خواہ کتنی بھی غلط فہمیاں کیوں نہ ہوں، ۱۹۰۰ء تک دونوں بخوبی آگاہ ہو چکی تھیں کہ یہ علاقہ تجارتی لحاظ سے بنجر اور غیر امید افزا تھا۔

---

[1] - تعجب ہے کہ مصنف نے اسی باب میں ایک دفعہ پہلے اور یہاں پھر تین اقتباسات خالص روسی زبان میں بلا انگریزی ترجمہ دے دیئے ہیں اور فٹ نوٹ میں بھی صرف گورچ ٹمپرلی میں متن کا حوالہ دے دیا۔ بہر کیف مفہوم قدرے روکھا اقتباسات لیکن زیادہ تر فٹ نوٹ سے واضح ہو جاتا ہے جسے اصل ترجمہ میں ہی شامل کر دیا گیا ہے (مترجم)

(۱۱) باب ہفتم

بیسویں صدی میں

برطانوی نظم ونسق

کرزن کا نیا نظام!

۱۸۴۹ء سے صدی کے آخر تک سرحد میں ارباب نظم ونسق حکومت پنجاب کے سامنے جوابدہ تھے سوائے بعض سرحدیار معاملات کے، جب وہ حکومت پنجاب کے توسط سے حکومت ہند کے سامنے جوابدہ ہو جاتے تھے۔

لارڈ کرزن وائسرائے نے ۱۹۰۱ء میں سرحد میں جو نیا نظام نافذ کیا۔ اس نے نظم ونسق کو کافی حد تک آسان کر دیا۔ تمام اختیار ایک آدمی کے ہاتھ میں دے دیا گیا جسے صوبہ سرحد کا چیف کمشنر اور ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل کہا جاتا تھا اس وقت کی ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق بحیثیت ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل وہ قبائلی پولیٹیکل افسران کے ساتھ براہ راست ربط وضبط کے ذریعے قبائل کے ساتھ سیاسی تعلقات کا مہتمم ہے اور بحیثیت چیف کمشنر وہ پنجاب سے لئے گئے زیر انتظام اضلاع میں

وہ فرائض ادا کرتا ہے جو حکومت پنجاب نے چھوڑے ہیں۔[1] تنظیم نو کے تحت پنجاب سے اضلاع کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسماعیلخان، ہزارہ اور پشاور علیحدہ کر دیئے گئے (آخرالذکر بعد میں پشاور اور مردان ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا) کرزن ایک ہم آہنگ صوبہ قائم کرنے میں اتنی دلچسپی رکھتا تھا کہ ہزارہ جس کی آبادی زیادہ تر غیر پٹھان تھی اس کی اصلی سکیم میں شامل نہ تھا۔ عیسٰے خیل کی واحد تحصیل جس میں مخلوط النسل پشتو نہ بولنے والے لوگ آباد تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے اوپر کے سندھ پار علاقوں میں سے پنجاب کے ساتھ رہ گئی۔

تنظیم نو نے پانچ سرحد پار مالاکنڈ علاقوں یعنی دیر، سوات اور چترال کے علاوہ خیبر، کرم، ٹوچی اور وانا، جن میں ماسوائے دیگراں سرحد کے زیادہ سے زیادہ پٹھان حصے شامل ہوں، کو ایک رسمی شکل بھی دے دی۔[2] اب تک قبائلی علاقے کا انتظام ایک کھچڑی تھا۔ درے کو کھلا رکھنے کے لئے ۱۸۷۸ء میں خیبر کے لئے ایک خصوصی پولٹیکل ایجنسی قائم کی گئی تھی ۱۸۹۲ء میں ایک ایسی ہی ایجنسی کرم کے

۱۔ گریٹ برٹین، انڈیا آفس" اسٹیٹمنٹ ایگزیبٹنگ دی مورل اینڈ میٹریل پراگریس اینڈ کنڈیشن آف انڈیا ۱۹۰۱-۲ء" (لنڈن ہز مجسٹیز سٹیشنری آفس، ۱۹۰۲)

۲۔ ایضاً، ص ۵۵

لئے وجود میں لائی گئی گو اسے ۱۸۷۹ء سے عموماً برطانوی ہند کا ایک حصّہ تصور کیا جاتا تھا جب افغانوں نے اسے انگریزوں کے حوالے کیا تھا، مالاکنڈ، وانا اور ٹوچی کی ایجنسیاں ڈیورنڈ لائن کی نشاندہی کے سلسلے میں ۹۶ - ۱۸۹۵ء میں قائم کی گئی تھیں۔ عجیب و غریب طور پر مالاکنڈ ایجنسی براہ راست حکومت ہند کے ماتحت تھی جبکہ وانا اور ٹوچی ایجنسیاں حکومت پنجاب کی حکم بردار تھیں۔

پہلا چیف کمشنر اور ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل لیفٹیننٹ کرنل ایچ - اے - ڈین تھا۔ اس کا عملہ مندرجہ ذیل پر مشتمل تھا (۱) آئی ایس آئی افسران (۲) حکومت ہند اور حکومت پنجاب کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے فوجی افسران (۳) پراونشل سول سرونٹس (۴) ماتحت سول سروس کے افسران (۵) ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹس پولیس اور (۶) ٹیکنیکل اسامیوں کے لئے خاص طور پر بھرتی شدہ افسران۔ پہلی دونوں قسموں کے لئے جو اسامیاں مخصوص کی گئیں وہ یہ تھیں، چیف کمشنر[1] اس کا سیکرٹری، اسسٹنٹ سیکرٹری اور اس کے پرسنل اسسٹنٹ، ریونیو کمشنر اور ریونیو سیکرٹری، ڈپٹی کمشنر اور پولیٹیکل ایجنٹ صاحبان، جوڈیشل کمشنر اور ڈویژنل سیشن اور ڈسٹرکٹ جج صاحبان۔[1]

---

[1]- این ڈبلیو ایف پی (انڈیا) گورنمنٹ ایڈمنسٹریشن رپورٹ آف دی این ڈبلیو ایف پراونس ۱۹۰۱ء (پشاور: گورنمنٹ پریس، ۱۹۰۲ء) ص ۱۳

عملے میں فوجی آدمیوں کی حسب معمول بھاری فیصدی سے بھی زیادہ تقرریاں اس عام رجحان کا تسلسل تھیں جس کے مطابق آخری عشرے میں فوج نظم ونسق میں روز افزوں اہم کردار ادا کرنے لگی تھی۔ اس کو کرزن کے اس نظریے سے مزید تقویت ملی کہ سرحد ایک بہترین ٹریننگ گراؤنڈ مہیا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں خود پٹھانوں کا جنگجو کردار بھی اس کا ممد ومعاون ہوا۔ پشاور میں نظم ونسق کا قیام کم از کم اس وقت کے لحاظ سے ۲½ لاکھ روپے کی درمیانی سی رقم پر ممکن ہوا۔

سیاسی ارتقاء کے لحاظ سے نیا نظام کئی باتوں میں پیچھے کی طرف ایک قدم تھا۔ پنجاب سے لئے جانیوالے پانچوں ضلعے ۱۸۷۰ء کے ایک ایکٹ آف پارلیمنٹ کے تحت "شیڈولڈ اضلاع" تھے لہٰذا وہ ہمیشہ انتظامی احکامات کا پابند رہا تھا، لیکن پنجاب میں ۱۸۹۷ء سے ایک قانون ساز کونسل قائم تھی جس کے ذریعے ہلکی سی عوامی نمائندگی مشمولہ بہ شیڈولڈ اضلاع ممکن تھی۔ تغیر نے یہ اور اس قسم کے دیگر فوائد ختم کر دیئے اور سرحدی اضلاع واپس اسی صورتحال میں چلے گئے جس کا سامنا پورے پنجاب نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے فوراً بعد کیا تھا۔

ایک لیفٹیننٹ گورنر اور کونسل کی بجائے انہیں ایک چیف کمشنر اور ایک ڈپٹی کمشنر ملے۔ پنجاب کے چیف کورٹ کے بدلے انہیں ایک جوڈیشیل کمشنر اور ایک ریونیو کمشنر ملا۔ پنجاب قانون ساز کونسل

کے منظور کردہ قوانین کی بجائے ان پر انتظامی احکامات سے حکومت ہونے لگی جنہیں گورنر جنرل یا چیف کمشنر کے اختیار پر جاری کیا جاتا تھا۔[1] یہ صحیح ہے کہ سیاسی فوائد جو اہلِ سرحد نے کھو دیئے معمولی تھے اور قبائلی علاقے کے باسیوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بہرحال نمائندہ حکومت اس وقت ہندوستان میں بہت ابتدائی شکل میں موجود تھی اور پٹھان جنہوں نے کبھی اپنے آپ کو ہندوستان کا حصہ نہ سمجھا تھا اپنا ایک علیحدہ صوبہ پا کر غالباً متفکر ہونے سے زیادہ نازاں تھے کیونکہ اس نے ان کے جداگانہ احساس کو تقویت دی تھی اور قانونی شکل دے دی تھی۔

لیکن صوبے کی ہندو آبادی نے اس نئے اقدام کی سخت مخالفت کی اور وہ بعد کے کئی عشروں تک پنجاب کے ساتھ دوبارہ انضمام پر زور دیتے رہے،[2] لیکن کرزن کی اس سے بھی زیادہ متنازعہ تقسیم بنگال کے برعکس سرحد میں نیا نظام ۱۹۵۵ء میں ہی ختم ہو سکا جب حکومت پاکستان نے سرحد، پنجاب، سندھ، بہاولپور، خیرپور اور بلوچستان کو

---

[1] - نئے صوبہ کے قیام کے قانون کے سیکشن ۲۳ ۱۲ میں صرف یہ درج تھا "صوبہ سرحد کے لئے قانون ساز ادارے صرف دو ہیں گورنر جنرل کی قانون ساز کونسل اور گورنر جنرل اِن ایگزیکٹیو کونسل، دیکھئے این ڈی ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۹۰۱ء ص ۳۵"

[2] - گورنمنٹ آف انڈیا "رپورٹ آف دی این ڈبلیو ایف پی انکوائری کمیٹی" (دہلی گورنمنٹ سنٹرل پریس، ۱۹۲۴ء) ص ۲

ایک واحد صوبہ مغربی پاکستان میں ضم کر دیا۔

نیا صوبہ ۱۔ ۱

اپنے جغرافیائی محل وقوع کے علاوہ نیا صوبہ کئی باتوں میں ہندوستان میں اپنی مثال آپ تھا۔ یہ اقتصادی طور پر خسارے کا علاقہ تھا لیکن ان بہت سے سماجی و اقتصادی اسقام سے پاک تھا جو برطانوی ہند کے نظام درو بست کے قدیم تر حصوں کا روگ بنے ہوئے تھے۔ انیسویں صدی کے برطانوی بندوبست ہائے اراضی نے زمینی ملکیتوں کے روایتی ڈھانچے کو کسی حد تک اتھل پتھل کر دیا تھا لیکن پھر بھی چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی خاصی بڑی تعداد اور بہت سے مستقل مزارعین موجود تھے جن کے حقوق بموجب رواج و قانون محفوظ تھے۔

اس کے ساتھ ہی سرحد میں انگریزوں کو جو گھمبیر مسئلہ درپیش تھا وہ تھا تحفظ کا، سکھوں اور پامیر کے پرے سے روسی خطرہ کے خلاف تحفظ اور بہت سے قانون شکن باشندوں اور پہاڑیوں کے وحشیانہ تباہیوں کے خلاف نئے صوبے کا تحفظ۔

برطانوی ہند کے اکثر دوسرے حصوں میں کسی مخصوص صوبے کا مطالبہ اس میں وقتاً فوقتاً جاری ہونے والی اصلاحات سے کیا جا سکتا ہے، جو ایک ایسی حکومت سے نافذ ہورہی تھیں جو بادلِ ناخواستہ لیکن روز بروز بتدریج حکومت خود اختیاری کے عوامی مطالبے کے سامنے جھکتی

جا رہی تھی لیکن جہاں تک سرحد کا تعلق ہے پورے دور کا قصہ تصرف کے لئے جدوجہد کے گرد گھومتا ہے۔ ایک ایسا تصرف جو کبھی مکمل طور پر قائم نہ ہو سکا اور ایک ایسی جدوجہد جو ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے رخصت ہونے پر ہی ختم ہو سکی۔ اس سیاق و سباق میں برطانوی حکومت کے تحت سرحد کی سیاسی تاریخ اصلاحات کی بجائے کہیں زیادہ استبدادی و استیصالی شکنجے میں سے لٹک رہی ہے۔

فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز:-

فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کا پہلا مجموعہ ۱۸۷۲ء میں نافذ کیا گیا، ۱۸۸۷ء میں اس پر نظر ثانی کی گئی۔ ۱۹۰۱ء میں پنجاب سے علیحدگی کے بعد سرحد میں تیسرا مجموعہ نافذ ہوا۔ یہ قواعد و ضوابط کرزن نے صوبے اور قبائلی علاقے کے درمیان مخصوص تعلقات کی روشنی میں تیار کروائے تھے اور یہ پورے برطانوی دورِ حکومت میں زیرِ عمل رہے۔ (سوائے چند مختصر اوقات معطلی کے) اور آج بھی ترمیم شدہ شکل میں پاکستان میں جاری و ساری ہیں۔

منجملہ دیگر دفعات کے ۱۹۰۱ء کے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز (دستاویز) مندرجہ ذیل پر مشتمل ہیں۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات کو ڈپٹی کمشنر کے مقرر کردہ جرگوں کے سپرد کرنا، سزا کے طور پر قبائل کی ناکہ بندی، اجتماعی جرمانے، بعض حالات میں نئے دیہات کے قیام کی ممانعت

قائم شدہ دیہات کو امن و امان کے تقاضوں کے تحت ختم یا منتقل کرنا، انسدادِ جرم کے لیے پیشگی قید و بند اور دیہاتی جرموں کو منضبط کرنا۔

فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز میں شامل دو تصورات (جو نئے ہرگز نہیں ہیں) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلا مقدمے کی جرگائی سماعت تھی جسے انگریز عموماً پٹھان روایت کا تسلسل بتاتے تھے لیکن بعض باتوں میں یہ انگریزوں کی طرف سے اعتراف تھا کہ ان کا انیسویں صدی کا طرزِ انصاف ناکافی تھا بالخصوص اس لئے کہ پٹھان اس کا کوئی لحاظ نہ کرتے تھے۔ جرگہ بلاشک وشبہ ایک پٹھان ادارہ تھا لیکن ایف سی آر کے تحت جو اس کی تشکیل تھی وہ اصل کے برعکس تھی۔

اولاً اس کے اراکین ضلع کا ڈپٹی کمشنر مقرر کرتا تھا اور وہ عموماً اس وقت جب اسے یقین ہوتا تھا کہ وہ عام عدالتوں کے ذریعے اثباتِ جرم حاصل نہ کر سکے گا۔ شہادت کے عام اصول معطل کر دیئے جاتے تھے اگر ڈپٹی کمشنر چار یا زیادہ رکنی جرگے کے فیصلے کو پسند نہیں کرتا تھا تو وہ مزید تفتیش کے ریمانڈ دے دیتا تھا یا ایک دوسرے جرگے کے سپرد کر دیتا تھا۔ بہر حال جرگے کا فیصلہ بنیادی طور پر ایک سفارش کی صورت میں ہوتا تھا اور بریت یا سزا دہی اور حکم ڈپٹی کمشنر کی طرف سے ایک ڈگری کی صورت میں جاری ہوتا تھا۔

ایف سی آر کے تحت اثباتِ جرم اور سزا کے خلاف اپیل کا حق نہ تھا گو چیف کمشنر کو اختیار تھا کہ وہ دیوانی اور بعض فوجداری

مقدمے میں جرگے کے کسی مقرر کردہ رکن پر اعتراض کا حق رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ ضمانت حاصل ہوتی تھی کہ جرم کی نوعیت کا لحاظ کئے بغیر زیادہ سے زیادہ سزا چودہ سال قید یا مشقت اور برطانوی ہند میں دوبارہ داخلے پر پابندی تھی۔

عمومی طور پر ایف سی آر صوبے پر بھی لاگو تھا اور قبائلی علاقہ پر بھی۔ لیکن آخر الذکر کا تعلق زیادہ تر اجتماعی ذمہ داری کے تصور کی عملی تشکل سے تھا جسے کوک اور ایڈورڈز نے نصف صدی پہلے پیش کیا تھا۔[1]

اگر کوئی سرحدی قبیلہ یا اس کا کوئی سیکشن یا ایسے قبیلے کے افراد برطانوی حکومت یا برطانوی ہند کے باشندوں کے خلاف مخالفانہ یا غیر دوستانہ کارروائی کریں تو ایسی صورت میں ڈپٹی کمشنر، کمشنر سے پیشگی منظوری لے کر بذریعہ تحریری حکم دے سکتا تھا کہ

ا۔ ایسے قبیلے کے تمام یا بعض افراد کو پکڑ لیا جائے خواہ وہ کہیں ملیں اور ان کی تمام یا دستیاب جائیداد پر قبضہ کر لیا جائے۔

ب۔ ایسی جائیداد یا اشخاص کو سرکاری تحویل میں رکھا جائے۔

ج۔ ایسی جائیداد کو ضبط کر لیا جائے اور بعینہٖ منظوری کے ساتھ اعلان عام کے ذریعے۔

۱۔ دیکھئے باب پنجم سابقہ۔

د ۔ قبیلے کے تمام یا بعض افراد کو برطانوی ہند میں آنے سے روک دیا جائے اور

ہ ۔ برطانوی ہند کی حدود کے اندر رہنے والے تمام یا بعض افراد کو ایسے قبیلے یا اس کے سیکشن یا اس کے بعض افراد سے خط و کتابت یا رابطے سے منع کر دیا جائے، خواہ وہ کسی عام یا خاص قسم یا قسموں کا ہو۔

یہ قانون متحرک فوجی دستہ یا قائم شدہ چھاؤنی (جس کا انحصار اس بات پر تھا کہ اس وقت سرحدی پالیسی کا کونسا مکتبِ فکر غالب تھا) کی پشت پناہی کے ساتھ ہندوستان میں باقی ماندہ دور کے لئے برطانوی قبائلی پالیسی کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔

۱۹۲۲ء کی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر کمیٹی کے مطابق "ایف سی آر سرحد پار سیکشنوں کو منسوخ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ سرحد پار تصرف کے ہمارے پورے نظام کو مفلوج کر دیا جائے"[1]

ایف سی آر آج بھی قدرے ترمیم شدہ شکل میں پاکستان میں جاری و ساری ہے۔ اس کی قدر و قیمت ایک غیر مختتم بحث کا موضوع بنی رہی ہے۔ برطانوی اور پاکستانی اہلکار دونوں اپنی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یہ واحد ذریعہ ہے جس کی وجہ سے ایک قانونی ڈھانچے

۱۔ گورنمنٹ آف انڈیا "رپورٹ آف دی این ڈبلیو ایف پی انکوائری کمیٹی" ص ۲۷

کے اندر رہتے ہوئے شورش پسند پٹھانوں میں کم سے کم مطلوب نظم و ضبط نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس بہت سے تعلیم یافتہ غیر سرکاری پٹھان اور بہت سے گمنام قبائلی جنہیں اس سے زک پہنچی ہے اسے اس بناء پر آڑے ہاتھوں لیتے ہیں کہ یہ نہ جمہوری ہے نہ منصفانہ اور نہ ہی پٹھان[1]

آبادی اور مالیات :-

برطانوی دور میں سرحد کی آبادی تیزی سے بڑھی۔ زیر انتظام ضلعوں کی آبادی پہلی مردم شماری پر ۱۸۵۵ء (۱۱،۴۴،۰۴۷) اور ۱۹۳۱ء (۲۴،۲۵،۰۷۶) کے درمیان دوگنا سے زیادہ بڑھی قبائلی علاقے کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں

تعداد میں تبدیلی سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ برطانوی نظم و نسق کے استحکام کے دور میں ضلعوں میں آبادی کے بہاؤ کا رخ بھی بدل گیا۔ ابتدائی سالوں کے قطعی اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پوری انیسویں صدی میں ورود زیادہ تر حسب معمول مغرب سے ہوا مثلاً ۱۸۹۱ء میں کل ۱۲۳۶۲۵ لوگ افغانستان اور قبائلی علاقوں سے ضلعوں میں آئے جبکہ اس کا صرف ایک تہائی ہندوستان سے یہاں وارد ہوئے ۱۹۳۱ء تک واردانِ مغرب صرف ۵۵،۰۰۷ رہ گئے جبکہ تو واردانِ مشرق ۹۹۴۸۴ ہو گئے[2] مشرق کے نسبتاً گرم لوگوں کی آمد کے باوجود

---

[1] - دیکھیے مثلاً عبدالقیوم "گولڈ اینڈ گنز آن دی پٹھان فرنٹیئر" (بمبئی، ہند کتاب، ۱۹۴۵ء) ص ۱۵

[2] - گورنمنٹ آف انڈیا سینسس آف انڈیا ۱۹۳۱ء، جلد ۱۵ (کلکتہ پبلی کیشنز برانچ ۱۹۳۱ء) ۵۴ فولیو

سرحدی آبادی میں حیرت انگیز جنسی تناسب زیادہ تر جُوں کا تُوں رہا۔

۱۹۳۱ء میں بھی سرحد میں ہر ایک ہزار مردوں کے مقابلے پر ۸۴۳ عورتیں تھیں۔ قبائلی علاقے میں یہ تناسب لازماً اور بھی شدید تھا۔[۱۱]

بڑھتی ہوئی آبادی کا اثر صوبے کے انتظامی اخراجات پر ہُوا۔ اگر باقاعدہ فوجی یونٹوں (جو سرحد میں تعینات ہوتے تھے) کا خرچ نکال دیا جائے تو بھی میزانیہ کبھی متوازن نہ ہوتا تھا۔

عام طور پر بجٹ کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اچھے سالوں میں بھی صوبائی انتظام کار آمد و خرچ کو برابر نہ رکھ سکتے تھے اور ایک واحد بُرے سال جیسے ۳۱-۱۹۳۰ء میں ایک زبردست خسارہ ہُوا۔ بیسویں صدی کے پورے برطانوی دور میں دفاعی اخراجات بجٹ پر حاوی رہے۔ تعلیم کا تو بُرا ہی حال ہُوا۔ اضافہ پذیر آبادی کے باوجود مالیہ اور ایکسائز ٹیکس عاطے مستقل رہے۔ ۱۹۳۰ء کے خاتمے تک مرکزی حکومت کو کھلم کھلا بیچ میں آکر کل آمدنی کا نصف سے زیادہ مہیا کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ سیاسی اخراجات بھی بجٹ سے ہٹا دئیے گئے لیکن پھر بھی یہ متوازن نہ ہو سکا۔

(گوشوارہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

قبائلی پالیسی:- جب کرزن جنوری ۱۸۹۹ء میں ہندوستان پہنچا

---

[۱۱]- ایضاً ص ۷۷

تو اس نے فارورڈ پالیسی کو غائب پایا۔ پانچ مسلح برطانوی انگلیاں، مالاکنڈ، خیبر، کرم، ٹوچی اور وانا میں پھیلی ہوئی تھیں[۱] ان کے ساتھ ساتھ ۱۸۹۷ء کی عظیم بغاوت کی وجہ سے ۱۰ ہزار سے زیادہ فوجی بکھرے ہوئے

صوبہ سرحد کے محاصل و مصارف

سال	محاصل	مصارف	خسارہ
۱۹۰۲-۰۳ء	۳۳۱۳۸۰۷ روپے	۵۱۸۴۷۰۵ روپے	۱۸۷۰۸۹۸ روپے
۱۹۱۷-۱۸ء	۹۱۵۴۶۰۸ //	۹۸۴۹۶۹۴ //	۶۹۵۰۸۶ //
۱۹۳۰-۳۱ء	۶۹۷۴۶۷۹ //	۳۶۹۰۶۸۱۷ //	۲۹۹۳۲۱۳۸ //
۱۹۳۸-۳۹ء	۱۸۰،۰۵۰۰۰	۱۸۶،۶۸۰۰۰ //	۶۶۳۰۰۰ //

۱۹۰۲-۳ء کی رقوم میں بعض مقامی فنڈ شامل نہیں ہیں جو ۱۹۱۷-۱۸ء اور بعد ازاں شامل ہیں

محاصل و مصارف کے چیدہ چیدہ مدّات

مدّ محاصل	۱۹۰۲-۳ء	۱۹۱۷-۱۸ء	۱۹۳۰-۳۱ء	۱۹۳۸-۳۹ء
مالیہ	۱۷۲۶۳۰۴ روپے	۲۲۰۶۰۷۶ روپے	۱۷۶۲۵۲۸ روپے	۲۰۶۲۰۰۰ روپے
آبیانہ	—	—	—	۱۲۱۹۰۰۰ روپے
اسٹامپ و اکسائز	—	۲۲۰،۰۰۰	۱۷،۰۰،۰۰۰	—
گرانٹ اِن ایڈ (حکومت ہند)	—	—	—	۱۰۰،۰۰،۰۰۰

۱- دیکھیے باب چہارم سابقہ

تھے۔ چھوٹے چھوٹے تمام کردہ لیویز اور ملیشیا کے یونٹ پاش پاش ہو چکے تھے اور برطانیہ سرحد پر اپنی گرفت کے لئے صاف طور پر اور محض مسلح طاقت پر منحصر تھا۔

نیا وائسرائے وسط ایشیا کا بسیط علم اور عالمی سیاسیات میں گہری دلچسپی رکھتا تھا اور قبائلی پالیسی کے متعلق اس کا اپنا نظریہ تھا۔ بنیادی طور پر یہ پرانی بند سرحد پالیسی کی طرف مراجعت تھی لیکن قبائلی علاقہ کو محتاط طور پر ایک سرحدی سرزمین کی باقاعدہ شکل دے کر ہلو

مد / مصارف	۱۹۰۲-۰۳ء	۱۹۱۷-۱۸ء	۱۹۳۰-۳۱ء	۱۹۳۸-۳۹ء
پولیٹیکل	۲۰۹۷۰۰۶ /	۶۲۲۴۱۶ /	۳۰۰۲۳۸۲ /	—
واچ اینڈ وارڈ	-	-	۱۵۱۶۱۷۶۹	-
پولیس	۱۰۹۷۱۰۴	۲۵۷۱۸۸۱	-	۳۳۲۸۰۰۰
آمد و رفت	۵۸۴۰۸۴	۱۰۳۴۳۳۷	۱۶۴۴۲۵۹	۱۶۹۶۰۰۰
تعلیم	۲۹۹۹۸۷	۵۹۳۶۸۳	۲۰۶۳۳۹۹	۲۲۲۵۰۰

(دونوں جداول کی رقوم این ڈبلیو ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۹۰۲ء تا ۱۹۳۹ء سے ماخوذ ہیں)

۱ وزیرستان کرم اور خیبر میں نئے ملیشیا منظم کئے گئے۔ لیویز کی

۱۔ پارلیمنٹری پیپرز، ۱۹۰۱، جلد ۴۹، این ڈبلیو ایف، ۴۹۶، ۲۷، نیز دیکھئے کرزن کے رومانیز لیکچرز آف ۱۹۰۷ء

بھی تنظیم نو کی گئی۔ تاکہ ملیشیا کے ڈھیلے ڈھالے امدادی بازو بن سکیں۔

۱۹۰۴ء تک تمام باقاعدہ فوجی دسوائے زیریں چترال میں دروش پر متعین ایک چھوٹے سے یونٹ کے) انتظامی سرحد کے عقب میں واپس بلا لئے گئے۔ اور قبائلی علاقے کا تحفظ مشہور ملیشیا یونٹوں جیسے خیبر رائفلز سامانہ رائفلز اور ٹوچی سکاؤٹس کے سپرد کر دیا گیا۔

وظائف بڑھا دیئے گئے اور ملیشیا یونٹوں کے لئے رسل ورسائل اور حمل ونقل کے نظام کے ارتقا نے قبائل کے لئے محنت مزدوری کا سامان پیدا کر دیا۔ پولٹیکل ایجنٹس کو اپنی اپنی ایجنسی پر قریباً مکمل ذمہ داری دے دی گئی اور وہ براہ راست ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل سے رابطہ رکھنے لگے۔ ملیشیاء بھی انہی کی ذمہ داری بن گئی اور باقاعدہ فوجی یونٹوں کی سرگرمیاں زیر انتظام ضلعوں تک محدود ہو گئیں۔

۱۹۰۱-۲ء میں درہ کوہاٹ سے ایک سڑک مکمل کی گئی جو پر شور آدم خیل آفریدیوں کا گھر تھا اور کوہاٹ تا پشاور کا سفر صرف چند گھنٹوں میں طے ہونے لگا۔ اگلے دو سالوں کے اندر ریل روڈ کی شاخیں درگئی دمالاکنڈ میں مقام داخلہ سے نیچے) اور قلعہ جمرود د خیبر میں مقام داخلہ سے باہر) تک بڑھا دی گئیں۔ وادی کرم کی گردن پر واقع تھل کو بھی ایک تنگ پٹڑی کی لائن کے ذریعے سندھ سے ملا دیا گیا۔

کرزن کا مقصد یہ تھا کہ قبائلی علاقے کو حتی الامکان اپنے ہی ڈھب

پر چلنے کی اجازت دی جائے بلکہ اس کے لئے حوصلہ افزائی کی جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ فوج کے استعمال کو ہٹانے سے مقامی شورشوں کے امکانات کم ہو جائیں گے اور باقاعدہ فوج اپنے اصلی فرض پر مرتکز رہ سکے گی، یعنی ڈیورنڈ لائن کے پرے سے حملے کے خلاف دفاع ہند۔ اگر کوئی ایسی قبائلی بغاوت رونما ہو جائے جو ملیشیا کے بس کی نہ ہو تو فوج جس کی پوزیشن ضلعی چھاؤنیوں میں مرکوز تھیں نئے مواصلاتی نظام کے بل بوتے پر مرکز شورش میں جلدی پہنچ کر اسے کچل سکتی تھی۔

ابتدائی طور پر کرزن کا نظام سرحد میں نسبتاً امن و تحفظ کا دور لایا۔ اس نے فوجی سرگرمی پر ہونے والے بے تحاشا خرچ کو بھی بہت کم کر دیا جو عشرہ آخری کے نصف آخر میں کیا جاتا تھا۔ کرزن ہندوستان سے روانگی کے وقت فخریہ یہ کہہ سکا کہ اس نے اپنے سات سالہ دورِ حکومت میں صرف ۲۴۸۰۰۰ پاؤنڈ فوجی خرچ کیا تھا جبکہ سابقہ پانچ سالوں میں یہ ۴۵۸۴۰۰۰ پاؤنڈ تھا۔[1]

کرزنی پالیسی ۲-۱۹۰۱ء کی چھوٹی سی محسود بغاوت اور ۱۹۰۸ء کی زکا خیل آفریدی اور مہمند شورشوں سے کامیابی سے گزر گئی بلکہ پہلی جنگ عالمگیر کو بھی کامیابی سے پار کر گئی۔ غالباً زیادہ تر اس لئے کہ آفریدیوں کے وظائف دوگنا کر دیئے گئے تھے اور افغانستان کے امیر

۱۔ آر سی۔ موجمدار، ایچ۔ سی رائے چودھری اور کے دتا، "این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا" (لندن میکملن ۱۹۴۶ء) ص ۹۰۲

حبیب اللہ کا رویہ نسبتاً دوستانہ رہا۔ روس کی شکست، کاکیشس میں جرمن

افواج اور ایران میں ترک افواج کی پیش قدمی کوئی بغاوت برپا نہ کر

سکی حالانکہ کئی ہندوستانی مسلمان جو خلافت عثمانیہ کے خلاف برطانوی

جنگ پر برانگیختہ تھے، سید احمد کے باقیات سے مل کر قبائلی علاقے میں

ہل چل پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب قبائل نے ساتھ نہ دیا تو

یہ عناصر کابل چلے گئے اور وہاں جرمن اور ترک مشنوں کے ساتھ مل کر

ہندوستان میں بغاوت کی ناکام کوشش کرتے رہے۔

تیسری جنگ افغان!

مئی ۱۹۱۹ء میں نئے امیر افغانستان امان اللہ نے متعدد پیچیدہ

(جو کچھ زیادہ باور آفریں نہ تھے) وجوہات کی بناء پر برطانوی ہند کے

خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس مقام پر آکر جیسا کہ انگریزوں نے

کھلے دل سے اعتراف کیا "کہ زنی نظام بہت سے قدیم تر اور شاندار تر

اداروں کی طرح اس زبردست دباؤ کے تحت ٹوٹ گیا"[1]

فوراً ہی دور دور تک قبائلی بغاوتیں پھوٹ پڑیں جب

افغان کمانڈر جنرل نادر خان (جو بعد میں نادر شاہ بن گیا) غیر متوقع

طور پر وادی کرم کی گردن پر واقع تھل میں ایک فوج کے ساتھ نمودار

---

[1] "مورل اینڈ میٹریل پراگریس آف انڈیا" ۱۹۲۸ء، ص ۲۶۹

ہوا تو ملیشیا کا نظام پورے سرحد میں چکنا چور ہوگیا۔ خیبر رائفلز اور
ٹوچی اور وانا سکاؤٹس کے بڑے حصوں نے بغاوت کر دی اور مغربی
وزیرستان کا بیشتر حصہ افغانوں کے سپرد کر دیا گیا جنہوں نے مختصر عرصے
کے لئے وانا پر قبضہ کر لیا۔ مہمند اور آفریدی لشکروں نے خیبر بند کر دیا
اور قبائلیوں نے لوٹ مار کی امید پر خوشی سے اپنے وظائف چھوڑ دیئے۔
قبائلی علاقے کا بیس سال سے زیادہ پرانا لیکن کمزور تصرف رات ہی
رات میں ختم ہوگیا۔

افغانوں کے ساتھ جنگ تین میں سے واحد جنگ تھی جس میں
انگریزوں نے جارحانہ حملہ نہیں کیا تھا اور انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ واقعی
روسیوں سے لڑ رہے تھے خاصی آسانی سے فیصلہ پذیر ہوگئی۔ نادر خان
کو تھل سے بھگا دیا گیا اور افغانستان پر برطانوی حملے کے خوف کی وجہ
سے افغان فوج وزیرستان سے واپس چلی گئی۔ رائل ایئر فورس کے
ایک جہاز نے کابل پر ایک بم گرایا تو امان اللہ کو یقین ہوگیا کہ جنگ
ختم کرنا ہی بہتر تھا۔ ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو معاہدۂ راولپنڈی پر دستخط
ہوئے اور اس کے تحت جنگ بند کر دی گئی اور برطانیہ نے افغان امور
خارجہ پر اپنی گرفت ختم کر دی۔ دو سال کے مذاکرات کے بعد ۱۹۲۱ء
کے اینگلو افغان معاہدہ نے تعلق کو آخری شکل دیدی۔[۱]

۱۔ متن "کلیکشن آف ٹریٹیز، انگیجمنٹس اینڈ سنڈز ریلیٹنگ ٹو انڈیا اینڈ نیبرنگ کنٹریز"
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن جنگ افغان کی پیدا کردہ قبائلی بغاوت نہ اتنی آسانی سے دبائی جا سکی اور نہ ہی اتنے پُرامن طور پہ ۱۹۱۹ء کے موسم خزاں میں برطانوی رعب داب قبائلی علاقے سے ایسے ہی غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ دہلی اور لندن سخت مضطرب تھے کہ اسے دوبارہ قائم کر دیا جائے۔ پیشتر اس کے کہ امان اللہ اپنا خیال بدل جاتا یا نیا خوفناک بالشویک روسی خطرہ اس خلا سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو جائے معمول کا طریقہ اختیار کیا گیا اور ۲۰-۱۹۱۹ء کی سردی میں ایک بڑی برطانوی فوج سرکش قبائل کے خلاف روانہ کر دی گئی۔ (لڑائی کا حال آئندہ باب نہم میں بیان ہوگا۔) اس کارروائی کے قریباً ساتھ سڑکیں تعمیر کر کے وانا، رزمک اور میرانشاہ کو ملا دیا گیا۔ رزمک اور وانا میں بڑے بڑے مستقل گیریژن تعینات کر دیئے گئے، اور ملیشیا کے نظام کو از سر نو منظم کیا گیا۔

نئی تحفظاتی افواج :- سکاؤٹ، خاصہ دار اور فرنٹیئر کانسٹیبلری

اسی تنظیم نو کے تحت وجود میں آئیں۔ افواج ہند کی رجمنٹوں کے برطانوی افسروں کے تحت ایک ایک سکاؤٹ یونٹ ہر ایجنسی کے ساتھ منسلک

(بقیہ حاشیہ)

مؤلفہ سی۔ یو۔ ایچیسن دکلکتہ سنٹرل پبلی کیشنز برانچ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۳ء جلد ۱۲ ص ص ۲۳ تا ۲۴ پر دیکھیے۔ جسے آئندہ ایچی سن کہا جائے گا۔

کر دیا گیا۔ مستقبل میں سرتاپا فرار کو روکنے کے لئے ایک تہائی سے زیادہ سکاؤٹ قبائلی علاقے سے نہ لئے جا سکتے تھے۔ سکاؤٹوں کے اہم فرائض یہ تھے کہ وہ قبائلی علاقے میں برطانوی سیاسی گرفت قائم رکھیں اور وہاں کم سے کم مطلوب نظم و ضبط برقرار رہے تاکہ اضلاع پر چھاپوں کا تدارک ہو سکے۔ ۱۹۲۱ء میں سرحدی ایجنسیوں کے سکاؤٹ یونٹوں کی کل نفری ۵،۲۸۵ رہتی تھی[1]۔

مہمند بیٹالین سراسر منتشر کر دیا گیا اور اس کی جگہ فرنٹیئر کانسٹیبلری نے لے لی جو ایک قسم کی صوبائی سیکورٹی پولیس تھی۔ کانسٹیبلری کے فرائض یہ تھے کہ قبائلی علاقوں سے ضلعوں پر چھاپوں کو زیر کریں۔ اشتہاری مجرموں کو پکڑیں اور سڑکوں اور مواصلات کو زیر گشت و نگاہداشت رکھیں۔ اس کے افسران امپیریل انڈین پولیس سے لئے جاتے تھے جنہیں اپنی سروس سے یہاں منسلک کیا جاتا تھا۔ کانسٹیبلری زیر انتظام اضلاع کے کونوں پر اپنی چوکیاں بناتی تھی اور اسے ضرورت کے تحت قبائلی علاقے میں بھی کارروائی کا اختیار تھا۔ اس کا حجم بتدریج بڑھتا رہا حتیٰ کہ ۱۹۳۰ء میں یہ ۲۱۱۰ انفنٹری اور ۳۵۰ سوار انفنٹری پر مشتمل ہو گئی۔ پُرامن سالوں میں بھی کانسٹیبلری مصروف رہتی تھی اور مقتولین و مجروحین کی تعداد کافی ہوتی تھی مثلاً ۲۸-۱۹۲۷ء

---

[1] این ڈبلیو ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۹۲۱ء، ص ۱۰

میں ۶۲۹، ۲۹-۱۹۲۸ء میں ۱۲،۱۵ اور ۳۰-۱۹۲۹ء میں ۳۵۴ مارے گئے یا زخمی ہوئے[1]

وظیفہ خوار قبیلے کے مطالبے پر آدمی مہیا کرنے کا پرانا ، الٹ پلٹ طریقہ ایک باقاعدہ خاصہ دار نظام کے ذریعے مضبوط کر دیا گیا جس کے تحت مقامی ملوک کے نامزد کردہ آدمی اس لئے بھرتی کئے جاتے تھے کہ وہ سڑکوں کی حفاظت کریں ، مسافروں کی حفاظت کا ذمہ لیں اور قبائلی علاقے میں ایسے دیگر فرائض بجا لائیں جو پولیٹیکل ایجنٹ چاہتا تھا۔ خاصہ دار اپنا اسلحہ خود لاتے تھے اور عام طور پر سکاؤٹوں یا کانسٹیبلری سے زیادہ تنخواہیں لیتے تھے تاکہ بہترین آدمی مل سکیں اور وہ نقصان مایہ کے خوف سے اچھے رویہ کے پابند ہو سکیں۔ ۱۹۲۸ء میں درہ کوہاٹ میں ۴۰۰ اور وزیرستان میں ۲۵ سو خاصہ دار تھے[2]

زیر انتظام اضلاع کے بہت سے دیہات میں چغا یعنی تعاقب پارٹیاں بھی قائم کی گئیں۔ ان کا قانونی فرض تھا کہ یہ گاؤں پر حملہ کرنے والے چھاپہ ماروں کا مقابلہ کریں اور ان کا پیچھا کریں۔ حکومت ہر گاؤں کو سائفلوں اور بارود کی ایک خاص تعداد مقدار مہیا کر دیتی تھی۔ دیگر دیہات میں رضاکارانہ پولیس فورس قائم کر دی گئی

۱- ایضاً ص ۱۴

۲- ایضاً ص ۲۰

جس کی کمان مقامی خوانین کرتے تھے۔ انہیں تربیت یا کارروائی کے دوران اسلحہ اور بارود بھی ملتا تھا اور تنخواہ بھی۔

رزمک پالیسی!

نئے نظام کا اہم ترین پہلو وانا اور رزمک میں بڑی بڑی چھاؤنیوں کی تعمیر تھا تاکہ وزیرستان بالخصوص محسود علاقہ پر گرفت رہے۔ ترمیم شدہ فارورڈ پالیسی کو جس نے کرزن کی ترمیم شدہ بند سرحد پالیسی کی جگہ لی اکثر و بیشتر رزمک پالیسی کہا جاتا تھا۔ نظری طور پہ یہ وزیرستان تک محدود تھی اور قبائلی علاقے میں باقاعدہ فوج کے دوبارہ داخلے کا جواز پر پیش کیا جاتا تھا کہ جنوب کے متلون مزاج اور نراجی قبائل اپنے علاقے میں کسی قسم کے نظم و ضبط کے اہل نہ تھے لیکن اصل بات یہ تھی کہ برطانوی دست و بازو انتظامی سرحد سے پرے پورے قبائلی علاقہ میں پھیلتے رہے اور ۱۹۲۱ء میں پشاور کو قلعہ جمرود سے ملانے والی ریل کی پٹڑی خیبر کے بیچ میں سے لنڈی کوتل تک بڑھا دی گئی۔

۱۹۲۲ء میں نارتھ ویسٹ فرنٹیئر انکوائری کمیٹی نے بھی رزمک پالیسی پر مہر تصدیق ثبت کر دی جو حکومت ہند کے فارن سیکرٹری سر ڈینس برے کی صدارت میں کام کر رہی تھی۔ اسے "پُر امن نفوذ" یا "اندر سے گرفت" کا نام دیا گیا اور یہ آخر تک برطانوی قبائلی پالیسی کا بنیاد بنی رہی۔

ابتداء میں نئی پالیسی کامیاب رہی۔ پولیٹیکل ایجنٹ وظائف اور سکاؤٹوں اور خاصہ داروں کی تقرریاں اپنی مٹھیوں میں لئے ہوئے اور قریب ہی باقاعدہ، مضبوط اور مجتمع افواج کے بل بوتے پر قبائل سے ایک طاقتور فریق کی حیثیت سے معاملات کر سکتے تھے۔ قبائل میں افغان ریشہ دوانیاں اس لئے کم ہوگئیں کہ نئے بادشاہ امان اللہ نے اپنی توجہات اپنے ملک کو جدید بنانے پر مرکوز کر دیں۔ نیز ۱۹۲۱ء کے معاہدہ کے تحت کسی حد تک اینگلو افغان تعاون بھی شروع ہوا کیونکہ اس میں ایک شرط تھی کہ افغانستان اور برطانوی ہند دونوں ایک دوسرے کو "ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف کے سرحدی قبائل کے خلاف اہم نوعیت کی فوجی کارروائیوں" کی پیشگی اطلاع دیں گے[1]

نتیجۃً پُرامن تیسرا عشرہ" کی صورت میں ظاہر ہوا جس کے دوران کوئی بڑی بغاوت نہیں ہوئی اور قبائل میں کچھ ایسے آثار پائے گئے گویا انہوں نے اپنی سرزمین میں سڑکوں اور برطانوی دستوں کے منظر کو قبول کر لیا ہے لیکن اس عرصے میں "دو ایسے واقعات ہوئے جو تاریخ اور لوک ریت میں اپنے مقام کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔

---

[1] ایچیسن۔ ایضاً، جلد ۱۳، ص ۲۴

سوات کا استحکام

پہلی جنگ عالمگیر کے بعد کے سالوں میں میاں گل، گل شہزادہ
عبدالودود نے وادیٔ سوات میں اپنی طاقت کو مستحکم کرنا شروع کیا۔
وہ اخوند سوات کا پوتا تھا جس نے سید احمد کے حق میں اور خلاف اتنا
اہم کردار ادا کیا تھا۔ اپنے موروثی تقدس کی بناء پر حیرت انگیز انتظامی
اور حربیاتی قابلیت سے کام لیتے ہوئے اس نے دریائے سوات
کے مشرقی کنارے کے قبائل کو ایک مضبوط وفاقیہ میں منظم کرنا شروع
کیا جن میں سے اکثر نواب دیر کے وفادار تھے۔ اس نے وادیٔ سوات
کے بالا و پست میں قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کیا اور انہیں ٹیلیفون
سے ملا دیا۔

1923
اپریل ۱۹۲۲ء میں میاں گل نے بنیر میں ایک لشکر بھیجا جس
پر اٹک کے اوپر دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی ریاست
امب کا نواب اپنا مبہم سا حق جتاتا تھا۔ نواب نے چیلنج قبول کیا اور
اپنے پیروؤں کا ایک لشکر بھیجا۔ ۲۶ اگست کو ایک اچھی خاصی لڑائی
ہوئی جس کے دوران برطانوی حکام نے احتیاطاً دوسرا راستہ بند
کر دیا اور بنیر میاں گل کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کامیابی سے حوصلہ
پا کر اس نے امب اور دیر کے دوسرے حصوں پر بھی قبضے کی ٹھانی،
لیکن انگریزوں نے نہایت کامیابی سے اس کی توجہ پہلے سے مقبوضہ

علاقہ کی ترقی کی طرف منعطف کرادی اور ۱۹۲۶ء میں میاں گل کو سیدو شریف کے ایک دربار میں باقاعدہ والی بنا دیا گیا جو اس کا چھوٹا سا خوبصورت دارالحکومت تھا۔

والی نے قانون شکنوں کو اپنی ریاست میں پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ اپنے شہریوں کے اسلحہ پر قابو رکھا، ایک چھوٹی سی فوج بنالی اور بہت سے سکول قائم کئے۔ وہ قبائلی ذمہ داری کا ایک نمونہ بن گیا اور چوتھے عشرے میں انگریزوں کی شہ پر سرحد کشمیر تک براستہ سندھی کوہستان اپنی حکومت پھیلانے میں کامیاب ہو گیا۔ قیام پاکستان سے تھوڑا عرصہ بعد ضعیف والی رضاکارانہ طور پر دستبردار ہو گیا اور اب ریاست اس کے بیٹے جہانزیب کے تحت ہے اور اب بھی ایک وحشیانہ قبائلی علاقے کے بیچ میں حسن کارکردگی اور ترقی کا ایک تجربہ ہے۔

ایلس کیس!

تیسرے عشرے کا مشہور ترین واقعہ ۱۴/ اپریل ۱۹۲۳ء کی صبح کو کوہاٹ چھاؤنی سے آفریدیوں کے ہاتھوں ایک نوجوان انگریز لڑکی موّلی ایلس کا اغواء تھا۔ برطانوی نسائیت کی اس توہین نے ہندوستان و انگلستان کے بے شمار انگریزوں کے دلوں میں متشددانہ احساسات پیدا کئے۔ نئی جارحانہ رزمک پالیسی کے ساتھ ہی ہونے

کی وجہ سے اس اغواء نے پٹھانوں اور انگریزوں کے تعلقات میں مناقشت اور بداعتمادی پیدا کردی جو ۱۹۴۷ء تک جاری رہی لیکن ایلس کیس دلچسپ بھی ہے کیونکہ اس میں پیچیدہ پٹھان سیاست و توقعات کا انداز منعکس ہوتا ہے۔

فروری ۱۹۲۳ء میں کوہاٹ کی برطانوی چھاؤنی سے ۴۶ رائفلیں چرالی گئیں۔ چوری کا سراغ عجب خان نامی ایک بوستی خیل آفریدی کے دروازے تک پہنچا جس کا گاؤں قبائلی علاقے میں درہ کوہاٹ کے پہلو میں تھا ۵، مارچ کی صبح کو فرنٹیئر کانسٹیبلری نے سرحد کے ایک مشہور ترین پولیس افسر مسٹر ہینڈی سائیڈ کی کمان میں اور باقاعدہ فوجیوں کی رفاقت میں عجب کے گاؤں کا محاصرہ کرلیا۔

تلاشی سے ۳۲ گمشدہ رائفلیں، کچھ اور مسروقہ مال اور گاؤں میں چند پناہ یافتہ قانون شکن برآمد کر لئے گئے۔ عجب خان خود چھاپے کے دوران غیر حاضر تھا۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق کارروائی "قبائلی احساسات کا پورا لحاظ کرتے ہوئے" کی گئی[۱] لیکن مشہور یہ ہو گیا اور آج بھی اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے کہ کچھ دیہاتی خواتین کی بھی تلاشی لی گئی اور ان کی توہین کی گئی۔

۱۔ این ڈبلیو ایف پی (انڈیا)، رپورٹ آن ایڈمنسٹریشن آف دی بارڈر آف دی این ڈبلیو ایف پی ۲۳۔۱۹۲۲ء (پشاور گورنمنٹ پریس، ۱۹۲۸ء)، ص ۵

عجب چند ہفتے اس توہین پر غور کرتا رہا اور پھر اس نے اپنی مستورات اور رشتہ داروں کے اکسانے پر ۱۴ اپریل کو کوہاٹ پر چھاپہ مارا۔ ایک انگریز افسر کی بیوی مسز ایلس ماری گئی اور اس کی قریباً ۱۴ سالہ بیٹی مولی اغوا کرلی گئی۔

ایک ناکام تعاقب اور پیچیدہ سلسلۂ مذاکرات کے بعد دو پٹھان پولیٹیکل افسروں، رسالدار مغل باز خان اور خان بہادر قلی خان اور ایک مقامی انگریزی مشن کی مسز سٹار کی مساعی کی بدولت ایلس صحیح سالم واپس کردی گئی۔

اس کے بعد جو کچھ شروع ہوا وہ ان مسائل کی ایک عمدہ مثال تھا جو سرحد پر انصاف کے راستے میں حائل ہیں۔ عجب خان اور اس کے ساتھی مجرم سلطان میر اور گل اکبر جو باپ بیٹا تھے، پہاڑیوں میں سے فرار ہوئے اور دوستانہ قبائیلیوں کے ہاں پناہ لیتے رہے۔ ناکہ بندی اور وظائف کی معطلی کی سخت دھمکیوں کی وجہ سے خیبر کے آفریدیوں اور اورکزئیوں نے ۱۲ مئی ۱۹۲۳ء کے جرگہ میں "کوہاٹی گروہ" کو اپنے علاقہ سے نکالنے پر اتفاق کرلیا۔ مفرور سرحد پار افغانستان میں شنواریوں کے ہاں پناہ کے لئے چلے گئے۔

ابتدائے نومبر میں جب ابھی ان کو پکڑنے کی ہر کوشش جاری تھی وہ واپس قبائلی علاقے میں آئے۔ تھوڑے دنوں بعد ایک کیپٹن اور مسز واٹس وادیٔ کرم کے سر پر واقع پاڑہ چنار میں قتل

کر دیئے گئے۔

ایسے حالات میں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ گھناؤنا جرم کوہاٹی گروہ کی کارستانی تھی[*]، تعاقب تیز کر دیا گیا اور جنوری ۱۹۲۴ء میں عجب نے اپنے کو افغان گورنر جلال آباد کے حوالے کر دیا۔ وہ اور اس کا گروہ بمعہ اہل و عیال کابل بھیج دیئے گئے حالانکہ انگریزوں نے ان کی حوالگی کا مطالبہ کیا تھا اور پشاور کے بعض افسروں نے بین الاقوامی طریقوں کا سہارا لیئے بغیر جلال آباد جا کر اسے واپس لانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ افغان حکومت اگر چاہتی بھی تو بھی وہ مفرور کو رائے عامہ کے دباؤ کے تحت واپس نہ کر سکتی۔ لہٰذا اس نے یہ مشہور کر دیا کہ عجب اور اس کا خاندان ہندوکش سے پرے نظر بند کیا جا رہا تھا اور اسے مزار شریف کے قریب زمین دے دی گئی۔

مبینہ طور پر سردار میر اور گل اکبر افغان ہدایات کے تحت خفیہ طور پر سرحد سے واپس آکر تیراہ میں رہنے لگے ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء میں ان کی تلاش جاری رہی۔ بالآخر گل اکبر پکڑا گیا اور وہ ۲۹ مئی ۱۹۲۸ء کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ سلطان میر تعاقب سے بچتا رہا اور بالآخر سنی اور کرنیوں میں غائب ہو گیا۔

عجب کے بوستی خیل آفریدیوں کو اس واقعہ کی یاد داشت میں رائفلوں

---

* ایضاً، ص ۲

کے علاوہ ۲۴ ہزار روپے جرمانہ کیا گیا اور عجب کی اپنی زمینیں (۸ ہزار روپے مالیت کی) ضبط کر لی گئیں۔ اس کے گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور مقامی روایات کے مطابق اس مقام پر نمک بھرا ہل چلا دیا گیا۔ دولت زئی اور دیگر اورکزئیوں کو ½ ۱۹ ہزار روپے جرمانہ کیا گیا کیونکہ وہ مجرموں کے تعاقب میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہے تھے۔

ایلس کیس کے فٹ نوٹ کے طور پر یہ ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ عجب خود ضعیف اور معذور رہو کر شمالی افغانستان میں ۱۹۶۱ء تک زندہ رہا جہاں اس نے اور اس کے ساتھی پٹھانوں نے مقامی کسانوں پر کابل حکومت کا رعب داب قائم رکھنے کے لئے کافی کام کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اور اس کا بھائی، شہزادہ تحریک پاکستان میں ملوث ہو گئے (دیکھئے آئندہ باب دوازدہم) اور ۱۹۵۲ء کے آخر میں شہزادہ پہلی دفعہ اپنے گاؤں کا محلِ وقوع دیکھنے کے لئے واپس آیا تاکہ افواجِ "پختونستان" کے پاکستان پر حملے کا راستہ صاف کیا جا سکے۔

چوتھے عشرے کی قبائلی پالیسی!

جن خاص واقعات نے چوتھے عشرے کو سرحد میں برطانوی حکومت کا سب سے پُر فتنہ دور بنا دیا آئندہ ابواب میں ایک بڑے کُل کے اجزاء کے طور پر بیان کئے جائیں گے۔ ان میں سے اہم ترین پشاور کے ارد گرد کے علاقوں میں ۱۹۳۰ء کی بغاوت تھی نیز ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۷ء اور

۱۹۳۸ء میں وزیرستان کے قبائلیوں اور انگریزوں کے درمیان ایک طویل زور آزمائی ہوئی۔

اس پورے ہنگامہ خیز دور میں برطانوی قبائلی پالیسی بنیادی طور پر وہی رہی۔ ۱۹۲۲ء کے دعوے کہ نئی فارورڈ پالیسی کا مقصد پہاڑی قبائل تک اقتصادی بہبودی اور تہذیب کی برکات پہنچانا تھا وقتاً فوقتاً دہرائے گئے، ۱۹۲۸ء میں حکومت نے یہ نظریہ قائم کیا کہ نئی پالیسی "بنیادی طور پر مثبت اور تعمیری تھی۔ عسکری فتح کی بجائے تہذیبی تھی"۔ ایک سرکاری رپورٹ کے آخری الفاظ تھے "اس طرح قبائل میں حکومت خود اختیاری کا جذبہ اور ان کا احساسِ ذمہ داری زندہ و تابندہ رہے گا جبکہ برطانوی اثر و رسوخ اور اقتصادی اقدامات آہستہ آہستہ ان اسباب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے جنھوں نے صدیوں سے ان جیالوں کو قاتل و قزاق بنا رکھا ہے"۔[1]

وزیرستانی شورشوں کے درمیان میں بھی انڈیا آفس ابھی تک مصر تھا کہ "سرحد کے متعلق حکومت ہند کی عمومی پالیسی کا مستقل مقصد یہ ہے کہ سرحدی امن برقرار رہے اور قبائل کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کیے جائیں تاکہ ان کی تدریجی تالیفِ قلب، تہذیب اور اقتصادی فلاح و بہبود کا سامان ہو سکے"۔[2]

۱۔ این ڈبلیو ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۹۲۸ء، ص ۲۰۔

۲۔ پارلیمنٹری پیپرز ۳۷-۱۹۳۶ء، ۵۴۹۷ "ٹرائیبل ڈسٹربنسیز ان وزیرستان"

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تاہم قوت اور سرکوبی کی موجودہ آب و ہوا تبدیل نہ کی جا سکی۔
صحت یا تعلیم کی خدمات برائے نام ہی مہیا کی گئیں اور قبائل کا قدیم
اندازِ حیات سکولوں اور ہسپتالوں سے متاثر نہ ہو سکا جو ہندوستان کے
دیگر حصوں میں مشمولہ بہ صوبہ سرحد تیزی سے پھیل رہے تھے۔ نظم و نسق
کا عسکری رجحان جو ۱۹۰۱ء کے بعد پہلے سے مضبوط ہو گیا تھا نرنک پالیسی
کے تقاضوں کے تحت اور بھی شدید ہو گیا۔ گو حکومت نے اسے رسمی طور
پر تسلیم نہیں کیا تاہم بیسویں صدی میں مسئلہ سرحد کو عام طور پر ایک سیاسی
مسئلہ کی بجائے عسکری مسئلہ ہی سمجھا گیا اور فیصلہ کن اثر فوج کا ہی رہا۔[۱]
گو بہت سے پولیٹیکل ایجنٹ اپنے طور پر اپنے لوگوں کی فلاح و بہبود
کے لئے ایسے وقت ہوئے کہ ان کے فوجی رفقائے کار انہیں شک و شبہ
کی نگاہ سے دیکھنے لگے تاہم برطانوی نظم و نسق مجموعی طور پر قبائل کے
معاملات کو اس وقت تک ٹالتا رہا تھا جب تک قائم شدہ شاہی
انتظام کے تحفظ کو خطرہ لاحق نہ ہوتا۔ پولیٹیکل افسران ممکنہ حد تک
بین القبائلی کش مکش کو عموماً کم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور خونیں
جھگڑوں کی ہولناکیوں پر اکثر و بیشتر نصیحتیں کرتے رہتے تھے لیکن واقعتاً

(بقیہ حاشیہ)

۲۵، نومبر ۱۹۳۶ء تا ۱۴، جون ۱۹۳۷ء) ۔ ص ۷

۱۔ ڈبلیو کے فریزر ٹائلر "افغانستان" (لندن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۳ء) ص ۲۶۸

انہوں نے قبائلی علاقے میں چپقلش کو مستقل طور پر ختم کرنے کے لئے بہت کم کام کیا۔

بعض اوقات انگریز ایک گروہ کے خلاف دوسرے کی حمایت کرتے تھے جس میں آر اے ایف کی بمباری بھی شامل ہوتی تھی جیسا کہ چوتھے عشرے میں مہمندوں کی باہمی جنگ میں ہوا جب انگریزوں نے حاجی ترنگزئی اور فقیر عالمگیر کی سرکردگی میں بالائی مہمندوں کے خلاف زیریں مہمندوں کی حمایت کی۔ پہاڑی مہمند ۱۹۳۰ء سے اپنے معاملات کے لئے ایک علیحدہ پولیٹکل ایجنٹ کے لئے درخواستیں کرتے رہے لیکن ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی[1]

ایسی بین القبائلی کشمکش کے متعلق جس کا براہ راست حکومت پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا سرکاری رویہ ۳۸-۱۹۳۷ء کی بارڈر رپورٹ میں یوں بیان کیا گیا۔ "اس باجوڑی لڑائی میں حکومت نے سختی سے غیر جانبداری کا رویہ قائم رکھا ہے جو اس کے خیال میں ایک خاندانی جھگڑا ہے۔ جس سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں"[2]

امدادی وظائف کا نظام :-

سرحد میں برطانوی حکومت کے آخری دنوں پر غور کرنے سے پہلے

---

[1]- قبائلی علاقہ کے مہمند خیبر کے پولیٹیکل ایجنٹ کی ذمہ داری تھے جس کا اکثر و بیشتر وقت انہی کی طرح شورش انگیز اور خطرناک آفریدیوں پر ہی صرف ہو جاتا تھا۔

[2]- این ڈبلیو ایف پی بارڈر ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۳۸-۱۹۳۷ء، ص ۲

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قبائلی الاؤنسوں کے نظام پر ایک سرسری سی نظر ڈال لی جائے۔ یہ نظام کسی نہ کسی شکل میں کم از کم مغل دور سے شروع ہوا۔ انگریزوں نے اسے شروع ہی سے اپنا لیا لیکن چوتھے عشرے میں یہ اپنے جوبن پر آیا اور اس نے ایک ایسا نمونہ قائم کیا جو اب بھی جاری و ساری ہے۔

سب سڈی کی تین واضح قسمیں ہیں۔ لُنگی افراد کو دیا جاتا ہے جو عام طور پر ملوک یا دیگر بااثر اصحاب ہوتے ہیں۔ یہ عموماً ماہوار، ششماہی یا سالانہ دیا جاتا ہے۔ ادائیگی چند روپے سے کئی سو روپے ماہوار تک ہوتی ہے۔ لُنگی کی اہمیت محض اقتصادی نہیں ہے۔ مختصر سا لُنگی بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ حکام نے اس کے علاقے کا رہنما تسلیم کر لیا ہے اور اس سے اس کا وقار بڑھتا ہے۔ پچھلے سالوں میں ایک رجحان صاف نظر آتا ہے کہ لنگی کے ساتھ اجناس یا مقررہ قیمتوں پر کپڑا درآمد کرنے کے لائسنس بھی کبھی کبھار دے دئیے جائیں۔ آخرالذکر قبائل کو ایک ایسی اہم چیز مہیا کرتا ہے جو پہاڑیوں میں کم یاب ہے اور اس کے علاوہ ایک پُر وقار رنگ کو دوبارہ فروخت یا سامان کے کسی حصہ میں رد و بدل کر کے فالتو آمدنی بنانے کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

مواجب وہ الاؤنس ہے جو کسی قبیلہ یا خیل کو بطور ایک اکائی دیا جاتا ہے یہ غالباً اہم ترین سب سڈی ہے۔ یہ عام طور پر ایک جرگہ کی موجودگی میں قبیلے کے نمائندہ ملوک کے حوالے کیا جاتا ہے قبیلے میں اندرونی تقسیم دیرینہ

رسم کے مطابق ہوتی ہے اور اس پر شاذونادر ہی جھگڑے ہوتے ہیں۔

خرچہ وہ رقم ہے جو سیاسی حکام کے کہنے کے مطابق خصوصی کام نمٹانے کے بدلے دی جاتی ہے۔ یہ کسی ایلچی کی خوراک کے لئے ایک دو روپے ہو سکتے ہیں یا کسی ملک کے لئے بہت بڑی رقم ہو سکتی ہے جو افغان مداخلت کاروں کو بھگا دینے کے لئے ایک لشکر اکٹھا کرنے کا معاوضہ ہوتی ہے۔

نظری طور پر انگریز ان وظائف کو قبائل کا حق گردانتے تھے جزواً قدیم قبائلی حقوق کے معاوضہ کے طور پر جیسے دروں میں سے گزرنے والے مسافروں سے ٹیکس لینا جزواً مراعات کے بدلے میں جیسے قبائلی زمینوں میں سے سڑکوں اور ریلوے لائن کو گزارنا اور جزوی طور پر ضروری خدمات انجام دینے کے بدلے میں جیسے سڑکوں اور ریلوے لائن کی مرمت اور حفاظت کرنا۔ لیکن عملی طور پر حکام اکثر و بیشتر انہیں ایک اوزار کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے، جو ناکہ بندی کے ساتھ منسلک ہو کر اقتصادی دباؤ کے ذریعے قبائلیوں کو مطلوبہ کام کرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔[1]

قدرتی طور پر سیاسی حکام کو لالچ ہوتا تھا کہ وہ کسی متعاون ملک کا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے اس کا الاؤنس بڑھا دیں اور اس کے اپنے گروہ سے بھی بڑے گروہوں کے مواجب کے لئے اسے بطور توسط استعمال کریں۔ یہ طریقہ چوتھے عشرے میں مہمندوں کے طویل باہمی جھگڑوں

---

[1] این ڈبلیو ایف انکوائری کمیٹی رپورٹ، ص ۶

میں خاص طور پہ استعمال کیا گیا۔ یہ ناگزیر طور پہ ناکام ہوگیا کیونکہ قبائلی
اس سے سخت متنفر ہوگئے اس لئے کہ یہ ان کے اپنے قائم کردہ اور
تسلیم کردہ مراتب اثر ورسوخ سے متصادم ہوگیا۔

برطانوی دور کے آخری ایام :۔

اگرچہ ۳۸ - ۱۹۳۶ء کی وزیرستانی بغاوت فوجی لحاظ سے دبا
دی گئی پھر بھی جنوب میں صحیح اور مکمل تصرف کبھی قائم نہ ہو سکا۔ گورزمک
اور وانا کی چھاؤنیاں چٹانوں کی طرح کھڑی رہیں اور قبائلی علاقے کے
اندر چند گز مزید پھیل گئیں تاہم دستے کبھی آرام سے نہ رہے اور سڑکیں
کبھی محفوظ نہ ہو سکیں۔ سفر عموماً پوری طرح مسلح قافلے کی صورت میں
ہوتا اور وہ بھی صرف "سڑک کھلی کے دنوں" میں، شاید ہفتہ میں ایک
دفعہ۔ ان دنوں میں ایک پوری بٹالین یا ایک بریگیڈ چھاؤنی سے علی الصبح
پکٹ کے لئے چند درجن میل سڑک پہ بھیج دیا جاتا اور آنے اور جانے والے
قافلے عین مقررہ اوقات پہ ایک دوسرے کے پاس سے گزر جاتے
تاکہ فوج غروب آفتاب سے پہلے چھاؤنی میں واپس آسکے۔

ہوائی جہاز کی آمد نے روایتی برق رفتار دستے کا متبادل
مہیا کر دیا تھا جب بھی حکومت سمجھتی تھی کہ کسی دور افتادہ گاؤں
یا قبیلے کو سزا دینا ضروری تھا۔ دفاع سے عاری قبائلی مہمات پہ
بمباری کے خلاف انگلستان میں انسان دوست گروہوں کے شور وغوغا

کے باوجود آر۔ اے۔ ایف (رائل ایئر فورس) دو سال تک ہوائی حملے کرتی رہی اور گو پولیٹیکل افسران کے ملازم مخبر ہوائی حملے سے ہونیوالی خوفناک تباہی اور بے نقاب ہونے والے مخالفین کی اطلاعات از خود دیتے رہے تاہم ان بالا وقفاف بمباریوں سے چند مٹی کے قلعوں کی تباہی کے سوا اور کچھ نہ ہو سکا۔

ہوائی جہاز دیکھ بھال کے مقاصد کے لئے بہت مفید تھے بالخصوص افغانستان سرحد پار کرتے ہوئے لشکروں یا قبائلی علاقوں کے اندر انہیں مورچہ بندی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن کم بلندی پر وہ نشانہ بازوں کی زد میں آجاتے تھے، اور زمین پر اترنے والے پہلے چند ہوابازوں کا حشر عبرتناک تھا۔ بعد میں بالغ نظر حکومت نے ہوا باز کی واپسی کے لئے اونچا فدیہ مقرر کر دیا جو کسی بھی وجہ سے قبائلی علاقے میں کھو گیا ہو اور یوں یہ سارا عمل ایک کھیل کا رنگ اختیار کر گیا۔

جنگ عالمگیر دوم بھی اپنی پچیس سالہ سابقہ پیشرو کی طرح سرحد میں نسبتاً امن سے گزر گئی کہیں مخالفانہ قوت نے ٹینکوں کے سلسلے کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ عاجلانہ طور پر جو خیبر اور کرم میں اکھٹے کر دیئے گئے تھے۔ افغانستان جرمنی کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے باوجود پوری جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ قبائلی علاقے اور سرحد کے ساتھ ساتھ دستوں کو کا ملاً ہٹانا تو کبھی محفوظ نہ سمجھا گیا تاہم ان کی کافی تعداد برما کے جنگی جہاز پر منتقل کر دی گئی۔

کابل کے اطالوی اور جرمن ایجنٹ فقیر ایپی سے رابطہ قائم کرتے ہوئے اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے جو ۱۹۳۹ء تک سرحد کا خوفناک ترین دشمن بن چکا تھا[1]۔ ۱۹۴۱ء میں فقیر ایپی کو محوری طاقتوں سے چند لاکھ افغانی روپے ملے جو اس وعدے کا بدلہ تھا جو اس نے اپنے لشکر کو مناسب وقت پر انگریزوں کے خلاف استعمال کرنے کے سلسلے میں کیا تھا لیکن اس منصوبے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا[2]۔

جنگ عالمگیر دوم کے خاتمہ اور انگریزوں کے خیرباد کہنے کا درمیانی وقفہ سرحد میں تقریباً خیریت سے گزرا۔ کوئی بڑی شورش نہیں ہوئی۔ گو ایک قبائلی گاؤں پر بمباری کبھی کبھار اب بھی ضروری سمجھی جاتی تھی، اور قبائلی علاقے میں سفر "ٹرک کھلی کے دنوں" کے مطابق ہی اختیار کرنا ضروری تھا۔ روسی خطرہ بھی اُفق پر دوبارہ نمودار ہوا لیکن حکمرانوں کی توجہ جدوجہد آزادی پر مرکوز تھی جو ہندوستان

---

[1]۔ ایپی کے ابتدائی کارناموں کے لئے دیکھئے آئندہ باب نہم

[2] کہا جاتا ہے کہ مستعد فقیر محوری ایجنٹوں کو اپنی صلاحیتوں اور توقعات کا ایک گوشوارہ دیا یعنی (۱) بالا توقف چھوٹے چھوٹے معرکوں کو جاری رکھنے اور انہیں تیز کرنے کے لئے ۲۰ لاکھ روپے سالانہ فتح تک (۲) دوسرے میدانوں میں انہیں پھیلانے کے لئے ۶۰ لاکھ روپے سالانہ (۳) مکمل سرحدی بغاوت کے لئے ۱۰ لاکھ روپے

سے ان حصوں میں جاری تھی جو عموماً سرحد سے کہیں زیادہ اطاعت پذیر تھے۔ جب آزادی اور تقسیم کا فیصلہ ہوا تو سرحدی انتظام کاروں نے استصواب کروایا اور پھر قریباً ایک صدی کی حکومت کے بعد رخصت ہو گئے۔

ایک ممتاز افسر ڈبلیو۔کے۔فریزر ٹٹلر جس نے سرحد اور افغانستان دونوں میں خدمات انجام دی تھیں اعتراف کرتا ہے کہ انہوں نے سرحد کا مسئلہ حل نہیں کیا تھا، اور اگست ۱۹۴۷ء میں انگریزوں نے پاکستان کو "ایک ڈھلمل، مشکل اور مستقبل کے لئے خطروں سے بھرپور صورتحال" منتقل کر دی۔[۸]

۸۔ فریزر ٹٹلر ایضاً ص ۲۷۰

(۱۲) باب ہشتم

سرحد ہندوستان کے ایک حصہ

کی حیثیت سے

تعارف ! ر

تاریخ ایشیا کے بہت سے بڑے بڑے فاتحین نے دریائے سندھ کے دونوں طرف حکومت کی ہے۔ لیکن انگریزوں کی آمد تک ان میں سے کسی نے سرحد کو ہندوستان کا ایک حصہ نہیں سمجھا۔ پٹھانوں نے بھی کبھی ایسا نہیں سوچا۔ چودھویں اور پندرہویں صدی میں دہلی کے افغان سلاطین ایک شعوری طور پر غیر قوم کی حیثیت سے حکومت کرتے رہے۔ خوشحال خان خٹک نے ہندوستان میں اپنی جلاوطنی کے دوران جو نظمیں لکھی ہیں وہ بھی اس ملک اور اس کے لوگوں، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، کے خلاف نفرت و حقارت سے بھری ہوئی ہیں۔ کپلنگ نے ۱۸۸۹ء میں لکھی گئی "بادشاہ کے رحم و کرم کی داستان"، کے مطلع میں سیدھے سادے انداز میں کہا تھا۔ "ہندوستان کے ایک شکاری کتے نے ایک

یوسفزئی کو کاٹا تھا اور انہوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور مرنے کے لئے اسے باہر نکال دیا"۔ یہ الفاظ انیسویں صدی کے اواخر میں گنگ و سندھ کے باشندوں کے متعلق پٹھانوں کے رویہ کے غمازہ ہیں۔

یہ قریباً ناممکن ہے کہ پوری انیسویں صدی میں ہمیں پٹھانوں اور برطانوی ہندوستانی سلطنت کی دیگر رعایا کے درمیان اشتراک مفاد کا کوئی احساس ملے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہندو راجوں، مسلمان نوابوں اور مختلف نسلوں، ذاتوں اور مذہبوں کے سپاہیوں کا ایک متفرق مجموعہ سامنے لائی لیکن وہ پٹھان نہیں تھے۔ سید احمد کے پیرو بھی قبائلیوں کے ساتھ عارضی ترین اتحاد کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکے۔ ۱۸۹۷ء کی عظیم پٹھان بغاوت اس وقت ہوئی جب انگریزوں اور ہندوستان کی دیگر محکوم اقوام کے درمیان تعلقات دوستی کی انتہاؤں کو چھو رہے تھے۔

انگریز سندھ پار علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے پر بضد رہے لیکن وہ اس کی انفرادیت کو تسلیم کرتے رہے بلکہ انہوں نے کئی طریقوں سے اس کے الگ تھلگ پن کو تقویت دی۔ شاید ان میں سے اہم ترین یہ تھا کہ کرزن نے سندھ پار اضلاع کو پنجاب سے الگ کیا اور قبائلی علاقہ قائم کیا۔

پورے برطانوی دورِ حکومت میں حکومت کا سرحد میں مقصد تحفظ تھا نہ کہ مالیہ یا ترقی۔ ۱۹۰۹ء کی مارلے منٹو اصلاحات اور ۱۹۱۹ء کی

مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات سرحد میں قریباً محروم توجہ رہیں جو ویسے بھی ان کے فوائد سے محروم رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ چیف کمشنر کی بجائے گورنر بھی ۱۹۲۲ء میں مقرر کیا گیا تاکہ صوبہ سرحد کو کم از کم نظری لحاظ سے ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے برابر لایا جا سکے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ناگزیر طور پر برطانوی ہندوستانی نظم و نسق کے کثیر التعداد نچلے درجے کے اہلکاروں نے ضلع اور تحصیل کی سطح پر زیادہ سے زیادہ اپنا لوہا منوایا اور پٹھان رواج کو صوبے میں بتدریج ہندوستان کے دیگر حصوں میں تجربات کی بنا پر قائم شدہ مالیاتی، پولیس اور عدالتی نظام کے تقاضوں کے ماتحت کر دیا۔ اس کا نتیجہ جنگ عالمگیر اوّل کے بعد کے سالوں میں روز افزوں بیزاری اور بے چینی کی صورت میں ظاہر ہوا اور پٹھانوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ برطانوی حکومت کے مطالبوں میں تو شریک تھے لیکن اس کے فوائد میں نہیں جیسا کہ سر ولیم بارٹن نے بعد میں اعتراف کیا۔ "پٹھان قبائلی نظام کو با جبر برطانوی ہند کے انتظامی ڈھانچے میں لانے کی پالیسی کافی حد تک انگریزوں کی ناکامی کی ذمہ دار رہی ہے کہ وہ پٹھانوں کو ہندوستانی سیاسی نظام میں کیوں نہ جذب کر سکے"[۱]

۱۔ بارٹن، ایضاً ص ۸۳

ہندوستان کا سیاسی اثر

اس کے باوجود پہلی جنگ عالمگیر کے بعد ہندوستان بھر میں سیاسی بے چینی کی تیز و تند ہوائیں چلنے لگیں اور انھوں نے سرحد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سرحد کے مشہور ترین آتش بیان مقرر خان عبدالغفار کا نام پہلی دفعہ ۱۹۱۹ء میں منظر عام پر آیا جب اتمانزئی کے اس نوجوان زمیندار نے رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک کی رہنمائی کی جس کے تحت ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں پر سخت زد پڑتی تھی۔ ترکی کی حمایت میں تحریک خلافت کو دوران جنگ[1] سرحد میں بہت کم پیرو ملے تھے۔ لیکن چند سال بعد اس میں دلچسپی بہت بڑھ گئی، جب مشہور و معروف علی برادران نے تحریک کو کانگریس سے ملا دیا تاکہ ان سخت شرائط صلح کے خلاف جدوجہد کی جا سکے۔ جو انگریز اور فرانسیسی شکست خوردہ ترکی پر ٹھونپ رہے تھے۔

تحریک ہجرت نے یہ سکھایا کہ تمام مسلمان دارالحرب کو چھوڑ کر دارالاسلام میں چلے جائیں تو بہت سے پٹھان بھی اس سے بہت متاثر ہوئے اور اگست ۱۹۲۰ء میں ۱۸ ہزار نے اپنی زمینیں، گھر اور دکانیں بیچ دیں اور کابل روانہ ہو گئے[2] جہاں مہاجرین کا لشکر افغان

۱۔ تحریک خلافت دوران جنگ نہیں بلکہ بعد از جنگ شروع ہوئی (مترجم)

۲۔ "مورل اینڈ میٹریل پراگریس آف انڈیا" ۱۹۲۰ء، ص ۵۳

امیر کے لئے اتنا تکلیف دہ ثابت ہوا کہ اس نے انہیں واپس ہندوستان بھیجنے کے لئے انگریزوں سے تعاون کیا۔

۱۹۲۲ء میں نارتھ ویسٹ فرنٹیئر انکوائری کمیٹی نے روز افزوں بے چینی پر غور کیا اور اس کی رپورٹ نے تسلیم کیا کہ صوبہ سرحد کے باشندے "یقیناً ذہانت یا اپنے معاملات کو سنبھالنے کی صلاحیت میں باقی ہندوستان سے پیچھے نہیں" تھے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا: "اصلاحات کی آرزوئیں اب پوری طرح پیدا ہو چکی ہیں اور کسی صورت میں دیگر مقامات میں رائج اصلاحات سے کم پر مطمئن نہ ہوں گی"[1] کمیٹی نے مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی مجوزہ قسم کی قانون ساز کونسل کی سفارش کی جس کے ساٹھ فیصد ممبر منتخب ہوں، نیز ایک مقامی وزیر کی تقرری کی بھی سفارش کی جو پنجاب کے نمونے پر منتقلہ امور کا سربراہ ہو۔[2]

یہ سفارش دس سال تک سرد خانے میں پڑی رہی۔ دریں اثناء رزنک پالیسی پر عملدرآمد شروع کیا اور گو قبائلی علاقے سلگتے رہے تاہم صوبہ سرحد مائل بہ سکون رہا۔ اصلاحات کو التواء میں رکھنے کے لئے صوبے اور قبائلی علاقہ کے گہرے باہمی تعلق اور تحفظ کے مقدم تقاضوں کے حوالے دیئے گئے۔ علاوہ ازیں کچھ زیادہ طباع پٹھانوں نے اپنی توانائیوں کے نکاس کے لئے نئے اور غیر معروف راستے تلاش کر لئے لہٰذا ۲۵-۱۹۲۴ء

1- این ڈبلیو ایف انکوائری رپورٹ، ص ۲۲

2- منتقلہ امور تعلیم، صحت، زراعت، تعمیر، آبکاری، مقامی خود اختیاری اور امداد باہمی وغیرہ پر مشتمل تھے۔ (مترجم)

کی بارڈر رپورٹ میں اس سال کا اہم مسئلہ یوں بیان ہوا "عورتوں کی وسیع پیمانے پر اور نفع بخش تجارت، سوات یا ضلع پشاور سے اغوا کی ہوئی یا بہلائی پھسلائی ہوئی، آفریدی سرحد کے پار لے جا کر اور بالآخر سندھ میں فروخت کے لئے برآمد کردہ"[1] تیسرے عشرے کے آخر تک یہ روز بروز واضح ہوتا چلا گیا کہ سرحد ہندوستان کے دیگر حصوں میں رونما ہونے والے واقعات سے لاتعلق نہیں رہا تھا۔ "رنگیلا رسول" کے مشہور مقدمہ میں جس میں آنحضورؐ کی توہین کے مرتکب مصنف کو ضلع ہزارہ کے ایک مسلمان نے بھری عدالت میں موت کے گھاٹ اتار دیا قبائلی علاقہ اور زیر انتظام اضلاع میں بھی اضطراب کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی جب کراچی میں قاتل کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا تو سرحد میں کمیونل یا فرقہ وارانہ جذبہ[2] پیدا ہوا اور بہت سے ہندو دکاندار اور متوسلین پٹھان دیہات سے نکال دیئے گئے۔

۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن نے سفارش کی کہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات

۱- این ڈبلیو ایف پی بارڈر ایڈمنسٹریشن ۲۵-۱۹۲۴ء ص ۵

۲- ہندو پاکستان کے برصغیر میں کمیونل عام طور پر "مذہبی" کا مترادف ہے۔ یہ ہر اس چیز پر صادق آتا ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم و رواج، ان کی سرگرمیوں اور ان کے باہمی روابط سے تعلق رکھتی ہو۔

ایک محدود شکل میں صوبہ سرحد میں بھی نافذ کی جائیں لیکن اس نے بے چینی کم کرنے کی بجائے مجوزہ اصلاحات کی محدود نوعیت کی وجہ سے اضطرب کی ایک نئی لہر کو پیدا کر دیا۔

عبدالغفار خان اور خدائی خدمتگار

اب تک عبدالغفار خان اور اس کے بھائی، ڈاکٹر خان صاحب نے جو انڈین میڈیکل سروس کا ایک افسر تھا گاندھی اور انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا تھا۔ خان برادران نے جنہیں رولٹ ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن کے بعد قید کر دیا گیا تھا قبائلی منحرفین سے بھی تعلقات قائم کر لئے تھے، بالخصوص مہمندوں کے ساتھ جن کے سب سے زیادہ شورش پسند لیڈر، حاجی ترنگزئی کے ساتھ ان کا رشتہ ناطہ بھی تھا۔

۱۹۲۹ء میں عبدالغفار خان نے خدائی خدمت گاروں کی بنیاد ڈالی جن کی وردی مقامی اینٹوں کے رنگ سے امتیازی طور پر سرخ رنگی جاتی تھی۔ برطانوی سرکاری دستاویزات میں تنظیم کو فوراً ہی "سرخپوش" کا نام دے دیا گیا اور حواس باختہ انتظام کار اسمیں اور "سرخ خطرے" کے درمیان ایک خفیہ تعلق دیکھنے لگے جو ہندوکش سے پرے دریافت ہوا تھا جبکہ ابھی زار کا خطرہ بھی تنا ید دفن نہیں ہوا تھا۔

خدائی خدمت گار بہت جلدی پشاور اور اس کے ارد گرد دیہات میں مقبول ہو گئے، اور عبدالغفار خان ہندوستانی سیاسی سرگرمیوں میں ایک اہم شخصیت بن گیا۔ خدائی خدمت گار جرگے ضلع پشاور کے اکثر دیہات میں قائم کئے گئے اور انہیں ہمسایہ۔ قبائلی اور ضلعی جرگوں سے ملا دیا گیا سب سے اوپر صوبائی جرگہ تھا جس میں خدائی خدمت گاروں کی اعلیٰ کمان شامل تھی۔ تمام جرگہ ممبر منتخب کئے جاتے تھے اور یہ نظام ایک قسم کا متوازی نظم ونسق بن کر ابھرنے لگا۔ جو برطانوی حکومت سے کوئی سروکار نہ رکھتا تھا۔ خدائی خدمت گار جرگوں کے پہلو بہ پہلو رضا کاروں کی ایک تنظیم بھی تھی جو اعلیٰ کمان کی تعین کردہ پالیسی پر سختی سے عمل کرنے اور اسے نافذ کرنے کا حلف اٹھاتی تھی۔ عبدالغفار خان بذاتِ خود ماتحت افسروں کو مقرر کرتا تھا[1]

۲۱ - ۱۹۳۰ء کی ایجی ٹیشن :-

۲۳ / اپریل ۱۹۳۰ء کو عبدالغفار خان اور اس کے ساتھی بے چینی پیدا کرنے کے الزام پر گرفتار کر لئے گئے۔ جب اس کی گرفتاری کی خبر پشاور میں پھیلی تو شہر میں بلوہ پھوٹ پڑا۔ ہزاروں لوگوں نے سرخ قمیصیں پہن لیں اور جو کپڑا بھی ہاتھ لگا اسے سرخ رنگنے لگے۔ شہر میں فوج بلا

---

[1] - قیوم، ایضاً، ص ص ۔۲، ۔۔ فولیو

لی گئی اور ٹینک تنگ گلیوں میں گشت کرنے لگے۔ رائل گڑھوال رائفلز
کی دو پلٹنوں کو قصہ خوانی بازار کے ہجوم پر گولی چلانے کا حکم دیا گیا لیکن
انہوں نے انکار کر دیا۔ ان سے ہتھیار چھین لیے گئے اور انہیں برطانوی
سپاہیوں کی حفاظت میں ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد برطانوی سپاہیوں نے
ہجوم پر گولی چلائی اور بہت سے لوگ مارے گئے۔ کرفیو لگا دیا گیا اور ایک
سخت فوجی حکومت کے تحت امن و امان قدرے بحال کر دیا گیا۔

شورش کے پہلے ہی اشارے پر مخالفانہ لشکر پہاڑیوں میں اکھٹے
ہونے لگے۔ حاجی ترنگزئی ۲، ہزار آدمیوں کے ساتھ ضلع پشاور کے کنارے
پر منڈلاتا رہا۔ ۱۱ رمئی کو ۴ ہزار مداخیل اور خضر خیل وزیر ایک تحت
وادی ٹوچی کی دتا خیل چوکی کے سامنے نمودار ہوئے اور اس پر حملہ
کر دیا۔ اسی دن بارہ سو داوروں نے ایک اور قلعہ پر حملہ کیا ۲۵ مئی
کو مردان میں بلوہ شروع ہوا اور ایک برطانوی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ
پولیس ایک ہجوم کے ہاتھوں تخت بھائی کے قریب ٹکر پر مار دیا گیا۔
اس کے بعد ہجوم پر گولی چلائی گئی جس سے کافی لوگ مارے گئے اور
زخمی ہوئے۔ مئی کے آخری ہفتے میں ایک اتمان خیل لشکر شب قدر
کے قریب نمودار ہوا۔ آفریدی کئی ہفتوں سے خیبر میں کارروائیاں
کر رہے تھے اور جون کے اوائل میں ۵ ہزار کا ایک لشکر قلعہ جمرود
کے قریب اکٹھا ہو گیا۔ چار پانچ جون کی رات کو اس میں سے ۲ ہزار
نیچے اترے اور پشاور چھاؤنی پر براہ راست "مارو اور بھاگ جاؤ"

حملہ کیا جو سرحد میں اسی سالہ برطانوی حکومت کی علامت تھی۔

آفریدی چھاپے جو کبھی کبھار فرنٹیئر کانسٹیبلری کے بھیس میں ہوتے تھے پورے جون اور جولائی میں ضلع پشاور پر جاری رہے۔ نو دس جون کو ایک مخالف لشکر ہزارہ میں ظاہر ہوا۔ ۷ جولائی کو محسودوں نے سراروغہ اور احمدزئی تنگی کی پولیس چوکیوں پر حملے کئے۔ دیرا ور بنیر میں بھی شورش تھی اور وہاں کے بہت سے قبائلی حاجی ترنگزئی سے آملے۔ اگست کے پہلے ہفتے میں ۵ ہزار کا ایک اور آفریدی لشکر پشاور کے مضافات میں پہنچ گیا جہاں مقامی دیہاتیوں نے اسے خوش آمدید کہا اور اس کی حمایت کی۔

بالآخر ۱۵ اگست کو پورے سرحد میں مارشل لاء لگا دیا گیا اور فوج نے پنجاب اور ہندوستان کے دیگر حصوں سے جلدی جلدی جمع کی گئی یونٹوں کی کمک کے ساتھ برطانوی کنٹرول کو دوبارہ قائم کرنا شروع کیا۔ مہمند اور آفریدی لشکروں کو بمباری سے تتر بتر کیا گیا اور رزمک سے ایک مضبوط دستہ حرکت میں آیا اور کھجوری میدان پر قابض ہو گیا جو تیراہ کا دروازہ ہے اور آفریدیوں کی پسندیدہ چراگاہ بھی۔ قبائلی الاؤنس بند کر دیئے گئے اور ناکہ بندی کر دی گئی۔ ایف سی آر کے تحت خصوصی جرگے قائم کیے گئے تاکہ ہنگاموں میں شریک ہونے والوں پر مقدمات چلائے جا سکیں اور خدائی خدمت گار تنظیم کو توڑنے پھوڑنے کی ایک مربوط کوشش کی گئی۔

ان اقدامات سے تحفظ نو لسی حد تک حاصل ہو گیا لیکن اس

سے نہ تو بے چینی ختم ہوئی اور نہ ہی نظم و نسق اپنے اعتدال پر واپس آسکا
۱۹۳۱ء کے اوائل میں وہی علاقہ ابھی تک اتنا بے امن تھا کہ ضلع مردان
میں لگان اندازی قریباً ختم ہو کر رہ گئی تھی اور سرکاری افسر صرف
بھاری حفاظت میں ہی ادھر ادھر حرکت کر سکتے تھے۔

آخرکار برطانوی حکومت حرکت میں آئی تاکہ ہندوستان کی سیاسی
جماعتوں کے نمائندوں، حکومت ہند اور انڈیا آفس کے درمیان لندن
میں ایک گول میز کانفرنس کے ذریعے ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی بے چینی
اور ہل چل کا مداوا کیا جا سکے۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں وائسرائے لارڈ اروِن
اور گاندھی اس بات پر متفق ہو گئے کہ لندن کانفرنس کے دوران
کھلبلی معطل رہے گی۔

گاندھی ارون پیکٹ کے نتیجہ میں عبدالغفار خان کو بھی دیگر
سیاسی قیدیوں کی طرح جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اس مقام پر غفار خان کا
گاندھی کے ساتھ تعلق بالکل واضح نہیں ہے کیونکہ خدائی خدمتگار ابھی
تک رسمی طور پر انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ بہرکیف
غفار خان نے گاندھی کے وعدے کو نظر انداز کر دیا اور خدائی خدمتگاروں
نے سرحد میں پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ایجی ٹیشن دوبارہ
شروع کر دی۔ نئے تربیتی مراکز کھولے گئے اور قبائلی علاقے سے
رنگروٹ مشمولہ بہ کثیر التعداد محسود اور بھٹانی آنے لگے۔ غفار خان
نے مبینہ طور پر ملا فضل دین کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا جو مشہور [illegible]

محمود آتش بیان پوندہ ملا کا بیٹا تھا۔ خدائی خدمتگار لیڈر مہمند جرگوں کا بھی ایک محترم مقرر بن گیا اور اس قبیلے میں بھی خدائی خدمت گار یونٹ قائم ہو گئے۔ سب اضلاع میں پولیس کے اختیارات کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ اور برطانوی ڈاک برداروں پر حملے عام ہو گئے جسے برطانوی انتظامیہ اپنے اہم ترین مواصلاتی نظام پر ایک مربوط حملہ سمجھنے لگی۔ کوہاٹ اور بنوں کے ضلعوں میں پبلک اجتماعات پر پابندی تحریک کو مدھم نہ کر سکی، اور عموماً پرامن ڈیرہ اسماعیل خان میں بھی فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔

۱۹۳۱ء کے اواخر گرما میں عشروں سے برطانیہ کے وفادار خوانین بھی مالیہ کی ادائیگی روکنے لگے اور ان پرانوں میں سے بعض تو خدائی خدمتگاروں کے اجلاس میں بھی جانے لگے۔ اس بدعہدی کو روکنے کے لئے حبیب اللہ خان ابن ڈاکٹر خان صاحب کو گرفتار کر لیا گیا اور لینڈ ریونیو ایکٹ کے تحت اسے ایک نادہندہ کی حیثیت سے سزا دی گئی۔ اس سے کچھ متزلزل دل خوانین سیدھے قطار واپس آ گئے لیکن کسان خدائی خدمت گار جھنڈے تلے ہی اکٹھے ہوتے رہے۔

چیف کمشنر نے ۲۲ دسمبر کو ایک خصوصی دربار منعقد کرنے کا اعلان کیا جس میں برے اور سائمن کمشنوں کی سفارش کردہ اصلاحات کے نفاذ کا اعلان کرنا مقصود تھا۔ عبدالغفار خان اور خان صاحب نے دکھاوے کے طور پر دربار میں شرکت سے انکار کر دیا اور خدائی خدمت گاروں

نے اعلان کر دیا کہ مکمل حکومت خود اختیاری کے سوا کوئی اصلاح قابلِ قبول نہ ہوگی۔ انہوں نے یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو خان برادران کے وطنی گاؤں اتمانزئی میں ایک عوامی جلسہ بلا لیا۔

دریں اثناء راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ناکام ہو گئی اور گاندھی اروِن پیکٹ منسوخ ہو گیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۳۱ء کو حکومت نے خدائی خدمت گاروں پر پابندی لگا دی اور غفار خان، خان صاحب اور ان کے بیٹے سعداللہ اور ایک وکیل عطاء اللہ کو گرفتار کر لیا۔ فوج نے ضلعی پولیس اور فرنٹیئر کانسٹیبلری کی مدد سے اکثر خدائی خدمتگار مراکز تباہ کر دیئے اور تحریک کے قریباً ایک ہزار مقامی رہنماؤں کو حراست میں لے لیا۔ کوہاٹ میں فوج نے خدائی خدمتگاروں کے ایک بڑے جیش پر گولی چلا دی۔ جو حکومت کے اقدام پر احتجاج کے لیے اکٹھے ہوئے تھے اور چودہ مارے گئے اور تیس زخمی ہوئے۔

تھوڑے عرصہ بعد گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا اور کانگریس پارٹی پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے تحریک شروع کر دی۔ "مسلمانوں سے خریدو" مہم سرحد میں پھیل گئی اور بہت سے ہندو دکاندار اور ساہوکار جو سرحد کی اقتصادی رگوں کا خون تھے بدسلوکی اور غریبی کی نذر ہو گئے۔ مسلمان جنگجو تنظیمیں جیسے احرار اور خاکسار سرحد میں پھیل گئیں اور اس وار کی ہندوستانی سیاست کے عام فرقہ وارانہ عنصر نے پٹھان اور ہندو کے درمیان منافرت کو مزید تیز کر دیا۔

۳۲ - ۱۹۳۰ء کی شورشوں کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ ایک سرحدی بغاوت کو پہلی دفعہ افغانستان یا خود سرحد کی بجائے ہندوستان سے ترغیب و تشویق ملی تھی۔ انگریز اپنی حساس ترین سرحد کے اسلحہ خانہ کی دھماکہ خیز نوعیت سے بخوبی واقف تھے اور وہ بضد تھے کہ ہر کیس میں فتنہ و فساد کی جڑ کانگریس پارٹی تھی[۱] غالباً یہ ایک مبالغہ تھا لیکن اس میں کوئی شک و شبہ نہ تھا کہ اس سرزمین میں ایک نئی روح کارفرما تھی اور سرحد کی وہ روایتی لاتعلقی ختم ہو چکی تھی جو وہ باقی ماندہ ہندوستان کے معاملات سے محسوس کیا کرتا تھا۔

عبدالغفار خان یا بادشاہ خان ایک چھ فٹ چھ انچ لمبا پٹھان تھا۔ وہ بہت جلد سرحدی گاندھی بن گیا اور وہ مسلمہ طور پر دو معانی انداز میں مہاتما کا مداح تھا اور کانگریس پارٹی کے اصول اہمسا کا قائل۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں پیشہ ور کانگریسی تحریک بان سرحد میں بہت زیادہ تھے، اور کانگریس انگریزوں کو اتھل پتھل کرنے کے لئے اپنی کارروائیوں کے اس نئے علاقے کی امکانیات سے خوب آگاہ تھی۔ ایک دوسرے سے دور افتادہ قبائل اور دیہات کی طرف سے ایک ہی جیسے مطالبات و شکایات کسی ایسی مرکزی رہنمائی کا پتہ دیتے تھے جو سرحد سے نہ پھوٹتی تھی۔ آفریدیوں نے ضلع صفائی کے

---

[۱]- این ڈی ڈبلیو ایف پارڈر ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۳۱-۱۹۳۰ء ص ۲۔

مذاکرات کے دوران جو مطالبات پیش کئے ان میں نہ صرف عبدالغفار خان بلکہ گاندھی کی جیل سے رہائی کا مطالبہ بھی شامل تھا۔[1]

تاہم اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ پٹھان یا مخصوص قبائلی علاقہ میں رہنے والے بھی اکثر کانگریسیوں کی طرح اپنے کو ایک ایسی عوامی تحریک کا حصہ سمجھنے لگے تھے جو ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ خدائی خدمت گاروں کی بیشتر کامیابی اس میں مضمر تھی کہ تنظیم روایتی پٹھان انداز و اطوار کی حامل و عامل تھی۔ رزمک پالیسی کے جابرانہ نفاذ و سرحد کی سخت گیر اور مطلق العنان انتظامیہ کے خلاف جو بے چینی پیدا ہو رہی تھی تنظیم اس کے اظہار کا ذریعہ بنی۔ ایک لحاظ سے اس نے غالباً سرحد میں امن کا راستہ ہموار کیا کیونکہ اس نے سیاسی عمل کی راہیں مہیا کیں، جبکہ اس سے پہلے متشددانہ عمل ہی واحد طریقہ تھا۔ اس کے علاوہ اس میں سماجی و اقتصادی بہتری کے کچھ ابتدائی نئے خیالات بھی تھے، لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ایک پٹھان پارٹی تھی اور اس ابتدائی مرحلے میں کانگریس کے کنٹرول سے خاصی آزاد تھی۔

---

[1]- گورنمنٹ آف انڈیا "انڈیا" ۱۹۳۱ء (کلکتہ: سنٹرل پبلی کیشنز برانچ، ۱۹۳۱ء) ص ۶۵ (۱۹۲۹ء سے مورل اینڈ میٹیریل پراگریس رپورٹوں کی بجائے انڈیا پر سالانہ رپورٹیں شائع کی جانے لگی تھیں)

خدائی خدمت گاروں اور کانگریس کو ایک ہی وسیع بغاوت پسندانہ سازش کے حصے سمجھ کر برطانوی ارباب نظم ونسق نے سرحدی تنظیم کو کانگریس کے قریب لانے میں مدد کی جس کا مظاہرہ چوتھے عشرے کے آغاز اور وسط میں ہوا۔ خدائی خدمت گار بالآخر اگست ۱۹۳۱ء میں رسمی طور پر کانگریس سے منسلک ہو گئے جبکہ تحریک کافی چل چکی تھی۔ لیکن کانگریس نے گاندھی کی پرکار قیادت کے تحت خدائی خدمت گاروں کو شروع سے ایسی کامیابی کے ساتھ اپنا لیا کہ چھ سال بعد جب عبدالغفار خان اور اس کے ساتھیوں نے پہلے انتخابات میں صوبہ سرحد پر گرفت حاصل کر لی تو خدائی خدمت گاروں نے کانگرس مشین کے پرزوں کی حیثیت سے کام کیا۔

خدائی خدمت گار تحریک کے محرکات کچھ بھی ہوں سرحد کے برطانوی انتظام کاروں کے پاس چوتھے عشرے کے اوائل میں متفکر ہونے کی کافی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ پورے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو سیاسی ہل چل کے ذریعے للکارا جا رہا تھا۔ یہ تحریک ملک کے اکثر حصوں میں غیر متشدد تھی لیکن سرحد میں یہ پُر تشدد اور براہ راست تھی اور جوں جوں یہ آگے بڑھ رہی تھی اس میں مزید تشدد کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔

اصلاحات! ۱۹۳۱ء کی سرکاری بارڈر رپورٹ میں حکومت

کے لئے نئے اختیارات کا مطالبہ کیا گیا تاکہ سرحد میں "سیاسی پراپیگنڈا کی وسعت اور جہت دونوں کی قطعی حدود" مقرر کی جا سکیں[1]. لیکن جو طوفان ہندوستان کو اپنی آغوش میں لیئے ہوئے تھا یہاں بھی روکا نہیں جا سکتا تھا اور ۱۹۳۲ء میں صوبہ سرحد میں بھی درمیانی قسم کی سیاسی اصلاحات نافذ کر دی گئیں۔ "اُسے گورنری صوبہ" کا درجہ دے دیا گیا یعنی چیف کمشنر کی جگہ ایک گورنر نے لے لی اور قدرے حکومت خوداختیاری دے دی گئی۔ ایک ریٹائرڈ، غیر سیاسی سول سرونٹ سر عبدالقیوم صوبے کا پہلا وزیر بنا۔ ۱۹۱۹ء کی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے مطابق اصل اختیار گورنر اور اس کی ایگزیکٹو کونسل کے پاس تھا۔ لیکن بعض امور جیسے صحت، حفظان صحت اور تعمیرات عامہ وزارت کو "منتقل" کر دیئے گئے۔ لیکن ان معاملات میں بھی آخری اختیار گورنر کے پاس ہی تھا۔

امید تھی کہ یہ انتظام فرقہ وارانہ نمائندگی پر اتفاق سے مل کر (یعنی نمائندہ اداروں میں مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مخصوص نشستیں اور حلقہ ہائے نیابت جو لندن کی گول میز کانفرنسوں کا ایک ثمرہ تھا) مسلم احساسات کو مطمئن کر دے گا اور سرحد میں ہل چل کم ہو سکے گی۔

---

[1]- این ڈبلیو ایف بارڈر ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۳۱-۱۹۳۰ء، ص ۲

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اپنی خاصی قابلیت اور بلند پایہ فاتی امانت داری کے باوجود سر عبدالقیوم مقبول نہ ہو سکا کیونکہ اس کے پاس اختیار نہ تھا اور ثانیاً برطانوی انتظامیہ میں اس کی طویل ملازمت اور سیاسی روابط کا فقدان اسے برطانوی کٹھ پتلی کے الزام سے نہ بچا سکے۔

سر عبدالقیوم کے دورِ منصب کو فرقہ وارانہ نوعیت کے دو واقعات نے اور بھی مشکل بنا دیا اور انہوں نے صوبے اور قبائلی علاقے کے اندر جذبات برانگیختہ کر دیئے۔ ۱۹۳۵ء کے اواخر میں بنوں کے ایک پٹھان استاد نے مبیّنہ طور پر ایک ہندو لڑکی کو اغواء کر لیا اور اسے مسلمان بنا کر اس کا نام اسلام بی بی رکھا اور اس سے شادی کر لی۔ لڑکی کے والدین نے اس کی بازیابی کے لئے عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت نے اس کی واپسی کا حکم دیا اور سرحد کے طول و عرض میں فرقہ وارانہ فسادات رو نما ہوئے۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں ایک چھوٹی سی تاریخی مسجد، مسجد شہید گنج جو لاہور کے ایک سکھ گوردوارہ کی زمین پر تھی سرکاری حکام کی منظوری سے مسمار کر دی گئی اور سرحد میں ہل چل کی ایک اور لہر اٹھی۔

دونوں واقعات سے غفار خان اور خدائی خدمت گاروں نے ہندو زدہ کانگرس پارٹی سے تعلق کے باوجود خوب فائدہ اٹھایا۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ ایسے واقعات ایک بدیشی اور کافرانہ حکومت سے ہی سرزد ہو سکتے تھے اور انہوں نے سر عبدالقیوم کو بھی نشانہ تنقید

بنا یا کہ وہ ان واقعات پر احتجاج کرتے میں ناکام رہا۔ نیز ایک جنوبی وزیر ملا فقیر ایپی نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر وزیرستان میں نئی گڑبڑ پھیلا دی۔

غفار خان کو امن عامہ ایکٹ کے تحت سرحد بدر کر دیا گیا اور خدائی خدمت گاروں پر پابندی برقرار رہی، لیکن تحریک زیر زمین چلی گئی اور بادشاہ خان کی مقبولیت بڑھ گئی، کیونکہ اسے شہید سمجھا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۲ اگست ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا کے تحت ہندوستان میں ایک نیا دستور نافذ کیا گیا تو خدائی خدمتگار پہلے سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہو کر نکلے۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا کی پیچیدگیوں کا قصہ یہاں مناسب نہیں ہے لیکن اسے ۱۹۳۷ء میں ہی نافذ کیا جا سکا۔ یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ ایکٹ نے خاصی حد تک حقیقی نمائندگی مہیا کی اور صوبہ سرحد کو پہلی دفعہ کسی اصلاح کا پورا فائدہ ملا گو بعض روایتی پابندیاں بھی برقرار رکھی گئیں جو سرحد کے لئے مخصوص تھیں بالخصوص قبائلی علاقہ اور صوبہ کے روابط کے معاملات میں۔

ایکٹ کے نفاذ پر ہونے والے انتخابات میں سرحد کانگریس پارٹی نے جو زیادہ تر خدائی خدمتگار عنصر پر مشتمل تھی مقننہ میں پچاس میں سے انیس نشستیں جیت لیں جو ایک ٹھوس تعداد تھی۔ لیکن دوسرے صوبوں میں کانگریس اکثریتوں کے ساتھ مل کر فاتحین نے اس

وقت تک حکومت بنانے سے انکار کر دیا جب تک گورنر یہ وعدہ نہ کرے کہ وہ منتخب وزارتوں کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لئے اپنے خصوصی اختیارات استعمال نہ کرے گا۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح سرحد کے گورنر نے بھی اقلیتی گروہوں کو حکومت بنانے کے لئے کہا اور سر عبدالقیوم آزاد مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی نیم دلانہ حمایت پر ایک دفعہ پھر وزیراعلیٰ بن گیا۔ اسی مرحلے پر مردان کو پشاور سے علیحدہ کر کے ایک الگ ضلع بنا دیا گیا جس کا ایک جزوی مقصد یہ تھا کہ خدائی خدمتگار طاقت کے مرکز کو توڑا جائے۔

اگست ۱۹۳۷ء میں وائسرائے نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت گورنروں کے اختیارات پر ایک مصالحانہ بیان دیا جس کے بعد کانگریس نے حکومت کی ذمہ داری قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور سر عبدالقیوم کو ایک تحریک عدم اعتماد کے ذریعے (جو نو ووٹوں سے جیت گئی) موقوف کر دیا گیا۔ ڈاکٹر خان صاحب وزیراعلیٰ بنا اور حزب مخالف جو سر عبدالقیوم کے حامیوں اور چند آزاد مسلمانوں مشتمل تھا محمد علی جناح کی مسلم لیگ کے جھنڈے تلے چلا گیا۔

اگلے سال سرحد سیاسی ہندوستان کا ایک جزو لاینفک بنا رہا۔ جنگجو مسلمان خاکساروں کا رہنما، عنایت اللہ خان، کانگریس پارٹی کا اہم مسلمان رکن، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی سب صوبے میں آئے۔ گاندھی خود بھی دو دفعہ یہاں آیا اور اس

کی سرگرمیاں سالانہ انتظامی رپورٹ میں یوں نہایت اختصار سے بیان کی گئیں۔ "مسٹر گاندھی یکم مئی کو پشاور آیا اور ۹ر کو چلا گیا، مسٹر گاندھی کی روانگی سے ایک دن پہلے پشاور کے شاہی باغ میں ایک سیاسی کانفرنس ہوئی۔ باغیانہ قسم کی قرار دادیں منظور کی گئیں"۔[1]

۱۹۳۹ء میں جنگ عالمگیر دوم شروع ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی کانگرس نے فیصلہ کیا کہ وہ جنگی مساعی میں برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کرے گی۔ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت بھی دیگر کانگرسی ہندوستانی وزارتوں کی طرح مستعفی ہو گئی ۱۹۴۲ء میں جب گاندھی کی تحریک عدم تعاون اپنے جوبن پہ تھی تو سرحد میں سرخپوشوں کی زیر سرکردگی وسیع پیمانے پر گڑبڑ ہوئی۔۱۹۴۳ء میں محمد علی جناح نے اتفاق کر لیا کہ جہاں ممکن ہوا وہ مسلم لیگ کی وزارتیں قائم کر لیں گے اور سردار اورنگ زیب خان صوبہ سرحد کے مسلم لیگی وزیر اعلیٰ بن گئے۔ قانون ساز اسمبلی میں کانگرسی اکثریت نے اجلاس کا مقاطعہ کیا اور لیگ بعض آزاد ارکان کی مدد سے خاتمۂ جنگ تک حکومت چلاتی رہی جب کانگرس دوبارہ نمودار ہوئی اور حکومت سنبھال لی۔ جنوری ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں خدائی خدمت گاروں نے پھر اپنی قوت کا مظاہرہ کیا اور کانگریس نے

---

[1] ۔ این ڈبلیو ایف پی ایڈ منسٹریشن رپورٹ ۳۹ - ۱۹۳۸ء، ص ۱۱۱

ایسی آرام دہ اکثریت حاصل کر لی کہ ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت چلتی رہی۔

اس حکومت کا خاتمہ ایک آئندہ باب میں زیرِ بحث آئے گا لیکن یہ حقیقت کہ جنگجو مسلمان پٹھان سرحد آزادی سے پہلے عشرہ میں کانگرس کا ایک گڑھ بنا رہا، ہندوستانی سیاسی تاریخ کا ایک بڑا معمہ بنا ہوا ہے۔ عبدالغفار خان کی ذاتی مقناطیسیت ہر اس شخص پر فوراً عیاں ہو جاتی ہے جس نے کبھی اس سے ایک لمحہ بھی گفتگو کی ہو۔ علاوہ ازیں اتمانزئی کے ایک قدیم معزز خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس کا مرتبہ اور مہمند لیڈر حاجی ترنگزئی کے ساتھ اس کا رشتہ ناطہ اس بات کے مظہر تھے کہ وہ پٹھانوں کی خاصی تعداد کی قیادت کا حق رکھتا تھا۔ مزید برآں اس نے خدائی خدمت گاروں کو ایک خالص پٹھان پارٹی رکھا جس کے مقاصد مقامی تھے اور یوں اس نے اسے پٹھانوں کے مبہم قومی احساسات کا ایک دلکش ذریعۂ اظہار بنا دیا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ غفار خان ایک عوامی رہنما تھا۔ اس نے غریبوں کے لئے ایک طویل اور سخت جدوجہد کی اور ان کے لئے نہ صرف انگریزوں بلکہ ان کے اپنے ارباب و خوانین کے غلبے کے خلاف بھی لڑا۔ اس نے خدائی خدمت گاروں کا ایک جداگانہ وجود قائم رکھا جو "عام پٹھان" کے مفادات کے لئے وقف تھا۔ اس نے انہیں

ان کی زیر کاشت زمینوں کی ملکیت اور ان کے زمینداروں کے مکانات کا قبضہ دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ بتدریج خوانین اپنی حیثیت کو بچانے کے لیے مسلم لیگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ علاوہ ازیں انگریزوں نے انہیں چھوڑ کر نئے نظام کے لیے کانگرس سے جو ساز باز شروع کی تھی اس کا انتقام لینا بھی اسی طرح ممکن تھا۔

غفار خان کا گاندھی اور کانگرس سے تعلق اور منحنی سے گجراتی بنیئے کے لئے قوی ہیکل پٹھان کا احترام آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ غفار خان گاندھی کے بعض سماجی و اقتصادی اصولوں کا قائل تھا لیکن شروع میں ہی خدائی خدمت گاروں کو کانگرس سے ملانے کا اس کا مقصد اپنی تنظیم کو بچانا اور اس کے لئے قومی پشت پناہی حاصل کرنا تھا۔ آہستہ آہستہ خدائی خدمت گار کانگرس کے ساتھ یک جان دو قالب ہو گئے۔ چوتھے عشرے میں غفار خان کے ذہن میں یہ قدیم اصول مسلسل موجزن رہا۔ "میرے دشمن کا دشمن میرا دوست ہے"۔ غفار خان کا دشمن انگریز تھا اور انگریز پر کوئی اور ایسی موثر چوٹ نہیں لگا رہا تھا جیسی مہاتما۔

یہ غیر قدرتی اتحاد انگریزی حکومت کے خاتمہ تک جاری رہا اور اکثر خدائی خدمت گاروں نے ۱۹۴۷ء کے ریفرنڈم میں ہندوستان کی بجائے پاکستان کے حق میں ووٹ دینا بھی گوارا نہ کیا لیکن ایک دفعہ جب فیصلہ ہو گیا اور سرحد نے پاکستان کا انتخاب کر لیا تو

خدائی خدمت گار تیزی سے منتشر ہونے لگے۔ مسلمان مملکت کی قبولیت میں بلاشک وشبہ ۱۹۴۷ء کے موسم خزاں کے فرقہ وارانہ کشت وخون اور جلد ہی بعد کشمیر کے جہاد نے اہم کردار ادا کیا۔ جلد ہی غفار خان ایک آزاد پٹھان ریاست کے مؤقف میں قریباً اکیلا رہ گیا۔ یہ اور بٹوارے کے پُرجوش دنوں کے دیگر واقعات آئندہ باب دہم میں زیرِ بحث آئیں گے۔

---

(۱۳۱) باب نہم

قبائلی بغاوت

تعارف:۔

پٹھانوں کی عسکری اور سیاسی تاریخ دیگر ہر بات سے زیادہ بغاوت کی ایک کہانی ہے۔ انہوں نے مغلوں، اپنے ہم نسل خاندانوں اور سکھوں کے خلاف بغاوتیں کیں۔ سب سے زیادہ انہوں نے برطانوی ہند کے خلاف بغاوت کی۔ بغاوت، اس کا نظریہ، اس کا عمل اور اس کے ثمرات ہی ہندوستان کے شمال مغربی کونے میں برطانوی حکومت کی تاریخ میں پٹھانوں کے اہم سردار کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اس بغاوت کے متعلق پٹھانوں کے مرتب کردہ اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں اور برطانوی اعداد و شمار بھی ادھورے ہیں۔ بیسویں صدی کی چھوٹی چھوٹی مہمات کے مفصل حالات اب بھی نہیں ملتے۔ لیکن جتنے اعداد و شمار ملتے ہیں وہ متاثر کن ضرور ہیں۔

امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا کے مطابق ۱۸۴۹ء سے ۱۹۰۲ء تک سرحدی

قبائل کے خلاف پچاس (۴۵) مہمات بھیجی گئیں۔[1] ۱۹۰۲ء سے ۱۹۴۱ء تک مہمات کی متناسب تعداد قائم رہی

انیسویں صدی کی مہمات میں بر سر کار فوجی ۲۸۰ (اتمان خیل کے خلاف ۱۸۷۸ء میں) سے لے کر ۴۰ ہزار (آفریدیوں اور اورکزئیوں کے خلاف، ۱۸۹۷ء میں) تک رہے۔ پٹھان جنگ وجدل کی روایت کے مطابق مقتولین و مجروحین عموماً کم رہے یعنی دو فیصد سے بھی کم گو ۱۸۶۳ء میں سید احمد کے پیروؤں کے خلاف مہم میں برطانوی افواج کو دس فیصد تک جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ بیسویں صدی میں جب قبائلی اسلحہ بہتر ہو گیا اور جدوجہد زیادہ تلخ ہو گئی تو یہ شرحیں بڑھ گئیں۔ پورے دور میں بغاوتیں باقاعدہ ہوتی رہیں۔ صرف ایک یا دو دفعہ ہی پانچ سال کا عرصہ بلا مہم گزر سکا۔ پُر فتنہ ایام میں پانچ مہمات سالانہ بھی عام تھیں۔

برطانوی حکومت کے ابتدائی سالوں میں بغاوت :-

مہمات کی تعداد اور حجم سے زیادہ اہم ان بغاوتوں کا مزاج اور محرکات تھے۔ ابتداء میں انگریزوں اور پٹھانوں کے درمیان اکثر معرکے سیدھے سادے اور غیر سیاسی تھے۔ نئے ارباب نظم ونسق اپنی موجودگی کا ثبوت دے رہے تھے اور قبائلی جو نئی حکومت کو زیادہ

---

[1] دی امپیریل گزیٹر آف انڈیا، جلد ۱۹، ص ص ۲۰۸ تا ۲۱۰

سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے اپنی آزادی کا ثبوت دے رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انتظامی سرحد کے اندر کے تمام قبائل میں سے صرف چند یوسفزئی دیہات میں بغاوت ہوئی اور سپاہیوں کی عظیم بغاوت جس نے پشاور کے برطانوی انتظام کاروں کو حواس باختہ کر رکھا تھا۔ قبائل سے قریباً بلا ارتعاش گزر گئی۔ ۶۰-۱۸۵۹ء میں ایک طرف برطانیہ اور دوسری طرف کابل خیل وزیروں اور محسودوں کے درمیان وزیرستان کے مواصلاتی راستوں پر کنٹرول کے سلسلہ میں رسہ کشی شروع ہوئی تو اس سے بالاوقاف لڑائی شروع ہو گئی اور محسودوں نے ٹانک تباہ کرنے کی کوشش کی۔ محسود علاقے پر حملے کی ایک برطانوی کوشش ناکام ہو گئی اور قریباً بارہ سال تک محسودوں اور انتظامیہ کے درمیان رابطہ منقطع رہا۔ کیونکہ انگریزوں نے ایک غیر مسلسل ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ ۸۰-۱۸۷۸ء کے دوران آفریدیوں، مہمندوں، اتمشتوں، بھٹانیوں اور کابل خیل وزیروں کے خلاف چھوٹی چھوٹی مہمات کا ایک سلسلہ ضروری ہو گیا تاکہ دوسری جنگ افغان کے دوران برطانوی وقار اور مواصلات کو محفوظ رکھا جا سکے۔

لیکن ۱۸۴۹ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان سرحد میں بے چینی کا بڑا سبب سید احمد کے پیروکار رہتے تھے جو قبائلی علاقے کے دور افتادہ اور ناقابلِ رسائی حصوں میں مسلسل موجود تھے۔ قبائل سید کے پیروکاروں کا زیادہ طویل اوقات تک تو کبھی ساتھ نہ دے سکے لیکن یہ پیروکار

کبھی کبھار قبائل کو مذہبی جنون کے بل پر اکسا دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ کافروں کے خلاف ایک اور جہاد کی صورت میں نکلتا جنگی موجودگی اب جیسے جیسے پھیلتی جا رہی تھی ویسے ویسے ہی دل آزار ہوتی جا رہی تھی۔

سید کے پیروکاروں اور ان کے قبائلی اتحادیوں کے خلاف بڑی مہم ۱۸۶۳ء میں لڑی گئی اسے امبیلہ مہم کہا جاتا ہے کیونکہ زیادہ تر لڑائی اسی اہم درۂ امبیلہ کے قریب ہوئی۔ گزشتہ سال سید کے پیروکاروں نے انگریزوں کے خلاف اپنے میعادی جہاد کا اعلان کیا تھا۔ شمالی یوسفزئی علاقے کا بیشتر حصہ سرحدی چھاپوں کے جواب میں انگریزوں نے زیر ناکہ بندی رکھا ہوا تھا لہٰذا قبائلیوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سید کے پیروکاروں سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ بنیر وال بھی آملے اور اتمان خیل اور مہمندوں کے طائفے اور دیر، سوات اور باجوڑ کے مخلوط گروہ بھی شریک ہو گئے۔ ۹ ہزار سے زیادہ برطانوی فوجی درّہ امبیلہ کی چوٹی پر جمع ہو گئے تھے۔ ان کا محاصرہ کر لیا گیا اور انہیں بری طرح بیرونی دنیا سے کاٹ دیا گیا۔ ایک ماہ سے زیادہ تک وہ اِدھر اُدھر نہ ہل سکے۔ دریں اثناء قبائل مذہبی گروہ سے بھی لڑ پڑے اور آپس میں بھی اور ان کا حملہ اپنی منطقی انتہا تک نہ پہنچ سکا۔ لڑائی کے نتائج فیصلہ کن نہ تھے لیکن سید کا گروہ مزید شمال کی طرف بنیر میں دھکیل دیا گیا۔

۱۸۶۸ء میں ۱۵ ہزار برطانوی سپاہی دریائے سندھ کے

مشرقی طرف کوہ سیاہ کے ساتھ ساتھ مارچ کرتے ہوئے نہایت طمطراق سے گزرے۔ اس کا مقصد زیادہ تر برطانوی قوت کا مظاہرہ کرنا اور سید کے باقیات کو ڈرانا تھا جو وہاں بھاگ گئے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی خاص جنگی مقصد نہ تھا۔

آٹھویں اور نویں عشرے میں مزید بغاوتیں اور مہمات ہوئیں لیکن ان کے پیچھے نہ کوئی جامع پالیسی تھی نہ مقصد اور پہاڑیوں میں انگریز راج اور پٹھان طاقت کے درمیان کوئی فیصلہ کن معرکہ آزمائی نہ ہو سکی۔ شاید ہی کوئی ایسا انگریز ہو جو امن اور ترقی کی آمد آمد کا متوقع ہو، البتہ یہ اغلب معلوم ہوتا تھا کہ تالیف قلب اور برداشت تدریجی طور پر بالآخر، پٹھانوں اور انگریزوں دونوں کو ایک قابلِ قبول سطح تعلق پر لے آئیں گے۔

فارورڈ پالیسی کے خلاف بغاوت ہر

لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ آخری عشرے میں تو مستحکم فارورڈ پالیسی کے دباؤ کے تحت سرحدی جنگ اور سیاسیات کی آب و ہوا بدلنے لگی۔ برطانوی قوت کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ ہو رہا تھا اور اس کے پیچھے پہاڑیوں پر دست درازی کر رہے تھے سنڈیمن کی گومل تک پیشقدمی نے بعض جنوبی قبائل کے بلا روک ٹوک افغانستان آنے جانے کے راستے کاٹ دیئے تھے اور وزیروں اور

محسودوں میں دوبارہ بدامنی شروع ہوگئی تھی۔ قبائلی علاقے کے مقابل سرے پر کوہ سیاہ کے قبائل اس پر برانگیختہ تھے کہ انگریزوں نے پہاڑ کی چوٹی پر سے ایک مہم بھیج کر ۱۸۶۸ء کا کارنامہ دہرانے کی کوشش کی تھی چنانچہ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں قبائل نے فوج کو پہاڑ سے واپس دھکیل دیا۔ ۱۸۹۱ء کے اوائل میں ایک برطانوی دستہ جو کوہ سامانہ کی رفعتوں کے ساتھ ساتھ پکٹ تعمیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اورکزئیوں کے حملے کی زد میں آگیا اور اسے پسپا ہونا پڑا۔ (کوہ سامانہ کرم کو تیراہ سے الگ کرتا ہے)۔

۱۸۹۴ء میں انگریزوں نے وزیرستان اور افغانستان کے درمیان ڈیورنڈ لائن کی حد بندی کی کوشش کی تو پوندہ ملّا کے تحت محسودوں کی ایک بہت بڑی بغاوت ہوئی۔ اس کا نقطۂ معراج وانا میں برٹش باؤنڈری کمشن کے کیمپ کی تباہی تھا۔ اس کے بعد انگریز ٹوچی وادی پر براہ راست قائم کرنے کے لئے بڑھے جو کمزور اور رضامند دوڑوں کا علاقہ تھا۔ کوہاٹ سے پٹھانی نمک اہلِ کوہ کی اضلاع سے بہت بڑی درآمد تھی لیکن انگریزوں نے اس پر ٹیکس آٹھ آنے سے بڑھا کر دو روپے فی من (قریباً اسی پاؤنڈ) کر دیا تو ۱۸۹۷ء کے موسم گرما تک پورا سرحد سلگنے لگا۔

برطانوی فوجی قوت میں اضافہ، اضلاع میں انتظامیہ کی سخت گیری اور ان دونوں کی پہاڑیوں میں توسیع سے اکثر قبائلیوں

نے یہ سمجھا کہ ان کی پہاڑیاں عنقریب پورے طور پر برطانوی ہند کے ڈھانچے میں ختم کر دی جائیں گی۔ اسے انہوں نے صحیح طور پر زندگی اور موت کا سوال سمجھا۔ یونانی ترکی جنگ کے مبالغہ آمیز بیانات نے جلتی پر تیل کا کام کیا کیونکہ اس سے اسلام کے خلاف ایک لمبے چوڑے لیکن ناکام عیسائی جہاد کا پتہ چلتا تھا۔ آخری سختی برطانیہ کے ناقابل فہم انکار نے پیدا کر دی۔ جو بعض قیدی عورتوں کو آفریدیوں کو واپس کرنے سے متعلق تھا جو قبائیلیوں سے بھاگ کر زیر انتظام ضلعوں میں پناہ گزین ہوئی تھیں۔

وقت آپہنچا تھا کہ پٹھانوں اور انگریزوں کے درمیان واقعی قوت کا پہلا مظاہرہ و مقابلہ ہو۔ غالباً دونوں کم از کم کسی حد تک سمجھتے تھے کہ کیا ہو رہا تھا۔

۱۸۹۷ء کی بغاوت

۱۰ر جون ۱۸۹۷ء کو ٹوچی کا ایک پولٹیکل افسر مسٹر گی، میزار میں پہنچا جو ٹوچی وادی کے بالائی حصہ میں چھوٹے چھوٹے دیہات کا ایک جھرمٹ تھا اور مدا خیل وزیر اس میں آباد تھے۔ گی کا فوری مقصد یہ تھا کہ قرب و جوار میں ایک چھوٹا سا قلعہ بنانے کے لئے جگہ کا انتخاب کر سکے۔ میزار دیہات پچھلے سال ایک ہندو کو مارنے پر سرکار کے زیر عتاب تھے اور انہوں نے عائد کردہ

جرمانہ ابھی ادا نہ کیا تھا۔ گی کی غیر متوقع آمد اور اس کے ساتھ ایک غیر معمولی حفاظتی دستے نے انہیں ڈرا دیا۔ قبائیلوں نے اپنے ہی ضابطۂ اخلاق یا پختون ولی کی بہت بڑی طرح خلاف ورزی کی جو اس قبیل کی شاذ و نادر سرگرمیوں میں سے ایک تھی۔ گی اور اس کے رفقاء کو خوش آمدید کہہ کر اور انہیں کھانا کھلا کر انہوں نے بلا تنبیہ انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ اکثر برطانوی فوجی افسر مارے گئے لیکن گی اور دستے کا کچھ حصہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

میزار حملے کی خبر سرحد کے طول و عرض میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سوات میں ایک بنیر وال سید اللہ نامی المعروف بر ملّا مستون (جسے انگریز دیوانہ ملا کہتے تھے) نے جہاد کا اعلان کر دیا۔ جولائی کے آخر میں اس نے اپنے ارد گرد چند لڑکے اور جوان اکٹھے کر لئے جن میں سے ایک کو اس نے شاہِ دہلی بنا دیا اور وہ جنوب میں درّہ مالاکنڈ کی طرف چل پڑے۔ چند دنوں میں ۲۰ ہزار قبائلی اس کے گرد جمع ہو گئے جنہوں نے چک درّہ اور خود درّے میں برطانوی چوکیوں پر ایک ہی وقت حملے کر دیئے۔ ایک ہفتے کی لڑائی میں ملّا کی طرف ۳ ہزار اور انگریزوں کی طرف چند سو کے جانی نقصانات کے بعد لشکر شتابی اور پُراسراریت سے جمع ہوئے تھے اسی سے وہ تتر بتر ہو گئے۔

اگلے مہینے مہمندوں کی باری آگئی۔ ۷ اگست کو ۵ ہزار کا

ایک لشکر جس میں قریباً ہر مہمند خیل کے عناصر تھے۔ اڈّا مُلا نجم الدین کی زیرِ سرکردگی ضلع پشاور کے سرے پر شبقدر میں نمودار ہوا۔ قبائلیوں نے ایک قریبی گاؤں کو تباہ کر دیا جس میں کافی ہندو بھی رہتے تھے اور پشاور سے بہ عجلت تمام بھیجے گئے ایک فوجی دستے سے لڑے بغیر پہاڑیوں میں واپس چلے گئے۔

ایک ہفتہ بعد اورکزئیوں نے سامانہ چوٹی پر قائم کردہ چند برطانوی چوکیوں پر چوری چھپے گولیاں چلانا شروع کر دیں اور ان کا رابطہ منقطع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ خیبر میں بھی اسی قسم کی مہم مُلا سید اکبر کے تحت چلی اور مہینے کے آخری ہفتے تک پورا درّہ آفریدیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ خیبر ملیشیا کے بعض یونٹ جو درّے میں متعیّن تھے فرار ہو گئے لیکن بعض نے مقابلہ کیا اور مغلوب ہو گئے۔ حالانکہ ان کے برطانوی افسر شروع میں ہی واپس بلا لئے گئے تھے۔ (موخرالذکر اقوام نے بھی برطانوی معیارِ رویّہ کے لئے قبائلی احترام میں کوئی اضافہ نہ کیا) ستمبر کے آغاز میں ۱۵ ہزار سے زیادہ پر مشتمل آفریدی اور اورکزئی لشکر پہاڑیوں کے کناروں پر پھرتے پھراتے رہے اور ہانگو کے قصبے کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ وسط ماہ تک پشاور اور کوہاٹ سے کمک یافتہ برطانوی دستے پہنچنے لگے تو لشکر واپس تیراہ کی وادیوں میں چلے گئے۔

اس پر بغاوت کا جنگی مرحلہ تو ختم ہوا لیکن انگریزوں

نے تالیف و تادیب کو ضروری سمجھا اور اس پر تین سال سے زیادہ لگے اور کل ۷۵ ہزار سے بھی زیادہ سپاہی حرکت میں رہے۔ مہمندوں، اورکزئیوں، آفریدیوں اور وزیریوں کے خلاف اور سوات میں مہمات بھیجی گئیں۔ صرف تیراہ پر حملے میں ۱۸۹۸ء میں ۴۰ ہزار سے زیادہ فوجی سرگرم عمل رہے۔ ۱۰ ہزار کی مالاکنڈ فیلڈ فورس دجواب اپنے ایک غیر اہم ترین رکن، ایک نوجوان سب آلٹرن ونسٹن چرچل نامی کی وجہ سے بے حد مشہور ہے) بھاری مزاحمت کے باوجود سوات اور بنیر میں نفوذ کر گئی۔

بھاری جرمانے عائد کئے گئے، بے شمار رائفلیں ضبط کر لی گئیں۔ مارچ کے راستوں پر سڑکیں بنائی گئیں اور بالجبر اکٹھے کئے گئے جرگوں سے امن وامان کے وعدے لئے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالات اپنی اصلی کیفیت پر لوٹ گئے۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ محسودوں نے جو معمولی سے اشتعال پر ہی جنگ پر اتر آتے ہیں، ۱۸۹۷ء کی بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن وہ پوندہ ملا کے زیر قیادت اگلے تین سال کے لئے مخالفت اور جارحیت کا ارتکاب کرتے رہے اور بالآخر ان کے مجموعی جبر و تشدد پر انہیں ایک لاکھ روپے جرمانہ کیا گیا۔ انکار پر دسمبر ۱۹۰۰ء میں ان کی ناکہ بندی کر دی گئی جواباً محسودوں نے قبائلی علاقے کی پولیس اور ملیشیا چوکیوں پر حملے کئے اور ضلع بنوں کے کافی اندر کئی چھاپے مارے۔ برطانیہ

نے جوابی کارروائی کے طور پر ۱۲ ہزار سے زیادہ فوجیوں کو محسود علاقے میں بھیجا جو شورش پسند قبائلیوں کو تو مغلوب نہ کرسکے لیکن چند سالوں کے لئے قدرے امن وامان ضرور قائم ہوگیا۔

کرزن نے فوجوں کو واپس انتظامی سرحد کے اندر بلانے کا جو عمل شروع کیا تھا وہ ۱۹۰۲ء میں مکمل ہوا اور اس سے تناؤ کافی کم ہوگیا اور ایک غیر معمولی نسبتاً پرامن طویل دور شروع ہوا۔ لیکن یہ قابل غور ہے کہ آخر سرحد پہلے کیوں پھٹ پڑا تھا؟

۱۸۹۷ء کی بغاوت کے محرکات

۱۸۹۷ء کی بغاوت کے اسباب پر ہم عصر برطانوی آراء مختلف اور منقسم تھیں۔ بعض افسروں کو یقین تھا کہ سرحد بھر میں شورش زدہ علاقے سے انگریزوں کو نکالنے کے لئے ایک بڑی سوچی سمجھی اور مربوط کوشش تھی۔ دوسروں کا خیال تھا کہ واقعات اضطراری اور غیر مربوط تھے۔ بعض انہیں مذہبی جنون سے منسوب کرتے تھے۔ زیادہ دوراندیش انہیں برطانوی پیش قدمی کے خلاف ایک ردعمل سمجھتے تھے جو جو تھے عشرے میں قبائلی علاقہ میں دیکھنے میں آرہی تھی۔

گو معلومات جزواً جزواً ہیں تاہم ایسی کوئی شہادت موجود نہیں کہ حملوں میں ملوث قبائل میں کوئی مشترکہ منصوبہ بندی ہوئی تھی۔ حقیقت

یہ ہے کہ کوئی قبیلہ بھی یا تنظیم نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ایسا رہنما تھا جو مذاکرات کا اہل ثابت ہو سکے۔ لہٰذا اکثر متعلقہ برطانوی افسر آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ شورشیں الگ الگ بلا ارادہ اور اتفاقی طور پر ہم وقت تھیں[1]۔ مربوط منصوبہ بندی کے فقدان کا ثبوت تو یہیں سے مل جاتا ہے کہ محسود اس وقت اٹھے جب باقی تمام قبائل واپس آ گئے تھے یا پسپا ہو چکے تھے۔ انگریزوں پہ حملوں کے اوقات و مقامات کا تعین زیادہ تر اس وقت برطانوی افواج و عمال کی تعیناتی سے مطابق کیا گیا جب مختلف قبائل نے میدان میں کودنے کا فیصلہ کیا۔ جہاد کی دعوت کسی ایک رہنما نے نہیں دی بلکہ درجنوں مقامی رہنماؤں نے اپنے اپنے طور پر دی، گو ان میں سے بعض، خاص طور پر زیادہ تر ملا ایک دوسرے، ہندوستان میں اپنے محترم رفقاء اور شاید ترکی میں اپنے رفقاء سے تعلق رکھتے تھے[2]۔ بغاوتوں میں مذہبی جنون نے یقیناً ایک اہم کردار ادا کیا۔ سوات کے ملا مستون کے متعلق مشہور تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کراماتی طاقت دی تھی۔ محسودوں کی بغاوت عین محرم کے قریب ہوئی جو انتہائی مذہبی جذبہ کا دور ہوتا ہے اور یہ غالباً سراسر اتفاقی نہیں تھی۔

1۔ پارلیمنٹری پیپرز ۱۸۹۸ء، جلد ۶۳، این ڈبلیو ایف ۸۷۱۳، ۹۳ فوبیو

2۔ ایضاً

لیکن جیسا کہ ڈیویلیس نے ۱۸۹۷ء کی بغاوت کا محتاط اور مفصل مطالعہ کرنے کے بعد نتیجہ نکالا ہے کہ اس کا بڑا سبب غالباً فارورڈ پالیسی تھا۔ وہ لکھتا ہے "سرحدی پٹھان کے لئے ایک مہیب پنجہ فولادی نمودار ہوا جس کی انگلیاں آخری عشرے میں اس کو اپنی گرفت میں لیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ برطانوی افواج سے معمور ان تھلگ قلعے اس کے علاقے میں سے گزرتے ہوئے تجارتی راستوں پر نظریں جمائے ہوئے تھے یا اس کے ولدیتی گاؤں یا بلند و بالا کھیتوں کو گھورتے تھے۔ چمکدار سفید سڑکیں سانپوں کی طرح بل کھاتی ہوئی اس کے پہاڑی قلعوں کو گھیرتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ حد بندی کمشن کے نقش قدم پر سفید سرحدی برجوں کی لمبی لمبی قطاریں ابھر آئی تھیں جو اس کے علاقے کو گھیر رہی تھیں اور اس کی آزادی کو مخدوش کر رہی تھیں جو اس کا سرمایہ افتخار تھی۔"[۱]

سوات سے وزیرستان تک اس پر پٹھان کا ردعمل جانے بوجھے تشدد کی بجائے جبلی تھا۔

زکا خیل!

۱۹۰۸ء میں زکا خیل آفریدیوں کے خلاف برطانوی مہم اداخر

۱۔ ڈیویلیس، ایضاً، ص ۹۸

صدی کی شورشوں پر ایک قسم کا فٹ نوٹ یا حاشیہ ہے۔ سرحد میں بیسویں صدی کے پہلے عشرے کی ہر چیز کی مانند یہ ۱۸۹۷ء کی بغاوت سے متعلق تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا ایک اپنا تاثر بھی تھا جو اس مشہور ترین آفریدی طائفے سے مخصوص تھا۔

زکا خیل پیدائشی قزاق تھے اور وہ اس پر نازاں تھے۔ وہ ادخانوں، انگریزوں، ہر قومیت کے راہگیروں، دیگر آفریدی خیلوں حتیٰ کہ ایک دوسرے کو بھی لوٹتے تھے۔ سب سے زیادہ وہ میدانوں کے امیر ہندوؤں کو لوٹنا پسند کرتے تھے۔ وہ افغانستان اور سرحد کے دوسرے حصوں کے چوروں کے گروہوں کی مدد کرتے اور انہیں پناہ دیتے تھے، ۱۸۹۷ء کے واقعات کے بعد "امن بے امن" کے دور میں زکا خیل علاقہ خیبر کے بالائی حصوں میں چوروں کا ایک چاق وچوبند گروہ بن گیا۔

ستمبر ۱۹۰۴ء میں ایک زکا خیل گروہ نے ضلع کوہاٹ کے ایک امیر ہندو سوداگر کو اس کے گھر میں لوٹا اور قتل کر دیا اور تعاقب کنندگان میں سے پانچ کو مار دیا اور چھ کو زخمی کر دیا۔ یکے بعد دیگرے پشاور کے مضافات میں مزید چھاپے مارے گئے۔ دولت ملنے کے ساتھ ساتھ چھاپہ ماروں کا اسلحہ بھی بہتر ہو گیا اور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک زکا خیل اور ان کے ہم پیشہ افراد نے سرحدی علاقے اور اضلاع کوہاٹ و پشاور میں دہشت پھیلا

وہی۔ رائفلیں بڑی تعداد میں خلیج فارس سے براستہ افغانستان و بلوچستان ناجائز طور پر درآمد کی گئیں اور زکا خیل قانون شکنوں کے گروہ دیہات پر حملے کرتے۔ پولیس پارٹیوں کی گھات لگانے اور باقاعدہ فوجیوں سے ٹکر لینے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے لگے۔ ایک موقع پر زکا خیل نے پشاور کے ایک ای اے سی کو بھی اغواء کرنے کی کوشش کی ۲۸ جنوری ۱۹۰۸ء کو ایک زکا خیل گروہ نے پشاور شہر کے اندر ایک امیر ہندو ساہوکار چیلا رام کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور ایک لاکھ روپے کی لوٹ مار کر کے رفوچکر ہو گیا[1]

زکا خیل جائز طور پر بہت عرصے سے اپنے وظائف سے محروم ہو چکے تھے اور ۱۹۰۸ء تک ان پر اتنے جرمانے ہو چکے تھے کہ وہ نہ صرف ضبط شدہ وظائف بلکہ مزید تین سالوں کے وظائف کی رقومات کے برابر تھے۔ نتیجتاً ان کے خلاف ایک مہم بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ برطانوی افسروں کے درمیان اس مسئلہ پر کافی بحث مباحثہ کے بعد کہ آیا زکا خیل علاقہ مستقل نظم و نسق کے تحت لایا جائے یا نہ لایا جائے یا اس پر محض ایک حملہ کیا جائے۔ بالآخر ایک دستہ روانہ ہوا جسے غالباً پہلی دفعہ دیگر آفریدی خیلوں کا کسی قدر

---

[1] ۔ پارلیمنٹری پیپرز، ۱۹۰۸ء جلد ۷۴، این ڈی ڈبلیو ایف ۱۔۲۲، ص ۳

تعاون حاصل تھا۔

کچھ معمولی لڑائی کے بعد بدنام ترین ڈاکو گروہ سرحد پار بھاگ گیا۔ زکا خیل ملوک نے پشیمانی کا اظہار کیا اور دیگر آفریدی طائفوں نے زکا خیل کے اچھے رویّہ کی ذمہ داری قبول کر لی اور یوں برطانوی راج کے خلاف زکا خیل کی ذاتی بغاوت کا سب سے اندوہناک مرحلہ ختم ہوا۔

وزیرستان ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء

۱۹۱۹ء میں وزیرستان میں جو ہل چل شروع ہوئی وہ ۱۸۹۷ء کی بغاوت کے مقابلے پر اتنی بے ارادہ نہ تھی۔ تیسری جنگ افغان اور کابل سے ایک باقاعدہ تحریک سے متاثر، ۱۹۱۹ء کی بغاوت اس وقت رونما ہوئی جب قبائلی علاقے پر برطانوی دباؤ نسبتاً ہلکا تھا لیکن اس نے جلد ہی ایسے رخ اختیار کر لئے جو برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے لڑائی سے ہو سکتے تھے اور یہ ۸ اگست ۱۹۱۹ء کے اینگلو افغان معاہدہ راولپنڈی کے بعد دیر تک جاری رہی جس نے افغانستان اور برطانوی ہند کے درمیان رسمی جنگ کو ختم کر دیا تھا۔

۱۸۹۷ء کے بعد کے دو عشروں میں جنگ و جدل کے طریقوں کی نوعیت میں بہت فرق پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۹ء تک بہت سے

قبائیلیوں نے لیویز، ملیشیا یا افواج ہند میں رہ کر کچھ فوجی تربیت اور جنگی تجربہ حاصل کر لیا تھا[1] مثلاً ۱۹۲۰ء میں صرف وزیروں اور محسودوں میں ہی اندازاً ۳ ہزار سابقہ فوجی تھے۔ اس کے علاوہ قبائلی علاقے میں اندازاً ۱۴۰۰ لاکھ جدید رائفلیں اور ان گنت توڑے دار بندوقیں، چقماقی بندوقیں اور دیگر دلیسی آلات تھے۔ وزیروں کے پاس اپنے قریباً ۲۳ ہزار جنگ بازوں کے لئے اندازاً ۱۱ ہزار جدید رائفلیں تھیں۔ محسود عزیب ترین اور رانگ تھلگ ترین قبیلہ ہونے کے باوجود اپنے ۱۶ ہزار جنگ آزماؤں میں سے ۱۲ ہزار کو موثر آلات سے مسلح کر سکتے تھے۔ بعض حالات میں قبائلی اسلحہ پولیس اور ملیشیا کے اسلحہ سے بہتر تھا کیونکہ ان میں سے بعض ابھی تک دقیانوسی این فیلڈ اور سنائیڈر رائفلوں سے ہی مسلح تھے۔[2]

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا تھل اور وانا کے خلاف افغان کارروائیوں کے بعد ملیشیا میں سے بڑے پیمانے پر لوگ مفرور ہو گئے اور غدر

---

[1]- گورنمنٹ آف انڈیا، جنرل سٹاف "آپریشن ان وزیرستان" ۲۰-۱۹۱۹ء (کلکتہ، سنٹرل پبلی کیشنز برانچ، ۱۹۲۱ء) ص ۵

[2] - مورل اینڈ میٹریل پراگریس آف انڈیا، ۲۹-۱۹۲۸ء، ص ۲۶۷

بھی ہوا ۱۸۹۷ء کی طرح انگریزوں نے جلد ہی اپنا عملہ واپس بلا لیا اور وفادار یونٹوں کو نکال لیا۔ یہ ٹوچی اور ٹانک زم سے آتے ہوئے بری طرح کٹتے رہے اور ان کے گودام اور بارود کا بیشتر حصہ بھی ضائع ہوگیا ۲۶ مئی ۱۹۱۹ء کو میران شاہ کے ۴۰۰ ملیشیا سپاہیوں نے بغاوت کردی اور انہوں نے ڈوگرہ یونٹوں کو پسپا کردیا جو انہیں ڈرانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اسی دن وانا میں متعین وزیر اور آفریدی ملیشیا نے بھی بغاوت کردی اور بارود کے ۷ لاکھ راؤنڈ قبضہ لئے۔

جون کے اوائل تک ٹوچی اور ٹانک زم سے لے کر جنوب میں جنڈولہ تک سارا علاقہ برطانوی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ جب افغانوں کے ساتھ صلح ہوگئی اور صورتحال کچھ مستحکم ہوئی تو انگریزوں نے وزیرستان میں قبائل کو شرائط اطاعت بھجوائیں (شمال میں بغاوت شروع میں ہی ناکام ہوگئی تھی) ٹوچی وزیروں نے شرائط قبول کرلیں اور ان کی وادی پر گرفت خاصی جلدی دوبارہ قائم ہوگئی۔ وانا کے وزیروں اور محسودوں نے امن قائم کرنے سے انکار کردیا اور ۱۹۱۹ء کی ابتدائے سرما میں ایک بڑا دستہ جنوبی وزیرستان میں حرکت میں آیا۔ اس کا ہدف محسودوں کا الگ تھلگ دارالحکومت کنی گورم تھا۔

کئی مہینوں کی سخت لڑائی کے دوران مہم کنی گورم پہنچی اور

اس نے اسے اور ارد گرد کے دیہات کو خوب لوٹا۔ انتقامی دستے کو یہ قیمت ادا کرنا پڑی وہ ۱۹۰۵ء اور ۲۰ فروری ۱۹۲۰ء کو ماکن کے قریب معرکے میں مقتولین و مجروحین کی تعداد سے بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے۔ انگریزوں کی طرف سے ساٹھ مارے گئے اور اکانوے زخمی ہو گئے۔ محسود بائیس مارے گئے اور اڑتالیس زخمی ہو گئے[1] مزید کئی ہفتوں کی جلاؤ اور قرار ہو جاؤ کاررروائی کے بعد دستہ مئی ۱۹۲۰ء میں محسود علاقے سے واپس آ گیا۔ محسودوں نے کبھی رسماً صلح قبول نہیں کی اور نہ ہی ان سے مطلوبہ رائفلیں اور تاوان جنگ موصول ہوا۔ ادھر ادھر مزاحمت ۱۹۲۱ء تک جاری رہی جس کی قیادت حاجی عبدالرزاق اور ملا بشیر کر رہے تھے جو سید احمد کی جماعت سے محسودوں کو بھڑکانے آئے تھے[2] پوری مہم میں لڑائی بہت سخت رہی اور محسود لشکروں نے جو بعض اوقات ۴ ہزار تک ہوتے تھے میدانِ جنگ میں برطانوی فوجیوں کے برابر کی چوٹ ثابت ہوئے۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق "محسود ایسے لڑے جیسے وہ پہلے کبھی نہ لڑے تھے۔ ان کے حملے بہت منظم اور گولہ باری اور رسالوں کے دھاروں کی ہم وقتی اعلیٰ پائے کی تھی"[3]

۱۔ ایضاً، ص ص ۱۳۵ تا ۱۳۶

۲۔ مورل اینڈ میٹیریل پراگریس آف انڈیا، ۱۹۲۱ء، ص ۸

۳۔ ایضاً۔ ۱۹۲۰ء، ص ۷

محسودوں کے خلاف ۲۰ - ۱۹۱۹ء کی برطانوی ہند کی مہم پر کل خرچ اندازاً دس لاکھ پونڈ سے زیادہ آیا جو افغانستان کے ساتھ باقاعدہ جنگ پر خرچ سے کئی گنا زیادہ تھا، ۸۰ ہزار سے زیادہ فوج (مشمولہ بہ قریباً ۴۰ ہزار غیر متحارب)، بر سر پیکار رہے ۵ ہزار سے زیادہ نفوس ہیضہ اور دیگر بیماریوں کی نذر ہوئے ۔ انتقامی مہم کے دوران قریباً ۵۰۰ مارے گئے اور ۲ ہزار زخمی ہوئے[1]

۲۰ - ۱۹۱۹ء کی مہم کی ناکامی انگریزوں پر بھی اتنی ہی عیاں تھی جتنی قبائلیوں پر جب دستے کو سوار کرایا گیا تھا تو اس بنیادی حکمتِ عملی کا مستقل قبضہ مقصود تھا کہ غیر ذمہ دار اور نراج پسند محسودوں میں نہ ایسے رہنما تھے نہ گروہ جن پر امن قائم رکھنے کے سلسلے میں بھروسہ کیا جا سکتا تھا، اگر امن پر اتفاق ہو بھی جاتا۔ اسی کے پیشِ نظر انگریزوں نے شروع میں دیہات اور فصلوں کو تباہ کرنے کا نہ سوچا تھا کیونکہ یہ قابض فوج کی ضروریات کے لئے مطلوب ہوتے، لیکن پرانی کرزنی پالیسی جو انتظامی سرحد سے پرے کسی مستقل عمل کو شجرِ ممنوعہ سمجھتی تھی اب بھی جاری و ساری تھی لہٰذا اس خیال کو جلاوُ

---

[1] سی۔ ای۔ بروس " وزیرستان ۲۷ - ۱۹۲۶ء" (آلڈر شوٹ! گیل اینڈ پولڈن ۱۹۳۸ء)، ص ۲۷، ص ص ۱۷۲ تا ۱۷۳

اور فرار ہو جاؤ" کے طریقے میں بدل دیا گیا۔ اس کے توہین آمیز نتائج نے ایک اور ریٹنگی دی اور رزمک پالیسی کے ظہور کا راستہ ہموار ہو گیا جس پہ پہلے ہی باب ہفتم میں بحث ہو چکی ہے۔

۳۱-۱۹۳۰ء کی شورشیں پہلے ہی قدرے تفصیل کے ساتھ باب ہشتم میں بیان کی جا چکی ہیں۔ وہ قبائلی بغاوتوں کی تاریخ کا ایک اہم حصہ تھیں لیکن ہندوستان کے دیگر حصوں میں ہونے والے واقعات سے ان کے تعلق نے انہیں ہندوستان کے ساتھ سرحد کے تعلقات کے سیاق و سباق میں ایک بڑی معنویت دے دی ہے جو محض سرحد پر قابو کے لیے پٹھان انگریز کشمکش کا حصہ ہونے کی حیثیت سے انہیں حاصل نہ ہوتی۔ مزید برآں آفریدی بغاوت میں ڈکیتی کے بھی بعض عناصر تھے۔ نسبتاً لڑائی کم ہوئی اور آخری فیصلہ عسکری سے زیادہ سیاسی تھا۔

وزیرستان ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۸ء

پٹھانوں اور انگریزوں کے درمیان اگلا بڑا مقابلۂ قوت ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ منظر پھر وہی وزیرستان تھا۔ بڑا اداکار حاجی مرزا علی خان فقیر ایپی تھا جو اتمانزئی وزیروں کا ایک توری خیل مُلّا تھا اور وہ ۱۹۶۰ء میں اپنی موت تک سرحد کا بدنام ترین دشمن بنا رہا۔

وزیرستانی قبائل چوتھے عشرے کے وسط میں کئی وجوہات کی بناء پر بیخ پا تھے۔ دانا اور رزمک کے مضبوط دستوں نے ان کی سرگرمیوں پر جو پابندیاں عائد کر دی تھیں وہ ۱۹۲۱ء میں منظر عام پر آ گئی تھیں۔ مختلف طائفوں کے اندر اور ان کے درمیان خاصی کھینچا تانی تھی۔ مثلاً توری خیل وزیر اپنے قبائلی وظیفہ کی اندرونی تقسیم پر نالاں تھے۔ بوڑھے ملوک جنھوں نے ۲۰ - ۱۹۱۹ء کی لڑائی میں نام پیدا کیا تھا اور جن میں سے بہت سے اب برطانوی دستوں کی نفع بخش رسد رسانی کے ٹھیکے دار تھے اپنا اثر و رسوخ کھو رہے تھے۔ نوجوان نسل ایک اور جہاد کے لئے بیقرار تھی تاکہ دادِ شجاعت دے سکے اور وہ آتش بیاں ملاؤں جیسے ایپی کے عقیدت مند حاضرین بن گئے تھے۔

ہندوستانی سیاسیات سرحد پر زیادہ سے زیادہ اثر انداز ہو رہی تھی۔ اسلام بی بی اور مسجد شہید گنج کے واقعات نے مذہبی جنون کو ہوا دی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں فقیر ایپی نے جو ابھی تک نسبتاً گمنام تھا دوروں کا ایک لشکر تیار کیا جن میں وہ وادئ ٹوچی میں رہتا تھا اور بنوں کو خطرہ لاحق ہو گیا کیونکہ مطالبہ کیا گیا کہ اسلام بی بی اس کے شوہر کو واپس کی جائے۔ توری خیل ملوک نے ایپی کے پر قبضہ لینے سے معذوری کا اظہار کیا جب تک انگریز قبیلے کے سرپھروں کے خلاف ان کی مضبوط حمایت کا مظاہرہ

نہ کریں۔

انگریزوں نے ایسا کرنے کے لئے ایک پرانے منصوبے کو زندہ کیا جس کے تحت ٹوچی کی تنگ بغلی وادی میں سڑک بننا تھی اور جہاں ایپی اور اس کے پیرو جاگزیں ہو چکے تھے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء کو دو بریگیڈ مختلف سمتوں سے وادی میں داخل ہوئے تاکہ تعمیر سڑک کے لئے علاقے کو صاف کیا جا سکے۔ دونوں دستے قریباً ایک ہی وقت بھاری گولہ باری کی زد میں آ گئے اور دونوں کی لڑائی میں انیس مارے گئے اور ۱۰۰ سے زیادہ زخمی ہوئے۔ ایک نئی اور بڑی مہم کو سوار کرایا گیا اور یہ وادی میں بلا مزاحمت گھستی چلی گئی۔ مقامی ملوک کے ساتھ ایک قسم کا معاہدہ ہو گیا لیکن ایپی محسود علاقے میں بھاگ گیا جہاں وہ وادیٔ شکتو میں ارسل کوٹ کے مقام پر جاگزیں ہو گیا۔

اب فقیر کی شہرت ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔ اس نئے صدر مقام سے اس نے توری خیل اور محسود نوجوانوں کے متعدد چھوٹے چھوٹے گروہ منظم کئے اور انہیں ایک وسیع علاقے میں برطانوی عملے اور تنصیبات پر حملے کے لیے بھیجنے لگا۔ ۲ فروری ۱۹۳۷ء کو محسودوں نے جنوبی وزیرستان کے سکاؤٹس کے ایک برطانوی کیپٹن کو مار دیا۔ اگلے دن وادیٔ ٹوچی میں ایک انگریز اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر کو مار دیا گیا جو خاصہ داروں کی

تنخواہ ادا کرتے جا رہا تھا۔

ان واقعات کے بعد زیرِ انتظام اضلاع میں چھاپوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جن میں ہندوؤں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا، ۱۳ اغواء کیے گئے، ۱۰ مارے گئے اور ۶۰ کے مکان لوٹے اور جلائے گئے۔ ۹ اپریل کو وانا سے آنے والے ایک کانوائے پر شہور تنگی میں ایک لشکر نے کمین گاہ سے حملہ کیا جو ایک جلال خان محسود، جو بیا خان کے تحت تھا اور کئی انگریز افسر مارے گئے۔

جواباً ایک بڑی برطانوی مہم ۲۳ اپریل کو روانہ ہوئی تاکہ مخالفوں اور ان کے محافظوں کو سزا دی جا سکے اور ایپی کو واپس لایا جا سکے۔ دو ماہ کی معرکہ آرائی کے دوران ۲ ہزار باقاعدہ فوجی اور ۵ ہزار سکاؤٹ مصروف کارروائی رہے۔ سخت لڑائی کے بعد جس میں ۷۰۰ فوجی مرے یا زخمی ہوئے ارسل کوٹ پر قبضہ کر لیا گیا۔ ایپی مزید جنوب کی طرف بھٹانیوں کے ہاں پناہ گزیں ہوا جہاں اس نے نیا لشکر اکٹھا کرنا شروع کیا۔ برطانوی مہم پر کل خرچ ۱۲ تا ۱۵ لاکھ پونڈ تھا۔[۱۲]

موسم گرما کے آخر تک محسود، توری خیل اور بھٹانی عناصر

---

[۱۲] بروس، ایضاً ص ۲۷ + بارٹن، ایضاً ص ۲۴۲

کے ساتھ ایک قسم کا معاہدہ امن ہوا۔ یہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہا۔ ایپی کے ایک بڑے نائب، محسود مُلا شیر علی نے ایک چھوٹا سا لشکر اکٹھا کیا جو زیادہ تر پیشہ ور قانون شکنوں اور تخریب کاروں پر مشتمل تھا اور ۱۹۳۷ء کے پورے موسم خزاں اور سرما میں برطانوی مواصلاتی لائنوں پر حملے کرتا رہا۔ ایک مرحلے پر قریباً ۱۰ ہزار فوجیوں کو محض مواصلات کی حفاظت کے لئے متعین کرنا پڑا۔

ذہین و فطین اور ہر جگہ حاضر فقیر انگریزوں کی گرفت سے بچتا رہا باوجود اس کے کہ اس کی بدلتی ہوئی کمین گاہوں پر بمباری بھی کی گئی اور اسے زندہ یا مردہ پکڑنے پر گراں بہا انعامات بھی پیش کئے گئے۔

۱۹۳۸ء کے موسم بہار میں جنوبی وزیرستان کے سکاؤٹوں کا ایک دستہ قریباً نیست و نابود کر دیا گیا اور ان کا انگریز کیپٹن شیر علی کے آدمیوں نے پیلی ٹوپی پر مار دیا۔ تھوڑے عرصہ بعد ٹوچی میں دتا خیل چوکی محصور کر لی گئی۔ لڑائی میں ایپی کے آدمیوں نے چند توپیں بھی استعمال کیں جن کا ماخذ نا معلوم تھا ۲۳ جولائی کو ۴۰۰۰ کے ایک لشکر نے ایپی کے ایک نائب اور خٹک قانون شکن، خلیفہ مہر دل کے تحت بنوں شہر پر حملہ کیا جس نے ۱۳ ہندو مار دیئے اور ۲۰ زخمی کر دیئے اور ایک لاکھ روپے کی لوٹ مار کر کے فرار ہو گئے۔

اس وقت تک ایپی رزمک کے مغرب میں گورویخت کی
چٹان میں غار بہ غار چھپتا پھرتا رہا جو قریباً افغان سرحد پر تھی۔ یہ
دو بریگیڈ اس جگہ پہنچنے میں ناکام رہے جس کی وجہ مزاحمت سے
زیادہ انتہائی اونچا نیچا علاقہ تھا جس سے انہیں سابقہ پڑا۔ بعد میں
گورویخت پر ہوائی حملے بھی کچھ نہ کر سکے اور ایپی اپنی بقیہ زندگی
اسی سرحدی صدر مقام میں رہا۔ مزاحمت کا جو ڈھب اس نے
اختیار کیا تھا وہ ہندوستان میں باقی ماندہ برطانوی حکومت
تک جاری رہا۔

امن وامان کا مسئلہ:-

برطانوی راج کے خلاف پٹھان بغاوت وقتاً فوقتاً عوامی
شورشوں تک ہی محدود نہ تھی، لیکن شاید برطانوی پہلو کا کانٹا
زیر انتظام ضلعوں اور قبائلی علاقہ دونوں میں روزمرہ کی قانون

۱۹۵۴ء میں ایک مغربی صحافی موسم گرما میں اس سے ملا۔ دیکھئے کرسٹوفر رینڈ
"اور فارفلنگ کارسپانڈنٹس فرام دی سوویٹ ٹو دی پٹھان" دی نیویارکر، فروری
۱۹، ۱۹۵۵ء، ص ص ۱۰۰ تا ۱۱۵، اس کے بہت سے نائبین نے اسے چھوڑ کر
پاکستان سے صلح کر لی ہے۔ ان میں خلیفہ مہر دل بھی شامل ہے جس نے ۱۹۵۴ء میں
ہتھیار ڈال دیئے۔

شکنی تھا۔

انگریزوں کے لئے امن قائم رکھنے کا کام خاص طور پر اس لئے مشکل ہوگیا کہ پٹھانوں کے پاس بہت بھاری وافر اسلحہ تھا جو بیسویں صدی میں حیرت انگیز طور پر بڑھ گیا۔ ۱۹۰۵ء میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ قبائلی علاقہ میں ۲۹ ہزار توڑے دار بندوقیں تھیں[1] ۱۹۲۰ء تک یہ ایک لاکھ ہو گئی تھیں اور ۱۰ سال بعد ۲۶۲۰ لاکھ[2] آج کل یہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ ہیں۔ ضلعوں میں لائسنس کے ذریعے اسلحہ کو محدود کرنے کی بہت عرصے سے کوششیں کی گئیں لیکن قواعد ضوابط کا احترام ان کو ماننے سے زیادہ توڑ کر ہی کیا جاتا تھا اور چوتھے عشرے کے آخر میں کم از کم ۵۰ ہزار مزید رائفلیں پانچوں ضلعوں میں غالباً عام لوگوں کے قبضے میں تھیں۔ بر سبیل تذکرہ ان اعداد و شمار میں بے شمار پستول، ریوالور اور کافی خود کار ہتھیار شامل نہیں ہیں جو کسی نہ کسی طرح قبائلی ہاتھوں میں پہنچ گئے ہیں۔ آخر میں یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ ہر پٹھان کے پاس کم از کم ایک خنجر تو لازماً ہوتا ہے۔

---

[1]- این ڈبلیو ایف انکوائری رپورٹ، ص ۱۵

[2]- مورل اینڈ میٹریل پراگریس آف انڈیا ۳۰-۱۹۲۹ء ص ۲۶، انڈیا ۳۱-۱۹۳۰ء ص ۱۲۔

صوبہ سرحد میں امن وامان کے ذمہ دار حکام کا اہم ترین اور مشکل ترین کام ہمیشہ وکٹوریائی زبان میں "واچ اینڈوارڈ" (نگرانی اور بچاؤ) رہا۔ پورے برطانوی دور میں زیر انتظام قبائلی علاقے پہاڑی چھاپوں کی زد میں رہے۔ گو بعد کے سالوں میں چھاپوں کی تعداد قدرے کم ہو گئی تاہم ان کی وسعت و شدت اسی نسبت سے بڑھ گئی۔[1]

ان چھاپوں کا مقصد عموماً ایک یا تین کا امتزاج ہوتا تھا۔ مقبول ترین محض لوٹ مار تھا۔ اس کا ہدف ایک خوشحال ہندو سوداگر یا گاؤں یا برطانوی رسد ڈپو یا کانوائے ہوتا تھا جس سے رائفلیں مل سکتی تھیں۔ غالباً دوسرا محرک زیر انتظام علاقے میں کسی دشمن یا اس کے محافظ سے عمومی یا خصوصی انتقام ہوتا تھا۔ ثالثاً بہت سے چھاپے برطانوی راج کی مخالفت کے لئے مارے جاتے تھے۔ برطانوی ہند پر سرحد پار عناصر کے چھاپوں کا جدول ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۸ء حسب ذیل ہے۔

سال	چھاپے	سال	چھاپے	سال	چھاپے
۱۹۲۰-۲۱ء	۳۹۱	۱۹۲۱-۲۲ء	۱۹۴	۱۹۲۲-۲۳ء	۱۳۱
۱۹۲۳-۲۴ء	۷۹	۱۹۲۴-۲۵ء	۳۹	۱۹۲۵-۲۶ء	۳۰

---

[1] - این ڈبلیو ایف انکواری رپورٹ، ص ۱۵

سال	چھاپے	سال	چھاپے	سال	چھاپے
۱۹۲۶-۲۷ء	۱۹	۱۹۲۷-۲۸ء	۱۸	۱۹۲۸-۲۹ء	۱۰
۱۹۲۹-۳۰ء	۴	۱۹۳۰-۳۱ء	۱۷	۱۹۳۱-۳۲ء	۲۱
۱۹۲-۳۳ء	۱۷	۱۹۳۳-۳۴ء	۸	۱۹۳۴-۳۵ء	۲۱
۱۹۳۵-۳۶ء	۳۸	۱۹۳۶-۳۷ء	۳۷	۱۹۳۷-۳۸ء	۷۴

(بارڈر ایڈمنسٹریشن رپورٹیں ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۸ء سے ماخوذ)

چھاپوں میں بھاری نقصان ہوتا تھا مثلاً ۱۹۱۹ء میں صرف ڈیرہ اسماعیل خان میں نقصانات مندرجہ ذیل تھے۔

مسلمان: ۱۰۷، اغواء ہوئے، ۴۵، مارے گئے، ۵۱، زخمی ہوئے اور ۳۲۲۱۵۳، روپے کا سامان لوٹا گیا۔

ہندو ۱۸۱، اغواء ہوئے، ۸، مارے گئے، ۱۰، زخمی ہوئے اور ۴۲۶۳۸۷، روپے کا سامان لوٹا گیا[1] مزید برآں ۳۰، سے زیادہ حملے رائفل چوری کے لئے فوجی ملازموں اور عملوں پر کئے گئے۔

اسی سال پورے صوبہ سرحد پر (ماسوائے ہزارہ) کل ۶۱۱، چھاپے مارے گئے جن میں ۲۹۸، مارے گئے ۴۶۳، اغواء ہوئے ۳۹۲، زخمی ہوئے اور ۳۰، لاکھ روپے کی منقولہ جائیداد چرائی گئی امن وامان کی تنظیمات صرف ۴۱، چھاپوں کو پسپا کر سکیں اور کل قبائلی

۱۔ این ڈبلیو ایف انکوائری رپورٹ ص ۱۵

نقصانات ۱۱۱۹ اموات، ۸۰ زخمیوں اور ۴۰ گرفتاروں پر مشتمل تھے[1]

ضلعوں کے اندر سے امن و امان کے لئے خطرہ کا سدِباب بھی اہم مسئلہ تھا۔ مثلاً ۱۹۱۰ء میں صوبے میں ۴۰۴ قتل کی واردات ہوئیں۔ ان کے محرکات کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ ان میں سے ۴۹ مردوں عورتوں کے ناجائز تعلقات، ۹۶ ڈکیتی، ۵۸ خونیں انتقام ۲۶۰ زمینی تنازعات اور باقی ۱۲۵ متفرق وجوہات کی بناء پر سرزد ہوئے ۱۹۳۸ء تک قتل کی وارداتیں سالانہ ۷۰۲ تک پہنچ گئیں اور جرائم اپنی انتہا تک پہنچ گئے جب صوبائی پولیس کو کل ۱۱۲۲۵ مقدمات نمٹانے پڑے[2]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری طور پر اعلان کردہ اشتہاری مجرموں کی تعداد بڑھتی گئی مثلاً ۳۰-۱۹۲۹ء میں ضلعی ڈپٹی کمشنروں کے پاس اشتہاری مجرموں کی فہرست یوں تھی؛ ہزارہ ۲۰، پشاور ۹۴۵، کوہاٹ ۴۲۳، بنوں ۸۵ اور ڈیرہ اسماعیل خان ۱۸[3] جب کسی کو قانون شکن قرار دیا جاتا تھا تو پھر ضلعوں کے دیہاتیوں اور قبائلی علاقے کے قبائلیوں پر لازم تھا کہ وہ اسے مار دیں۔

۱۔ مورل اینڈ میٹریل پراگریس آف انڈیا، ۱۹۲۰ء ص ص ۱۱ تا ۱۲

۲۔ این ڈبلیو ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹیں ۲۰-۱۹۱۹ء ص ۷، ۳۹-۱۹۳۸ء ص ۱

۳۔ این ڈبلیو ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۳۰-۱۹۲۹ء، ص ۸

یا پکڑ لیں ، اور اگر موقعہ کے باوجود وہ اس سے فائدہ نہ اٹھاتا تھا تو اسے اس ناکامی پر سزا دی جا سکتی تھی ۔ لیکن اکثر قانون شکن قبائلی علاقے میں بھاگ جاتے تھے جہاں وہ اہم ملوک کے ہمسائے بن جاتے تھے ۔ آخر الذکر کو اپنے "مہمانوں" پر مطلوب افراد کی حیثیت سے گرفت حاصل ہوتی تھی ۔ قانون شکنوں کو ضلعوں کی واقفیت بھی ہوتی تھی اور وہاں روابط بھی ہوتے تھے لہٰذا ڈکیتیاں بڑھ جاتی تھیں[8] اگر تعاقب بہت سرگرم ہوتا تو قانون دشمن سرحد پار افغانستان بھاگ جاتے ۔ دوسری جنگ عالمگیر کے آغاز پر کم و بیش ایک ہزار اشتہاری سزا یافتہ مجرم افغانستان کے مشرقی صوبوں میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو چکے تھے ۔

یہ بہت افسوسناک ہے کہ برطانوی راج کے آخری ۱۰ سالوں میں سرحد میں امن و امان کی حالت اتنی ناگفتہ بہ تھی کہ پوری صدی میں نہ تھی ۳۸-۱۹۳۷ء کے وزیرستانی فتنہ و فساد کے بعد وسیع پیمانے پر امن شکنی تو نہ تھی لیکن پشاور ڈی آئی خان روڈ پر ٹریفک صرف صبح کے وقت چند گھنٹے کے لئے کھولی جاتی

---

[8] - ایک ایسے ہی دشمن کی کہانی انیتھونی جے بیمون نے "دی سٹوری آف زارک خان" (لندن جیرالڈز، ۱۹۵۰ء) میں بہت خوب لکھی ہے۔ اس ناول پر مبنی بعد میں ایک خراب سی فلم بھی بنائی گئی تھی ۔

تھی جب سڑک پر بھاری پکٹنگ ہوتی۔ پشاور اور نوشہرہ کے
درمیان جرنیلی سڑک غروبِ آفتاب کے بعد بند کر دی جاتی تھی۔
کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کے ضلعوں میں لوگوں کو
باقاعدگی سے اغواء کر لیا جاتا تھا۔ پی ڈبلیو ڈی سڑکوں کا عملہ صرف
زیرِ حفاظت ہی سڑکوں پر کام کرتا تھا، اور وہ بھی محدود گھنٹوں
کے لئے۔ ایجنسیوں میں افسروں کی ہر قسم کی نقل و حرکت بھاری
حفاظتی دستوں کے ساتھ ہی ہوتی تھی اور پوری احتیاط کی جاتی
تھی کہ ان کے راستۂ سفر کا کسی کو پیشگی پتہ نہ چلے۔ بنوں چھاؤنی
میں فوج کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ چوٹی کے فوجی افسروں
اور ڈپٹی کمشنر کے گھروں کے باہر ایک اندرونی حلقہ قائم رکھیں
تاکہ اُن کلیدی افسروں کی حفاظت کی جا سکے اور حملے کی صورت
میں مورچہ بنایا جا سکے۔

بغاوت کی بنیاد:

یہ بتانا عام طور پر آسان نہیں ہے کہ پٹھانوں نے سرحدیں
برطانوی قانون اور اس کے علمبرداروں کی موجودگی کو قبول کرنے
سے ہمیشہ انکار کیوں کیا؟ ۱۸۹۷ء، ۱۹۱۹ء، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۶ء
کی بغاوتوں سے کوئی سیدھا سادا خاکہ نہیں اُبھرتا، لیکن یہ قابلِ
ذکر ہے کہ یہ سب بڑی بغاوتیں برطانوی راج کی صدی کے نصف

دوم میں ہوئیں۔ ۱۸۹۷ء سے پہلے واحد زبردست تصادم ۱۸۶۳ء کی امبیلہ مہم تھی جو ایک مخصوص اور اچھوتی بنائے اضطراب یعنی بستی سید احمد کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ انیسویں صدی کے آخری عشرے سے پہلے ایک وسیع بغاوت کے فقدان کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ابھی تک سرحد میں پوری طرح قدم نہ جمائے تھے۔ روس کے ساتھ "عظیم مقابلہ" ابھی جاری تھا اور پٹھان اس سے بخوبی آگاہ ہونے کے باوجود اپنے کو ایک تیسرا فریق سمجھتے تھے جس کی مقابلے میں شرکت اس کی اپنی پسند کی شرائط اور اوقات پر ہی ہو سکتی تھی۔

آخری عشرے میں انگریزوں نے "عظیم مقابلہ" کا پہلا مرحلہ جیت لیا اور وہ سرحد میں مضبوطی سے جم گئے۔ پٹھانوں نے خواہ نخواہ اپنے آپ کو برطانوی ہندوستانی سلطنت کا ایک حصہ پایا وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے، اور اس کے لئے انہوں نے اپنے آقاؤں سے جو قیمت وصول کی وہ اتنی زیادہ تھی کہ انگریزوں کو اپنے باقی ماندہ دورِ حکومت میں محض فوجی قوت کے بل پر اس علاقے میں اپنا اختیار قائم رکھنا پڑا۔ کبھی کبھار اس کا دباؤ ہلکا ہو جاتا تھا جیسے کرزن کی بند سرحد پالیسی کے نفاذ کے بعد اور کبھی یہ بڑھ جاتا تھا جیسے رزمک پالیسی اور ہندوستانی سیاسی ہل چل کے سرحد میں پہنچنے کے بعد۔ لیکن یہ ختم کبھی نہ ہوا اور انہ

ہندوستان کے ساتھ سرحد کے انضمام کو ناممکن بناتا رہا۔

انتہائی حقیقت پسندانہ الفاظ میں یہ صورتحال سامراجی برطانیہ کے مفادات کے منافی نہیں تھی۔ ہندوستان کی سرحدات محفوظ رہیں۔ برطانوی ہند کا بھاری بھرکم سول اور فوجی نظام اس بوجھ کو برداشت کرگیا جو پٹھان التہاب اس پر ڈالتا رہا۔

پٹھان قومیت کے حسّاس موضوع پر زیادہ تفصیل کے ساتھ کسی اور جگہ تبصرہ کیا گیا ہے (ابواب چہارم اور دوازدہم) یقیناً اسے ہمیشہ ایک ٹھوس ثقافتی بنیاد حاصل رہی ہے لیکن چوتھے عشرے تک اس کے کوئی سیاسی مضمرات نہ تھے اور یہ انگریزوں کے خلاف مزاحمت میں ایک بڑا عامل نہ تھا، ۱۹۴۷ء میں بھی جب انگریز چلے گئے اور "پختونستان" کا مسئلہ ایک زندہ مسئلہ بن گیا تو بھی قومیت کی لہر بہت ہلکی رہی۔ بہرحال یہ انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی کبھی بنیاد نہیں بنا تھا۔

ابتداء سے ہی حسّاس تر برطانوی انتظام کار سرحد کے مخصوص مسئلہ سے بخوبی آگاہ تھے لیکن وہ پٹھان آرزوؤں سے ذاتی طور پر کتنی بھی ہمدردی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ امن وامان ان کا ہمہ گیر مقصد تھا اور اس کے اور مستحق سیاسی ترقی کے درمیان آویزش کی صورت میں فیصلہ لازماً امن وامان کے ہی حق میں ہوتا تھا۔ فریزر ٹیٹلر کو یقین ہے کہ اگر انگریز ٹھہرتے تو وہ بالآخر

افغانستان کے تعاون کے ساتھ یہ مسئلہ حل کر لیتے اور سرحد کے دونوں
اطراف سے سرایت کرتی ہوئی تہذیب کا ہموار دباؤ، "سرحدی
قبائل کی اقتصادی حالت اور فکری نظام کو اس طرح بدل دیتا کہ
وہ ایک زیادہ مطمئن اور پرامن طرزِ زندگی کے بدلے اپنے آلاتِ
جنگ، خونیں جھگڑے اور قبائلی رسم و رواج" چھوڑ دیتے ہیں[1]

بارٹن نے انگریزوں کے رخصت ہونے سے قریباً دس سال پہلے
جو کچھ لکھا وہ کم امید افزاء تھا۔ اس نے کہا "قبائلی علاقے کی مکمل تسکین
ایک بڑی سلطنت کے لئے واحد منطقی راستہ تو ہو سکتی ہے لیکن یہ عملی
سیاسیات سے بعید ہونے کی وجہ سے خارج از امکان ہے"[2] بارٹن کے
خیال میں اکثر پٹھانوں اور انگریزوں کے درمیان جو بعد المشرقین پیدا
ہوا ہے اس کی بڑی وجہ چھاؤنیوں اور سرکاری دفاتر کی الگ
تھلگ، بدلتی اور خود مرکوز فضا تھی جسے نہایت مضبوطی سے
قائم رکھا گیا۔ نیز انگریز قبائلیوں کی نہ تو دوستی جیت سکے نہ توقیر۔

ایک آزاد مبصر کے لئے اس نقطے پر بارٹن فریزر ٹٹلر کی
نسبت حقیقت کے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ اکثر قبائلی نہ تو
اب بھی انگریزوں اور حال ہی میں کبھی کبھار پاکستانیوں کے

1- فریزر ٹٹلر، ایضاً، ص ۲۷۰

2- بارٹن، ایضاً، ص ۵۸

سلوک اور افغانوں مشمولہ یہ کابل کے ارکانِ شاہی خاندان کے سلوک کے فرق سے بہت تلخی سے آگاہ ہیں۔ وہ پنجابیوں، سندھیوں بنگالیوں اور دیگر ہندوستانی نسلوں کی عادات و اطوار کے مقابلے پر ان کی وسط ایشیائی عادات و اطوار کو برداشت کرنے کی کوئی خواہش نہ رکھتے تھے۔

مذہب جس کے لطیف نکات وہ شاذونادر ہی سمجھتے ہیں ان کی زندگیوں میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور گو ان عقیدت مندوں کے بہت سے ملا جاہل اور متعصب تھے جن کی عادات عام ڈاکوؤں سے مختلف نہ تھیں تاہم ملا جنہیں انگریزوں نے عام شہدے سمجھ کر نظر انداز کر دیا واقعی اپنے معاشرے کے بہترین عالم و فاضل تھے۔ مثلاً حاجی ترنگزئی پشتو کا ایک نامور شاعر تھا جس نے بہت سے سکول کھولے جہاں اسلامی علوم اور پٹھان تاریخ و ثقافت پڑھائے جاتے تھے۔ نیز سیاسی بغاوت بھی سکھائی جاتی تھی۔

پٹھانوں کی مسلسل شورش انگیزی سے تنگ آکر امن عامہ کے ذمہ دار برطانوی حکام بلا تامل خلاف ورزی کرنے والوں کو جو قانون دشمن قرار دے دیتے تھے اور پھر ان کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے تو شاید انہیں زیادہ موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا لیکن اس طریقہ کار سے پہاڑیوں میں ایسے لوگ

بڑھتے گئے جن کے سامنے صرف یہی راستہ تھا کہ وہ حتی الوسع دائرہ قانون سے باہر رہیں اور اپنے دلوں میں ہر انگریزی چیز کے لئے عمر بھر کی نفرت سلگائے رکھیں۔

تیسرے عشرے میں "پُرامن نفوذ" کی جو پالیسی زندہ کی گئی تھی وہ قبائلیوں کو کوئی اقتصادی یا سماجی بہتری نہ دے سکی۔ وظائف جو فوراً بند کیے جا سکتے تھے اور ناکہ بندی جو آسانی سے عائد کی جا سکتی تھی تشیانی اور زرعی طریقوں کو بہتر بنانے کے بالکل ابتدائی اقدامات کا بھی نعم البدل نہ ہو سکتے تھے کیونکہ اول الذکر اہل کوہ کے لئے معیشت کو کچھ نہ کچھ تو بہتر بناتے۔ قبائلیوں کو تعلیم دینے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی اور ہندوستان میں برطانوی راج کے آخری سال، ۴۷-۱۹۴۶ء میں بھی قبائلی علاقے کا تعلیمی بجٹ صرف ۱۷ ہزار روپے تھا۔

سرحد آج بھی بالخصوص قبائلی علاقہ بغاوت کے لئے ممکنا لباً امکانی طور پہ اتنا ہی خطرناک ہے جتنا یہ ہمیشہ رہا ہے تاہم وہ سرگرم رقابت قریباً مکمل طور پہ غائب ہے جو برطانوی دور میں نمایاں تھی۔ ضلعوں کے اندر شرح جرائم اب بھی ویسے ہی غیر معمولی طور پہ زیادہ ہے لیکن قیام پاکستان کے بعد زیادہ سے زیادہ تین چار واقعات سالانہ ایسے ہوتے ہیں جنہیں قبائلی علاقے سے چھاپے کہا جا سکتا ہے۔ پہاڑی قبائل بے قابو ہیں لیکن ان کے اور حکومت

کے درمیان جو نفسیاتی رکاوٹ موجود تھی وہ دور ہو چکی ہے۔ جہاد کشمیر میں جو بٹوارے کے فوراً بعد ہوا قبائلیوں کا پہلی دفعہ حکومت کے اہلکاروں کے ساتھ گہرا اور دوستانہ ربط قائم ہوا۔ ان دنوں کی باہمی خوش اعتمادی اور خیر سگالی آج بھی کافی حد تک قائم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سال ہا سال کے بہت سے مخالفین امن و چین سے زندگی گزار رہے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام مسائل ختم ہو گئے ہیں۔ انگریز باقاعدگی سے رزمک آ جا سکتے تھے، خواہ "کھلی سڑک کے دنوں" میں ہی سہی۔ پاکستانی افسر وہاں شاذ و نادر ہی جاتے ہیں اور وہ بھی وزیروں اور محسودوں کی دعوت پر جو چھاؤنی کے اندر یا اردگرد رہتے ہیں۔ ایپی کے قلعہ پر قبضہ کرنے کے معاملے میں پاکستانی انگریزوں سے زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ ایک سے زیادہ غیر مطمئن ملک تحریک پختونستان میں شامل ہو گئے ہیں یا کسی پاکستانی افسر کے ہاتھوں واقعی یا مفروضہ توہین کے جواب میں کابل چلے گئے ہیں۔

قبائلیوں کو احساس ہے کہ ۱۹۴۸ء میں قبائلی علاقے سے تمام باقاعدہ فوج کو واپس بلانے کا اقدام کمزوری کا نتیجہ تھا نہ کہ کرزنی دور میں طاقت کا دریا ہی ہندوستانی سرحد پر کشمیر میں فوری طور پر درکار تھے) اہلِ کوہ کو اقتصادی طور پر نقصان ہوا ہے کیونکہ انگریزی دور کے سڑکوں اور رسد کے ٹھیکے معدوم ہو گئے ہیں۔ لیکن شاید اہم ترین

بات یہ ہے کہ قبائلی اپنی کارروائیوں کے نقطۂ کیبر (بموجب اہلِ برطانیہ) یعنی کمزوری پر حملہ، پر عمل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ لہٰذا یہ ایک عجیب بات ہے کہ آخری دس سال جن میں سرحد کی انتظامیہ اس صدی میں کمزور ترین رہی ہے۔ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ میں سب سے زیادہ پُرامن رہے ہیں۔

جہاں تک ایک عمومی اصول اخذ کرنا ممکن ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پٹھان اپنی طویل بغاوت میں بنیادی طور پر اپنے حق آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔ یہ آرزو بلا شک وشبہ اپنے بعض مظاہرات میں اتنی قابلِ رشک نہ تھی۔ اس میں کام کرنے کا ایسا حق بھی شامل تھا جسے جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر کسی معاشرے نے دورِ حاضر میں ایک لمبی، غیر معینہ مدت کے لئے باقی رہنا ہو۔ پٹھان مقصد انتہائی انفرادی اور خود غرضانہ ہے جس کا ایسے مہذبانہ تصورات سے دور کا بھی تعلق نہیں جیسے اقوام وملل کا حق خودارادیت یا مساواتِ انسانی۔

لیکن مستقبل کے لئے اس کے جو بھی امکانات اور اخلاقی قدر و قیمت ہو پٹھانوں کی مخصوص آزادی برطانوی ہند کے آہنی افسر شاہی سانچے یا سامراجی برطانیہ کی حربیاتی پالیسی میں صحیح نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ کپلنگ کے آفریدی قانون دشمن کے الفاظ میں یہ ہوا۔

''یہ جنگ ہے، سرخ جنگ

لہٰذا میں تم سے اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے

دست و بازو ناکارہ نہیں ہو جاتے۔

اس ظلم کے لئے جو تم نے لوگوں کے سردار

اور ایک زکا خیل لیڈر سے کیا ہے۔''

---

(۱۴) باب دہم

بٹوارہ

تعارف :-

آزادی اور بٹوارہ کے قریب آنے کے ساتھ ساتھ جو مسائل برطانوی ہند کو گھیرے ہوئے تھے وہ سرحد میں بھی ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کے اہم سالوں میں رونما ہوئے۔ سرحد اس خونی فرقہ وارانہ تشدد سے متاثر ہوا جس نے پنجاب اور بنگال میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس میں نسبتاً مختصر پیمانے پہ ریاستوں کا مسئلہ تھا۔ جو برطانوی حاکمیت کے ساقط ہونے کے بعد تکنیکی طور پر آزاد کارکن بن گئی تھیں نیز قبائلی علاقہ کا خصوصی مسئلہ بھی تھا۔ کانگریس مسلم لیگ جنگ یوں تو پورے ہندوستان میں لڑی گئی۔ لیکن صوبہ سرحد میں اس کی شدت وحدت دیگر صوبوں سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ پاکستان کو برطانوی ہند کا پورا پشتو بولنے والا علاقہ ورثے میں جو ملا تو افغانستان نے پرزور احتجاج کیا اور یوں ایک بین الاقوامی رخ بھی

سامنے آیا۔[1]

دورِ تقسیم کے واقعات تین حصوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں (۱) سیاسی اور فرقہ وارانہ آویزش جس نے اہلِ سرحد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا (۲)۔ عمل جس کے ذریعے صوبہ سرحد، ریاستیں اور قبائلی علاقہ پاکستان کا حصہ بن گئے[2] اور (۳) پٹھان کردار کا غیر معمولی مظاہرہ یعنی جہادِ کشمیر پہلے دونوں باہمی طور پر مربوط موضوعات ہیں جو برطانوی حکومت کے آخری ایام اور آزادی کے ابتدائی ایام میں افزودہ رفتار حالات کا حصہ ہیں۔ وہ ایک سال سے کچھ زیادہ کے دور میں ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ آخری حصہ اچھوتا ہے اور اس پر تبصرہ علیٰحدہ ہی ہوگا۔

فیصلے کے ایام:۔

جنوری ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگرس پارٹی حکومت دوبارہ برسرِ اقتدار آ گئی کیونکہ قانون ساز اسمبلی کی پچاس نشستوں میں سے اس نے تیس جیت لی تھیں۔ نئی وزارت پر خان صاحب کے بھائی عبدالغفار خان کا بہت اثر تھا جس کی مقبولیت کو مسلم لیگ مغلوب نہ کر سکی تھی حالانکہ

سرحد میں افغانستان کی روایتی دلچسپی اور بٹوارے کے دوران افغان سرگرمیاں بالتفصیل باب دوازدہم میں زیرِ بحث آئیں گی۔

ہندوستان کے باقی تمام مسلم اکثریتی علاقوں میں قریباً مسلم لیگ ہی انتخابات میں کامیاب ہوئی تھی۔

روزافزوں ہندو مسلم مخاصمت پہلے ہی ہندوستان بھر میں زندگی کا اہم ترین پہلو بن چکی تھی۔ سیاسی میدان میں ہندو زدہ کانگرس پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان تمیز بالکل واضح ہوگئی تھی۔ ایک ایسی کانگرس پارٹی حکومت کے لئے جو قریباً تمام کی تمام جنگجو پٹھانوں پر مشتمل تھی اور ایک دیوانہ وار مسلمان علاقے میں گاندھی اور نہرو کے ساتھ متحدہ محاذ قائم رکھنے کے لئے کوشاں تھی کامیابی کے حالات بہت ناسازگار تھے۔

صوبہ سرحد میں کانگرسی وزارت کو آئندہ سال جن مسائل کا سامنا کرنا تھا وہ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں بالکل واضح ہوکر سامنے آگئے جب جواہر لال نہرو نے سرحد کا دورہ کیا تاکہ خان صاحب کی حکومت کو تقویت مل سکے اور پٹھانوں کو کانگریس سے وفاداری کی دانشمندی کا یقین دلایا جاسکے۔ نہرو پشاور میں آمد کے قریباً ساتھ ہی جسمانی حملوں کی زد میں آگیا۔ شہر میں ایک تقریر کی کوشش کے دوران وہ ہلکا سا زخمی بھی ہوگیا اور رائل انڈین ایئر فورس کا جہاز اسے اٹھا کر رزمک لے گیا جہاں پولیٹیکل ایجنٹ نے کانگرس لیڈر کو سننے کے لئے معزز ملوک کا ایک جرگہ بلایا ہوا تھا۔ جہاز کے اترتے ہی اس پر گولیاں چلائی گئیں اور برطانوی افسروں کے تمام اقدامات کے باوجود نہرو جرگہ کے ہاتھوں ایک اور بدسلوکی سے بمشکل ہی بچا۔

سیاسی جنگ، ۴۷ ۱۹ء کے اوائل میں تیز ہو گئی جب حکومت ہند نے مجبور ہو کر ضلع ہزارہ کے قبائل سے یرغمال اور رائفلیں لے لیں اور ان پر ۷۵ ہزار روپے جرمانہ عائد کر دیا کیونکہ انہوں نے فرقہ وارانہ فساد کو ہوا دی تھی۔ مسلم لیگ نے فوراً ہی حکومتی اقدام کی مذمت کی قرارداد پاس کر دی۔ سرحد کے کانگریسی گروہ نے کچھ نہیں کیا۔

۲۰ فروری کو سرحد قانون ساز اسمبلی میں مسلم لیگ لیڈر عبدالقیوم خان کو مردان میں گرفتار کر لیا گیا جہاں لیگ نے ابھی ابھی ایک ضمنی انتخاب جیتا تھا۔ جواباً لیگ نے اپنے حریفوں کا ہی پسندیدہ ہتھیار استعمال کیا اور کانگرسی حکومت کے خلاف تحریک سول نافرمانی شروع کر دی۔ مبینہ طور پر مقصد قیوم اور دیگر لیگی رہنماؤں کو جیلوں سے رہا کرانا تھا۔

کانگرس نے لیگ کے ساتھ رد و قدح کی کوشش کی تو آخرالذکر نے صوبے میں گورنر راج کا مطالبہ کر دیا اور یہ جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ اصل مقصد خان صاحب کی حکومت کا تختہ الٹنا تھا۔ ۱۸ مارچ کو پشاور میں سنگین فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے جن کے دوران ۴۰ ہزار ہندوؤں کو ایک لاکھ ۶۰ ہزار مسلمانوں میں محصور موت کے پسینے آتے رہے۔ سلسلۂ مواصلات منقطع ہو گیا اور شہر ہندوستان سے کٹ گیا۔ فوج نے پرانے شہر میں مظاہرین پر گولی چلائی۔ لیگ کے سینکڑوں کارکن گرفتار کر لئے گئے اور شام

تا صبح کرفیو لگا دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ قبائلیوں کے گروہ پنجاب میں نمودار ہوئے اور مری، ٹیکسلا اور راولپنڈی پر حملے کئے۔

مسلم لیگی رہنما، محمد علی جناح فرقہ وارانہ فسادات کی مذمت کرنے میں ہمیشہ پیش پیش ہوتا تھا۔ اس نے سرحدی لیگ کو اشتعال انگیز کارروائیوں سے باز رہنے کی تاکید کی۔ مقامی لیگ لیڈر جس نے یہ مظاہرے کروائے تھے پیر صاحب مانکی شریف تھا جو ایک سرکردہ نوجوان تھا۔ اس نے اپنے پیروؤں کو پُرامن مزاحمت تک محدود ہونے کا حکم دیا۔ پیر صاحب کو برطانوی اہلکار جز بز ہوکر "مانکی ملا" کہنے لگے تھے لیکن ان کے عقیدت مند دو لاکھ سے بھی زیادہ تھے۔

مسٹر جناح کی ہدایت و مداخلت کے باوجود فرقہ وارانہ عنصر قائم رہا اور پہاڑیوں کے مشتاق قبائلی پنجاب میں ہندو دیہات اور دکانوں کو لوٹتے رہے۔ اس پر پنجاب کے حکام نے صوبہ سرحد کی حکومت سے سرکاری طور پر احتجاج کیا کہ وہ اٹک اور خوشحال گڑھ کے پلوں پر کڑی نگرانی رکھنے میں ناکام ہوگئی تھی۔ سرحد کے زیر انتظام اضلاع میں خوانین کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے دیہات میں ہندوؤں سکھوں کے تحفظ کی ذمہ داری سنبھالیں۔

جب پُرامن تحریک مزاحمت علاقے کو مفلوج کرتی رہی

تو عبدالغفار خان کے پیرو بہت سے خدائی خدمت گار پشاور کے باہر اکٹھا ہونا شروع ہوئے ۱۸، مارچ کو وہ ۴ ہزار کی تعداد میں شہر میں داخل ہوئے تاکہ فرقہ وارانہ خدشات کو دور کریں اور دکانداروں کو دکانیں کھولنے پر آمادہ کریں لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ جب خدمت گار اپنی سرخ وردیوں میں شہر کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے تو جنگجو تنظیم خاکساروں کے گروہ بھی اپنی خاکی وردیاں اور عرب لباس پہنے ہوئے نمودار ہوئے۔

فوج بلا لی گئی اور قانون ساز اسمبلی کا اجلاس خاردار تاروں اور سنگینوں کے سائے میں ہوا۔ اب تک ان دو ہفتوں میں ۱۵۰ مارے گئے تھے اور ۲½ ہزار مسلم لیگی گرفتار ہو چکے تھے۔ ایک دو کے سوا اسمبلی کے سترہ مسلم لیگی ارکان جیل میں تھے۔ ۲۸، مارچ کو پیر مانکی شریف کو پشاور کے مسلم لیگ دفتر سے گرفتار کر لیا گیا۔ اسی دن قیوم اور بیس دیگر لیگی لیڈروں کو پشاور جیل سے ڈیرہ اسماعیل خان سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا تاکہ جیل کی عمارت پر عوامی حملے کو روکا جا سکے۔

کانگریسی وزارت اس حلے میں تو بچ گئی لیکن یہ اظہر من الشمس ہو گیا کہ وہ حکومت جس نے صرف ایک سال پہلے ایک بھاری عوامی اکثریت جیتی تھی اب ایک شدید مخالفانہ سمندر میں ایک الگ تھلگ جزیرہ بن کر رہ گئی تھی۔

نیا وائسرائے، لارڈ لوئیس ماؤنٹ بیٹن ۱۸ اپریل کو نئی دہلی
میں صوبہ سرحد کے گورنر، سر اولف کیرو، وزیر اعلیٰ خان صاحب
اور جواہر لال نہرو سے ملا تاکہ صورت حال پر غور ہو سکے۔ مسلم لیگ
کا کوئی نمائندہ موجود نہ تھا لیکن سرحد میں لیگ کی قوت کا حالیہ مظاہرہ
کانفرنس پر محیط تھا۔ جب ابھی گفت و شنید ہو رہی تھی تو وزیرستان
سرحد کی کلیدی انتظامی چوکی، ٹانک میں نئے فسادات پھوٹ پڑے
ہر روز نئی قبائلی نقل و حرکت کی اطلاعیں ملنے لگیں اور لندن میں سنجیدہ
اخبار "ٹائمز" نے اعلان کیا کہ سرحد ایک دفعہ پھر شعلہ زن ہونے کے
کنارے پر تھا۔[1]

کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ گڑبڑ کو ختم کرنے کے لیے سرحد
میں تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے ۲۴ اپریل کو مسٹر جناح نے
اعلان کیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اسے اس فیصلہ سے مطلع کیا تھا اور
یہ کہ اسے یقین تھا کہ وائسرائے مسلم لیگ سے صحیح سلوک کریگا چنانچہ
اس نے بھی سرحد میں امن و امان قائم کرنے والوں کی ہاں میں ہاں

---

[1] ٹائمز (لندن)، ۱۹ اپریل ۱۹۴۷ء اس باب کا تاریخ وار سلسلہ بہت سے
اخبارات مشمولہ بہ ٹائمز سے مرتب کیا گیا ہے جس کے علاوہ نیو یارک ٹائمز، سٹیٹسمین
(نئی دہلی اور کلکتہ) اور ڈان (نئی دہلی اور کراچی) اور پٹھا وروں سے ذاتی
انٹرویو بھی تھے۔ مخصوص اخباری حوالہ من و عن اقتباس یا ایسے ہی مواد
کے لئے دیا گیا ہے۔

ملادی۔ ۲۷ اپریل کو خان صاحب نے پشاور واپس آکر حکم دیا کہ وہ تمام قیدی رہا کر دیئے جائیں جو تشدد کاری کے مجرم نہیں پائے گئے تھے۔ کوئی چار تا پانچ ہزار مسلم لیگی جیلوں سے باہر آگئے لیکن تنظیم کے بہت سے کلیدی رہنما محبوس ہی رہے۔

دریں اثناء ماؤنٹ بیٹن نے حالات کا جائزہ لینے کے لئے خود سرحد آنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ۲۸ اپریل کو پشاور آیا۔ وہ فوراً ہی غضب آلود مسلم لیگیوں کے ایک ہجوم کو خطاب کرنے کے لئے' بیرون شہر آیا جو اندرون شہر میں جمع شدہ خدائی خدمت گاروں کے ساتھ ٹکر پر تیار تھے۔ اس دن وائسرائے کی موجودگی کی وجہ سے تصادم نہ ہوا لیکن اگلے دن شہر میں بم پھٹنے لگے اور گولیاں چلنے لگیں۔ اس وقت تک انگریزی حکومت سرکاری طور پر برصغیر کی تقسیم کے امکان کو رد کر رہی تھی لیکن اسی دن جواہر لال نہرو اور راجندر پرشاد نے دہلی میں دستور ساز اسمبلی کے تیسرے سیشن کا افتتاح کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ برطانوی راج کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کا تقسیم ہونا عین ممکن تھا۔

اوائل مئی میں ٹائمز نے سرحد کو پھر "ہندوستان کا خطرناک ترین" حصہ قرار دیا[1] روز افزوں تشدد کے پیش نظر گاندھی کی اہمیت

۱۔ ٹائمز (لندن) ۷ رمئی ۱۹۴۷ء

کے حلف بردار خدائی خدمت گاروں نے غضب آلود پٹھان جنگجوؤں
کے سیلاب میں اپنے آپ کو بے دست و پا پایا۔ عبدالغنی خان ابن
عبدالغفار خان نے پختون زلمئ (جوان پٹھان) کی بنیاد رکھی جو
دفاع اور انتقام میں تشدد کی علمبردار تھی۔ اس گروہ کے افراد رائفلوں
اور پستولوں سے مسلح ہو کر عوامی جلسوں میں مسلم لیگ کو للکارنے لگے۔

لیگ کی تحریک کو ختم کرنے کی آخری کوشش کے طور پر
کانگریسی حکومت نے پانچ کلیدی مسلم لیگی لیڈروں کو رہا کر دیا تاکہ
وہ دہلی میں مسٹر جناح سے مشورہ کر سکیں اور کسی پر امن حل پر پہنچ
سکیں۔ سمین جان خان، عبدالقیوم خان، پیر مانکی شریف، میاں
عبداللہ شاہ اور ارباب نور محمد مئی کے پہلے ہفتے میں دہلی آئے
جب وہ مسٹر جناح سے گفتگو کر رہے تھے تو صوبہ سرحد کے سابق
مسلم لیگی وزیر اعلیٰ، سردار اورنگزیب خان کو پشاور میں گرفتار
کر لیا گیا۔

یہ جناح کے لئے ناقابل برداشت تھا اور ۲ مئی کے ایک
بیان میں اس نے اعلان کیا کہ وہ سرحد لیگ کو تحریک سول نافرمانی
ختم کرنے کا مشورہ نہ دے سکتا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ فتنہ و فساد
کی جڑ سرحد پر کانگریسی کنٹرول تھا جو باشندوں کی اکثریت کی خواہشات
کے خلاف تھا اس نے لیگی کارکنوں کے خلاف ایف سی آر کے استعمال
کی مذمت کی۔ اس نے تسلیم کیا کہ لیگ صوبے میں سیکشن ۹۲ الف

کے نفاذ (گورنری راج) پر زور دیتی رہی تھی لیکن اب اس کی امیدیں لندن میں عنقریب ہونے والے نئے انتظامات کے اعلان پر لگی ہوئی تھیں۔

حکومت برطانیہ کی طرف سے کسی فوری فیصلے کی ضرورت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی برطانوی نظم و نسق کس حد تک کمزور پڑتا جا رہا تھا اس کا مظاہرہ ۷ رمئی کو ہوا جب سرایون جنکنز نے پنجاب کے ضلع راولپنڈی کے مسلمانوں پر ایک بھاری جرمانہ عائد کرنے کی ناکام کوشش کی جو پچھلے دو ماہ کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں تھا۔

(شرارت زیادہ تر سندھ پار کے پٹھانوں نے کی تھی اور جرمانہ کبھی نہ وصول کیا جا سکا۔) وزیراعظم ایٹلی نے ۳ رجون کو دارالعوام میں آزادی ہند کا منصوبہ پیش کیا۔ اس میں بٹوارہ مضمر تھا۔ اعلان میں کہا گیا کہ صوبہ سرحد کے تین میں سے دو نمائندے اس وقت مرکزی دستور ساز اسمبلی میں حصہ لے رہے تھے لیکن اگر سارے یا کچھ حصہ پنجاب نے ایک نئی اسمبلی (یعنی بٹوارہ) میں نمائندگی کے لئے فیصلہ دیا تو ایسی صورت میں صوبہ سرحد جغرافیائی طور پر الگ تھلگ ہو جائے گا اور اسے بھی اپنی حیثیت پر غور کرنے کا موقع ملنا ضروری ہوگا۔

اس کے لئے وائسرائے صوبائی حکومت کے مشورے کے

ساتھ ریفرنڈم کرائے گا۔ صوبہ سرحد کی قانون ساز اسمبلی کے تمام رائے دہندگان ریفرنڈم میں حصہ لینے کے مجاز نہ ہوں گے۔ یہ "نیا انتظام" تھا جس کی مسٹر جناح کو لندن سے امید تھی۔ اس نے سرحد میں کانگرس پارٹی کا جنازہ نکال دیا اور سرحد کی پاکستان میں شمولیت کو یقینی بنا دیا۔ لیگ نے اپنی ۵۔۱ روزہ پرانی تحریک سول نافرمانی بند کر دی اور ریفرنڈم کے لئے اپنی بھرپور مہم شروع کر دی۔

وانا بریگیڈ کے کمانڈر، بریگیڈیر جے۔ آر۔ بُرتھ کو ریفرنڈم کمشنر مقرر کیا گیا۔ پورا عمل برطانوی فوجی افسروں کی نگرانی میں ہُوا، اور اس میں پولیٹیکل سروس یا ہندوستانی اہلکاروں سے کوئی مدد نہیں لی گئی۔ کچھ عرصے تک صوبہ سرحد کے گورنر سر اولف کیرو کو خدائی خدمت گار اور کانگرس مسلم لیگ کا حامی سمجھتے رہے جس کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ تعصب کے الزام سے بچنے کے لئے سر اولف ۱۸ رجون کو اپنی ہی درخواست پر چھٹی پر چلا گیا۔ اس کی جگہ سر راب لوکہارٹ نے لی جو اس وقت تک افواج ہند کی جنوبی کمان کا سربراہ تھا۔

کانگرسی رہنماؤں کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ مسٹر جناح نے انہیں بساط سیاست پر شکست دیدی تھی۔ صوبہ سرحد کے غالب اکثریتی مسلمانوں کو دو میں سے ایک راستہ چننا تھا یعنی

موجودہ ہندو زدہ اسمبلی کے لئے نمائندے بھیجنا جیسا کہ دہلی اسمبلی میں شرکت نہ کرنے والے دوسرے صوبے بھیجیں گے ۔ (یعنی مسلم پاکستان میں شرکت) یہ تو واضح ہو ہی چکا تھا کہ پاکستان مسٹر جناح اور اس کی مسلم لیگ کی تخلیق ہو گا اور اس میں خدائی خدمت گاروں جیسے مسلمان منحرفین کی کوئی جگہ نہ ہو گی۔

اس مخمصے میں پھنس کر خدائی خدمت گاروں کے لئے ایک ہی راستہ کھلا تھا اور انہوں نے اسے کچھ سیاسی قوت قائم کرنے کا آخری سہارا سمجھتے ہوئے اپنا لیا۔ خدائی خدمتگار فرقہ وارانہ تو کبھی نہ تھے، لیکن وہ ہمیشہ ایک خالص صوبائی تنظیم رہے تھے۔ یہ ابتدائی طور پر ایک پٹھان پارٹی تھی اور ثانوی طور پر کانگرسی۔ لہٰذا اگر سرحد کو ہندوستان اور کانگرسی راج سے علیحدہ ہی کرنا تھا تو خدائی خدمتگار صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتے تھے اگر کسی قسم کا پٹھانستان پاکستان کے اندر یا باہر قائم ہو جائے جس سے ان کی شناخت ہو سکے۔ پٹھان خود مختاری کا یہ خیال سراسر بیانہ تھا۔ پچھلے چند ماہ میں اس پر قدرے بحث ہوتی رہی تھی۔ قبائلیوں کے لئے اس میں ایک فطری کشش تھی اور کانگرس اور لیگ کی سیاست سے انہیں کیا سروکار تھا۔ افغانستان سے بھی اس کی حمایت کی توقع تھی لیکن ریفرنڈم میں یہ شامل نہیں تھا۔

خدائی خدمت گار اعلان کے ساتھ ہی ریفرنڈم کے خلاف

لڑ رہے تھے ۱۸ر جون کو دہلی میں وائسریگل لاج کی ایک میٹنگ میں جس میں گاندھی اور جناح دونوں موجود تھے، عبدالغفار خان نے رسمی طور پر "پٹھانستان" کا انتخاب بھی پیش کیا۔ لیکن کانگرس پہلے ہی ہندوستانی ریاستوں کے مسئلے پر متفکر تھی جس کا اسے سامنا کرنا تھا۔ گاندھی، نہرو اور پٹیل پاکستان سے بھی زیادہ برصغیر کی مزید تقسیم سے خوفزدہ تھے لہٰذا گاندھی نے جناح کے ساتھ مل کر ۳ر جون کے منصوبے کو تسلیم کر لیا جو انگریزوں نے پیش کیا تھا۔

تاہم ۲۲ر جون کو بنوں میں کانگرس پارٹی کی ایک میٹنگ میں ایک علیحدہ پٹھان سٹیٹ کے مطالبے پر اتفاق کیا گیا "جو ایک پٹھان دستور کی مالک ہوگی اور جس کی تشکیل جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف کے اسلامی تصورات پر ہوگی"۔[۱] اسی دن جواہر لال نہرو نے پنجاب اور صوبہ سرحد سے آئے ہوئے پشتو بولنے والے سکھ اور ہندو پناہ گزینوں کو ہردوار (صوبجات متحدہ) میں خطاب کرتے ہوئے اس خیال کی برملا حمایت کی۔

۲۳ر جون کو پنجاب کی قانون ساز اسمبلی نے انتہائی کشیدگی کی فضا میں ایک نئی اسمبلی کے لئے نمائندے بھیجنے پر ووٹ دیا، جو اصل میں تقسیم ہند اور دونوں نئی سلطنتوں کے درمیان تقسیم صوبہ پر ووٹ تھا۔ وائسرائے نے فوراً ہی صوبہ سرحد میں موجودہ

۱۔ نیویارک ٹائمز، جون ۲۳ر ، ۴۷ ۱۹ء

ریفرنڈم کے طریقہ کار کا اعلان کیا۔ عین اسی وقت عبدالغفار خان نے دہلی میں ایک آزاد پٹھان سٹیٹ کی حمایت کے لئے حلف اٹھایا۔ اس نے برطانوی حکومت پر سخت تنقید کی کہ اس نے ریفرنڈم میں یہ انتخاب مہیا نہ کیا تھا اور الزام لگایا "وہ پٹھانوں کی مرضی کے خلاف صوبہ سرحد پر پاکستان تھوپ دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ روس کے خلاف اپنے فوجی اڈے اور ہوائی فرودگاہیں قائم کر سکیں"۔[1] ۲۴ جون کو غفار خان نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ خدائی خدمت گار سرحد میں ریفرنڈم کا بائیکاٹ کریں گے۔

مسٹر جناح نے الزام لگایا کہ پٹھانستان کی کانگرسی حمایت "حکومت برطانیہ کی ۳ جون کے پلان کی کانگرسی منظوری کی صریح خلاف ورزی تھی"۔[2] اس نے گاندھی اور غفار خان کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا کہ وہ اس خیال کو آگے بڑھا رہے تھے اور وعدہ کیا کہ صوبہ سرحد ایک غیر مخصوص انداز میں پاکستان کا ایک خود مختار حصہ ہوگا۔

سرحد میں ریفرنڈم ۶ جولائی کو شروع ہوا یعنی اسی دن جس دن برصغیر کی دوسری طرف آسام کے ضلع سلہٹ میں یہ پرامن طریقے سے جاری رہا، گو خدائی خدمت گاروں کے مقاطعہ نے کافی لوگوں کو

---

[1]- نیویارک ٹائمز، جون ۲۴، ۱۹۴۷ء

[2]- نیویارک ٹائمز جون ۲۹، ۱۹۴۷ء

ووٹنگ کے لئے نہ آنے دیا۔ ۱۸ رجولائی کو لندن میں قانون آزادیٔ ہند کی شہنشاہ نے منظوری دی اور یوں انتقال اقتدار کو باقاعدہ شکل دی گئی اور ۱۹ رجولائی کو سرحد میں ریفرنڈم مکمل ہوا۔ اگلے دن اس کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا۔ اس سے صوبہ سرحد نے واضح طور پر پاکستان کی حمایت کی گو طرفین نے متضاد دعوے کئے۔

صوبہ سرحد کی صرف ۵۰٫۹۹ فیصد ایلکٹوریٹ نے فیصلہ دیا۔ ان میں سے ۲۸۹٫۲۴۴ پاکستان کے اور ۲۸۷۴ ہندوستان کے حق میں تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ پاکستان کی حامی مسلم لیگ نے ڈالے گئے ووٹوں کا ۹۹٫ فیصد سے بھی زیادہ حصہ جیتا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ احتراز کرنے والے ۴۹٫۰۱ فیصد میں سے کتنوں نے خدائی خدمت گاروں سے عقیدت کی بنا پر ایسا کیا۔ کچھ نے یقیناً ایسا کیا۔ یہ امکان خواہ کتنا بھی بے معنی ہو خدائی خدمت گاروں کا آخری اظہار قوت تھا۔

صوبہ میں تناؤ قائم رہا اور خدائی خدمت گار آئندہ تشدد کا ہولناک ذکر کرتے رہے۔ لیکن آزادی کی تیز رفتار گاڑی روانہ ہو چکی تھی اور عبدالغفار خان اور انکے کانگرسی ساتھی، جہاں تک سرحد کی اکثریتی آبادی کا تعلق تھا، اس سے رہ گئے تھے۔ ۳۰ اگست کو سر جارج کننگھم جو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۶ء تک سرحد کا گورنر رہا تھا، دوبارہ واپس آیا تاکہ آخری ایام کی نگرانی کر سکے۔

آزادی اور بٹوارا :۔

۱۵ اگست سرحد میں ایک خاموش مسرت کی فضا میں نمودار ہوا ۲۲ اگست کو پاکستان کے گورنر جنرل نے خان صاحب کی وزارت کو ختم کر دیا جو ڈیڑھ سال سے بر سر اقتدار تھی اور مسلم لیگ اسمبلی لیڈر، عبدالقیوم خان وزیر اعلیٰ بنا۔ اگلے چھ ماہ تک وہ قریباً اکیلا ہی حکومت چلاتا رہا اور سرحد کو اس نے اس فرقہ وارانہ خوف و دہشت سے بچا لیا جو پنجاب میں پھیل رہا تھا۔ انگریزوں کا چھوڑا ہوا نظم و نسق جوں کا توں رہا لیکن قیوم نے سرحد میں ایک نیا اور متحرک جذبہ پیدا کر دیا جس نے بعد کے سالوں میں برطانوی ہند کے "مسئلہ صوبہ" کو پاکستان کا "مثالی صوبہ" بنا دیا۔

جنوری ۱۹۴۸ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے صوبے کا دورہ کیا اور نئی حکومت کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ سر جارج کننگھم بیمار ہوا تو اپریل کے شروع میں اس کی جگہ امبروس ڈنڈاس نے لی جو اس سے پہلے بلوچستان میں اے جی جی تھا۔ اسی ماہ مسٹر جناح سرحد کے دورے پر آئے۔ اس دورے کے دوران خدائی خدمت گاروں کی انحطاط پذیر قوت کو آخری دھچکا لگا جب غفار خان کے ایک سابقہ دست راست میاں جعفر شاہ کو گورنر جنرل کی تجویز پر دور کی مسلم لیگی کابینہ میں شامل کر

لیا گیا۔ (دوسرا وزیر محمد عباس خان تھا)۔ ایک نیا بجٹ تیار ہوا اور منظور کر لیا گیا جس کا مقصد صوبہ کو خود کفیل بنانا تھا۔

یہاں ایک ایسا مسئلہ جس نے پاکستان کو ہمیشہ سے پریشان کر رکھا ہے انتہا پسند نوجوان پیر مانکی شریف نے اٹھایا جس نے صوبے کو پاکستان کے لئے جیتنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا تھا۔ پیر صاحب نے خان صاحب کی وزارت کی برطرفی کے بعد قیوم حکومت میں وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں وہ مرکزی دستور ساز اسمبلی کے لئے انتخاب میں ناکام رہے۔ انہوں نے اب مطالبہ کیا کہ گورنر جنرل جناح اور وزیراعلیٰ قیوم فوراً صوبے میں شریعت راج نافذ کر دیں تاکہ پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانے کا مقصد حاصل ہو سکے۔ یہ مطالبہ ٹھکرا دیا گیا اور مانکی حزب اختلاف میں چلے گئے اور وہ قیوم حکومت تک اسی کردار پر قائم رہے۔

عبدالغفار خان نے بھی اسلامی حکومت پر زور دینا شروع کر دیا۔ وہ مسلم لیگ حکومت کا سخت مخالف رہا اور مئی ۱۹۴۸ء میں اس نے ایک وسیع تقریری دورہ کیا۔ اس نے اشارتاً کہا کہ "پختونستان" اب بھی ممکن تھا۔ ابتدائے جون میں اسے ایک نئی پاکستان پیپلز پارٹی کا صدر چنا گیا جو خدائی خدمت گاروں کی جگہ بنائی گئی جن پر کانگرس کی چھاپ بہت گہری تھی۔

غفار خان کے دورہ یورپ کی افواہیں ۱۵ر جون کو ختم ہو گئیں

جب اسے ضلع کوہاٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں، بہادر خیل میں گرفتار کر لیا گیا۔ اگلے دن ڈی سی کوہاٹ نے کوہاٹ، بنوں روڈ پر واقع بانڈہ داؤد شاہ کے پکے فرش کے ریسٹ ہاؤس میں ایف سی آر کے سیکشن ۴۰ کے تحت اس کے خلاف مقدمہ کی سرسری سماعت کی۔ اسے تین سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ جرم "مملکت کے خلاف بغاوت"[1] بتایا گیا۔

صوبہ سرحد کی حکومت کو غیر مقبول ایف سی آر کے استعمال کا احساس تھا لہٰذا اس نے ایک لمبا کمیونک جاری کیا جس میں الزام لگایا گیا تھا کہ غفار خان بنوں جا رہا تھا "جہاں معتبر اطلاعات کے مطابق اسے فقیر آف ایپی کے ایجنٹوں سے رابطہ قائم کرنا تھا تاکہ سرحد میں فتنہ بھڑکایا جا سکے"[2]۔ غفار خان پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ "صوبہ سرحد میں فساد پھیلانے کی ایک قطعی اور سوچی سمجھی سازش جو عین اس وقت ہوئی جب ہندوستانی فوج براستہ کشمیر صوبہ سرحد میں متوقع پیش قدمی میں شریک تھا"[2] اور یوں اس میں ایک بین الاقوامی پہلو بھی پیدا ہو گیا۔ سابقہ کانگرسی حکومت کا وزیر مال، قاضی عطاء اللہ جان

1۔ سٹیٹسمین، ۱۶ رجون، ۱۹۴۸ء

2۔ ٹائمز (لندن)، ۷ رجون ۱۹۴۸ء کمیونک کا پورا متن ڈان ۱۶ رجون ۱۹۴۸ء میں موجود ہے۔

اور صدر سرحد کانگرس کمیٹی، امیر محمد خان بھی ۱۹ جون کو اس سازش کے سلسلے میں پشاور میں گرفتار کر لئے گئے۔

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا غفار خان ان جرائم کا مرتکب تھا یا نہیں۔ ایپی پہلے ہی افغانستان کی زیرِ سرپرستی تحریک "پختونستان" کا حامی بن چکا تھا اور حکومت پاکستان کے پاس اس یقین کی کوئی نہ کوئی وجہ تھی کہ ۱۹۴۸ء کے موسم بہار میں مربوط ہندوستانی اور افغان حملے سرحدات پر متوقع تھے۔ غفار خان ۱۹۵۴ء کے آخر تک جیل میں رہا۔ اس نے اس وقت سے مسلسل انکار کیا کہ اس کا ایپی کے ساتھ کوئی تعلق تھا یا اسے کسی ایسے "پختونستان" کی خواہش تھی جو پاکستان کا مخالف ہو اور جس کے لئے ایپی کوشاں تھا، لیکن غالباً غفار خان کی گرفتاری کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ اس پر عوامی ردِعمل بہت معمولی ہوا۔ ایک سال سے بھی کچھ عرصہ پہلے "بادشاہ خان" سرحد کا مقبول ترین اور طاقتور ترین انسان تھا۔ چھ ماہ پرانی حکومت نے جون میں اسے کسی اہم عوامی احتجاج کے بغیر گرفتار کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنا وقار کتنا کھو چکا تھا۔

۸ جولائی ۱۹۴۸ء کو صوبہ سرحد کی حکومت کو غیر معمولی اختیارات مل گئے کہ وہ آرڈی ننس کے ذریعے تمام ایسی تنظیموں کے خلاف قانون قرار دے سکتی تھی جن کی سرگرمیاں امن د

تحفظ کے منافی ہوں۔ یہ صاف طور پر واضح کر دیا گیا کہ یہ اقدام خدائی خدمت گار بحیثیت ایک گروہ سے کہیں زیادہ اس 'بیرونی جوڑ توڑ' کے خلاف تھا جو ان کا استعمال کرتی رہی تھی تاہم خدائی خدمت گار بیس سال بھی کم عرصے کی متشددانہ اور کبھی کبھار بے حد کامیاب سیاسی سرگرمی کے بعد ختم کر دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی سرحد میں بٹوارے کا بحران بھی ختم ہو گیا۔

قبائلی علاقہ :

قانون آزادی ہند' دفعہ ۷، پیرا 'ج' میں مذکور ہے :

"اس قانون کے پاس ہونے کی تاریخ پر وہ تمام معاہدات و متفقات بھی ساقط ہو جاتے ہیں جو شہنشاہ اور ان طاقتوں کے درمیان ہوں جو قبائلی علاقوں میں اختیار رکھتی ہوں اور اور اس تاریخ پر موجود ذمہ داریاں جو کسی ایسے اشخاص یا قبائلی علاقوں سے متعلق شہنشاہ پر عائد ہوتی ہوں اور وہ تمام اختیارات، حقوق، حاکمیت یا دائرۂ اقتدار جو قبائلی علاقوں میں یا ان سے متعلق کسی معاہدہ، سند شاہی، رواج، چشم پوشی یا کسی بھی وجہ کی بنا پر اس تاریخ کو شہنشاہ کے استعمال میں لائے جا سکتے ہوں"

اس کی وجہ سے دیر، سوات، چترال اور امب کی ریاستوں

کے سامنے بھی وہی مسئلہ پیش ہوا جو مزید مشرق کی طرف زیادہ اہم ریاستوں کے سامنے پیش ہوا تھا یعنی مسئلہ الحاق، یہی حال طائفوں اور قبائل کا تھا جن کا کوئی مسلّمہ حاکم فرد یا ادارہ نہ تھا جو ان کا ذمہ دار ہوتا۔ بلوچستان میں قلات، مکران، لسبیلہ اور خاران کی ریاستیں بھی جو پٹھان سرحد کو بحیرہ عرب سے ملاتی ہیں اسی مسئلے سے دوچار تھیں۔

گو یہ علاقے اور ان کے لوگ واقعتاً "ہندوستان کے دور افتادہ ترین حصے" تھے تاہم یہ برصغیر میں رونما ہونے والے واقعات سے ناگزیر طور پر متاثر ہوئے تھے۔ جب پشاور میں مسلم لیگ کانگرس سے مسابقت میں شریک تھی تو قبائل اپنا اظہار روایتی انداز میں کر رہے تھے، ۱۹۴۷ء کے پہلے تین ماہ میں آفریدیوں نے تین دفعہ درہ خیبر کو بند کیا تھا۔ آفریدی ملوک کی ایک جماعت سر اولف کیرو کے بوجھ کو معمولی سا بھی ہلکا نہ کر سکی جب وہ پشاور کے گورنمنٹ ہاؤس میں اسے بتلانے آئی۔ "ہمیں کانگرس پارٹی سے سروکار نہیں۔ ہمیں مسلم لیگ سے واسطہ نہیں۔ ہم ایک ایسی حکومت کے ساتھ بات کر سکتے ہیں جو طرفین کی نمائندہ ہو۔ درہ خیبر ہمارا ہے اور ہم اسی بنیاد پر سودا کریں گے۔"[۱]

ایک ماہ بعد ایسا ہی اعلان لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے کیا

۱۔ نیویارک ٹائمز، ۲۰ مارچ ۱۹۴۷ء

ملک دین خیل آفریدی، ملک عبداللطیف خان نے کیا جب وہ سرحد کے دورے پر تھا۔ عبداللطیف ایک قدم اور بھی آگے گیا اور دھمکی دی کہ اگر وہ آئندہ تعلقات سے مطمئن نہ ہوا تو افغانستان سے مذاکرات کرے گا۔ یوم آزادی نے اس آزادی کی قانونی تصدیق کردی جو عملاً انہیں حاصل تھی۔ انگریزوں کے جانے سے سرحدی پہاڑیوں کے طرز زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑا، لیکن میدانوں میں جو کھلبلی مچی اس میں ایک تاریخی کشش تھی۔ ستمبر کے آغاز تک کہیں کہیں قبائلی نقل و حرکت دیکھنے میں آئی۔ بلوچستان میں نعاریوں نے زیریں پنجاب میں ہلے بولے اور دہشت و تباہی کا سماں پیدا کر دیا۔ پٹھانوں کے ایک مخلوط گروہ نے کوہاٹ کے قریب ایک فوجی ٹرین پر حملہ کیا جو بمبئی گرینیڈیئرز کو کوہاٹ چھاؤنی سے واپس لے جارہی تھی اور ۲۲ مار دیئے اور ۹۴ زخمی کر دیئے۔ لیکن یہ واقعات اکا دکا تھے اور ۶ ستمبر کو ٹائمز کے چشم دید نامہ نگار نے خبر دی "پٹھان قبائلیوں نے بھی ابھی تک کوئی خاص مسئلہ کھڑا نہیں کیا کیونکہ سال کے اس حصہ میں وہ اپنے ریوڑوں کے ساتھ وادیوں میں اتر آتے ہیں۔ پٹھانوں کا گولی چلانے کا موسم سال کے بعد کے حصہ میں شروع ہوتا ہے۔"[1] جب گولیاں چلانے کا موسم آیا تو پٹھانوں کی ساری توانائیاں جہاد کشمیر پر مرکوز تھیں اور قبائلی علاقہ خاموشی سے اور قریباً غیر محسوس

---

[1] ٹائمز (لندن) ۶ ستمبر ۱۹۴۷ء

طور پر پاکستان کا ایک حصہ بن گیا۔ کراچی کی حکومت نے ہر طرف
سے مجبور ہو کر فوری طور پر قبائلی علاقے میں تمام فوجی تنصیبات کو
یک دم چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ کشمیر میں مصروف ہونے کی وجہ سے
قبائلی ان کی وفاداری پر اعتماد کے اس اشارے کو بمشکل ہی دیکھ
سکے۔ گورنر جنرل جناح صاحب کی سالگرہ کے دن ۲۵ دسمبر ۱۹۴۷ء
کو اعلان کیا گیا کہ باقاعدہ فوجی یونٹوں کی واپسی مکمل ہو گئی تھی۔

تمام اہم ترین قبائل کے جرگوں نے پہلے ہی سر جارج کننگھم
کے ساتھ معاہدے کر لئے تھے کہ انہوں نے پاکستان کو انہی شرائط پر
اپنا نیا حاکم تسلیم کر لیا تھا جو انگریزوں کے ساتھ کی گئی تھیں۔ وسط
جنوری ۱۹۴۸ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے بھی قبائلی
علاقے کا طوفانی دورہ کیا تاکہ عمل الحاق کو تقویت حاصل ہو۔
وہ ۱۵ جنوری کو خیبر رائفلز کے صدر مقام لنڈی کوتل کے ایک
جرگہ میں موجود تھے اور انہوں نے قبائلیوں سے کشمیر سے واپس آنے
کی رسمی اپیل کی۔ آفریدیوں نے ان کا والہانہ استقبال کیا لیکن ان
کی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ عبداللطیف خان اور مراد خان شنواری
نے اعلان کیا کہ کشمیر پٹھانوں کا تھا اور ۴۰ ہزار قبائلی جو وہاں
گئے تھے اس وقت واپس ہوں گے جب تک وہ اسے لڑ کر جیت
نہ لیں۔ دونوں ملکوں نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے الاؤنسز
میں اضافے کا مطالبہ کیا تاکہ فصلوں کی کمی کا مداوا ہو سکے اور

ان کی نئی ذمہ داریوں کے اخراجات پورے ہو سکیں لیاقت علی نے جواباً خوبصورتی سے ان درخواستوں کو ٹھکرا دیا۔ اگلے دن میرانشاہ اور ٹانک میں بھی ایسے ہی مناظر دیکھے گئے جہاں وزیراعظم نے وزیر اور محسود جرگوں سے خطاب کیا۔

۱۴ اپریل ۱۹۴۸ء کو تھکے ماندے بیمار لیکن فتح مند قائداعظم محمد علی جناح بھی آئے اور یوں الحاق کا یہ عمل اپنے جوبن پر پہنچا۔ وہ خیبر سے گزرے اور اس کے سرے پر سرحد پار، ڈیورنڈ لائن کی دوسری طرف افغان سنتری سے ہاتھ ملائے۔ آفریدیوں اور شنواریوں نے خوشی کے اور اعزاز کے طور پر اپنا بارود دل کھول کر استعمال کیا۔ کوکی خیل آفریدیوں کے نوجوان رہنما، ملک ولی خان نے قائداعظم کو ۳۰۳ رائفل بطور اظہار دوستی و وفاداری پیش کی جو جمرود میں اس کی اپنی فیکٹری میں تیار کی گئی تھی۔ (چار سال بعد یہی ولی خان کابل میں ایک مفرور کی حیثیت سے زیادہ مخالف قبائلیوں کا ایک لشکر پاکستان پر حملہ کے لئے لایا) لیکن جشن مناتے ہوئے قبائلی بالکل بے خود نہیں ہوئے۔ حسب معمول انہوں نے کہا کہ اگر انہیں نئی قوم کی مناسب خدمت کے قابل بنانا مقصود تھا تو انہیں خوراک و پوشاک کے لئے زیادہ الاؤنس درکار تھے۔

۱۷ اپریل کو پشاور کے گورنمنٹ ہاؤس میں تمام قبائل کا جرگہ منعقد ہوا۔ قائداعظم کی موجودگی میں ۔ ۲۰ ملوک نے پاکستان

سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ اپنے نئے ملک کے لئے کشمیر حاصل کرنے کا عزم دہرایا اور التجا کی کہ انہیں براہ راست مرکزی حکومت کے تحت رکھا جائے۔ یہ التجا ۶ جولائی کو منظور کر لی گئی جب قائداعظم نے ریاستوں اور سرحدی علاقوں کی وزارت قائم کی اور ذاتی طور پر قبائلی علاقہ کی ذمہ داری قبول کر لی۔

جب کراچی میں یہ اقدامات ہو رہے تھے تو ٹوچی سکاؤٹوں کے ایک دستہ نے وزیرستان میں فقیر ایپی پر حملہ کیا اور ایک معرکہ میں ایپی کا نائب سید امیر مارا گیا اور ۱۳ قیدی بنا لئے گئے۔ ایک اور واقعہ ہوا کہ ایک انگریز پولیٹیکل افسر پی۔ ٹی۔ ڈنکن جس نے بطور پولیٹیکل ایجنٹ جنوبی وزیرستان پاکستان میں رہنا منظور کیا تھا ایک برانگیختہ محسود کے ہاتھوں ٹانک سے کوئی ۶ میل کے فاصلے پر مارا گیا۔ ان دو واقعات کے سوا وحشیانہ قبائلی علاقہ پر امن طور پر نئے دور میں داخل ہو گیا۔

وظائف جاری رکھے گئے لیکن سال کے خاتمہ تک ظاہر ہو گیا کہ قبائلی علاقوں میں فوجی چھاؤنیوں کی ویرانی ایک رحمت بے زحمت نہ تھی۔ فوجیں جو گئیں تو ان کے ساتھ ہی رسد رسانی اور سڑک سازی کے ٹھیکے بھی گئے جو نادار قبائل کے لئے اقتصادی طور پر اتنے اہم تھے۔ محسودوں اور وزیریوں کو بہت نقصان ہوا اور ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ وہ دستوں کی واپسی کی درخواستیں

کرنے لگے لیکن مجموعی طور پر قبائلی علاقہ میں آتنا امن و سکون تھا کہ سالہا سال بعد نصیب ہوا تھا۔

ریاستیں :-

سرحدی ریاستوں نے نئی حکومت پاکستان کو کوئی مسئلہ پیش نہیں کیا۔ سب نے فوراً ہی الحاق کر لیا اور چترال نے اس مبہم حاکمیت کو نظر انداز کر دیا جو کشمیر ۱۸۵۴ء سے اس پر جتلا رہا تھا۔ بلوچستان میں ریاست قلات نے جو جنوبی سرحد پر چھائی ہوئی تھی اور اس میں ایک مضبوط پٹھان عنصر تھا، ایک زیادہ مشکل مسئلہ پیدا کیا۔

۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو خان قلات میر احمد یار خان نے بادلِ ناخواستہ پاکستان کے ساتھ ایک معاہدہ قبول کر لیا جس میں آزادانہ رسل و رسائل اور تجارت کی آمدورفت کی ضمانت تھی۔ دفاع، خارجہ امور اور مواصلات پر بعدہٗ مذاکرات کا ذکر تھا اور قلات کو ہندو پاکستان کی دیگر ریاستوں سے مختلف درجے کا سمجھتے ہوئے ایک آزاد ریاست تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ غیر معینہ صورتحال چھ ماہ تک جاری رہی جب پاکستان زیادہ توجہ طلب مسائل حل کرتا رہا۔

دریں اثناء خان قلات نے اپنے عزائم کا کھل کر اظہار کر دیا۔ اس نے جنگی اہمیت کے کوئٹہ اور بولان کے علاقوں کی

واپسی پر زور دینا شروع کیا جو تین چوتھائی صدی پہلے ریاست قلات نے انگریزوں کو اجارے پر دیئے تھے۔ ۱۲ فروری ۱۹۴۸ کو قائداعظم میر احمد سے سبی میں ملے لیکن کراچی اور قلات کے درمیان بڑھتا ہوا تناؤ کم نہ ہو سکا تاہم قائداعظم طاقتور بلوچ اور براہوئی قبائلی سرداروں کی اطاعت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو عرصہ سے خان سے بگڑے ہوئے تھے۔ خبریں آنے لگیں کہ میر احمد ہندوستان اور افغانستان دونوں سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھا تاکہ ایک مکمل طور پر آزاد قلات کے لئے حمایت حاصل کر سکے۔ کراچی بالخصوص افغانستان اس مبینہ پیش کش پر متفکر تھا کہ وہ گوادر (اس وقت عمانی حاکمیت میں) اور پسنی کی بندرگاہیں استعمال کر سکتا تھا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ خان نے ہندوستان کو پیش کش کی تھی کہ وہ خلیج فارس کی پروازوں کے دوران مکرانی ایئر فیلڈ بطور درمیانی وقفہ استعمال کر سکتا تھا۔

ان کے سدباب کے لئے پاکستان نے ایک پورے اور غیر مشروط الحاق کے سلسلے میں اپنا دباؤ بڑھانا شروع کیا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ کو قلات کنفیڈریسی کی تحتی ریاستوں، خاران، مکران اور لس بیلہ نے میر احمد خان کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان سے الحاق کر لیا۔ پاکستانی فوج کوئٹہ میں بڑھا دی گئی اور بحریہ کے یونٹ ساحل مکران پر گشت کرنے لگے۔ مارچ کے آخر میں پاکستانی

وزارت خارجہ کے جائنٹ سیکرٹری کرنل اے ایس بی شاہ نے کوئٹہ میں قلات کے وزیر خارجہ کے ساتھ نئے مذاکرات کا آغاز کیا۔

اسی گفت وشنید کے دوران خان نے قلات کے وزیر اعظم محمد اسلم خان کو اس بناء پر گرفتار کر لیا کہ وہ پاکستان کے ساتھ سازش کر رہا تھا۔ ۲۷ مارچ کو آل انڈیا ریڈیو نے یہ خبر نشر کی کہ خان نے دو ماہ پہلے ہندوستان سے الحاق کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے ٹھکرا دیا گیا تھا۔ بعد میں وزیر اعظم نہرو نے ہندوستانی پارلیمنٹ میں اس خبر کی تردید کر دی لیکن اس سے بحران ختم ہو گیا اور ۲۸ مارچ کو میر احمد نے غیر مشروط طور پر پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیا۔

جہاد کشمیر :-

۴۸-۱۹۴۷ء میں کشمیر پر پٹھانوں کا حملہ دو لحاظ سے اہم ہے ایک تو بین الاقوامی اور قانونی ہے۔ اس میں آزادی اور بٹوارے کے وقت ریاست کا مقام اور اس وقت سے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے ساتھ اس کے تعلقات شامل ہیں۔ یہ مسئلہ اقوام متحدہ کے سامنے کئی دفعہ گرما گرم بحثوں کا موضوع رہا ہے اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان درجنوں دو طرفہ کانفرنسوں کے زیر غور آیا ہے۔ اس کی تفصیلات پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

حملے کا دوسرا رخ کشمیر میں قبائلیوں کی کارکردگی پر مشتمل

ہے۔ اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی حالانکہ اس میں قبائل کے کردار کی
ایک کلید اور ان کی قوت کی امکانیات اور تحدیدات کا ایک
عملی ثبوت پوشیدہ ہیں۔ قبائلیوں نے کشمیر میں بہت سے ایسے کام
بھی کئے جو قابلِ تعریف نہ تھے لیکن اس میں کوئی شک و شبہ نہیں
کہ ریاست میں ان کی مداخلت بنیادی طور پر اس لئے ظہور پذیر ہوئی
کہ ان تک ظلم و ستم کی داستانیں پہنچیں جو ریاستی فوج کے ڈوگرے
(کشمیر کے روایتی جنگجو) اور ہندو تشدد پسند تنظیم، جن سنگھ کے
کارکن کشمیر کے مسلمان باشندوں پر کر رہے تھے۔ اس نے ان کے کشمیر
پر حملے کو ان کی نگاہوں میں صحیح معنوں میں جہاد کا رنگ دے دیا

۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی رات کو جب پنجاب میں کشت و خون
ابھی قدرے کم ہونے لگا تھا تو قریباً ۲ ہزار پٹھانوں کا ایک لشکر
جس میں زیادہ تر آفریدی تھے۔ صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ سے
سرحد کشمیر کے عین پار مظفر آباد کے قصبے میں وارد ہوا۔ ان میں سے
اکثر ڈیڑھ میل کے مغرب میں قریباً۔۔ ار ٹرکوں پر کرشن گنگا پل پار
کر کے آئے تھے۔ کچھ اور زیادہ رومانوی انداز میں گھٹوں اور تختوں
پر تیر کر پہنچے تھے۔ انہوں نے تیزی اور چابکدستی سے مظفر آباد کو
لوٹا اور پھر بڑی سڑک پر اوڑی اور سری نگر کی طرف روانہ ہو
گئے۔

ایک اور گروہ پونچھ کے راستے اوڑی کی طرف بڑھا۔

غیر منظم اور خوفزدہ ریاستی فوج ان کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔

چھاپہ ماروں نے مظفرآباد اور دوڈومیل کے درمیان سڑک پر ڈوگروں کی ایک بٹالین سے مقابلہ کیا اور انہیں تتر بتر کر دیا۔ انہوں نے پاور سٹیشن پر قبضہ کر لیا جو پچاس میل مزید مشرق کی طرف سرینگر کو بجلی مہیا کرتا تھا۔

حملے کی خبر دہلی میں ۲۶ اکتوبر کو پہنچی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ایک بہ عجلت تیار کردہ معاہدے کے مطابق مہاراجہ کشمیر نے جس نے اب تک ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اپنی ریاست کو ہندوستان سے ملحق کر دیا۔ شیخ عبداللہ (جسے مہاراجہ کی جیل سے اسی مقصد کے تحت چھوڑا گیا تھا) کے تحت ایک عبوری حکومت سرینگر میں بنائی گئی اور ۱۲ ہزار ہندوستانی سکھ فوجی بذریعہ ہوائی جہاز فوراً ریاست میں بھیج دیئے گئے۔

۳۰ اکتوبر تک پٹھان لشکر پٹن پہنچا جو سرینگر سے ۱۸ میل دور تھا لیکن اس کے ہراول دستے پہلے ہی دارالحکومت کے مضافات تک پہنچ رہے تھے۔ ۱۵ ہزار کی کشمیری ریاستی فوج پہلے ہی فرار اور اموات وغیرہ کی وجہ سے قریباً ختم تھی اور سری نگر کے دفاع کا انحصار ہندوستانیوں پر تھا۔ سکھ بٹالین سری نگر کے ہوائی اڈے پر بس عین وقت پر ہی پہنچ کر قبائلیوں سے بچا سکی۔

جیسا کہ ثابت ہوا۔ ہوائی اڈے پہ ہندوستانی قبضے کا مطلب یہ بھی تھا کہ حملہ آوروں کی فتح رک گئی۔ لیکن کچھ عرصے کے لئے نتیجہ مشکوک رہا۔ چھاپہ مار وادئ کشمیر کے دروازے، بارہ مولہ پر بہت سخت جمے ہوئے تھے ۳۱ اکتوبر کو انہوں نے ایک دستہ پہاڑوں کے پار گلمرگ کو بھیجا۔ اسی دن انہوں نے اوڑی کے قریب ڈوگروں کے تو منتظم باقیات کو توڑ پھوڑ دیا۔

لیکن سکھوں نے ہوائی اڈے پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور ہندوستان سے کمک مسلسل آتی رہی اور ایک ماہ پرانی رائل انڈین ائیر فورس نے اپنے آتش بار پٹاخوں کے ذریعے وادی کی بلندیوں تک چھاپہ ماروں کے رسل ورسائل اور حمل ونقل کو مخدوش کر دیا۔ ۴ نومبر کو قبائلی پٹین سے باہر دھکیل دیئے گئے جب انہوں نے ہوائی اڈے پر ایک قینچی چال کی کوشش کی جو بہادرانہ تو تھی لیکن دیر سے کی گئی۔ ان میں سے بعض تو پسپا ہونے سے پہلے سرینگر سے صرف پانچ میل کے اندر تھے۔ یہ کشمیر میں ان کی پیشقدمی کا نقطۂ معراج تھا۔

لڑائی تیسرے ہفتے میں داخل ہوئی تو ہندوستانی باقاعدہ فوج کا بڑھیا نظم وضبط اور ہوائی طاقت کے فوائد کا بہت بڑا اثر ہوا اور چھاپہ مار بتدریج وادی میں پیچھے دھکیلے جانے لگے ۸ نومبر تک سرینگر کو خطرہ نہ رہا اور چھاپہ مار بارہ مولہ کی اہم چوکی سے بھی نکال دیئے گئے، جہاں اپنے پہلے قبائلی حملے میں انہوں نے ایک ریٹائرڈ انگریز

کرنل اس کی بیوی اور مقامی کانونٹ کی ایک راہبہ کو موت کے گھاٹ
اتار دیا تھا۔

جب پہلے آنیوالے پسپا ہو رہے تھے تو مزید قبائلی ریاست
میں داخل ہو رہے تھے۔ نومبر کے پہلے ہفتے تک ۱۰ ہزار سے زیادہ قبائلی
وادی بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ پاکستانی فوج کے رخصتی افسر بھی ان
سے آملے تھے اور اتفاقی طور پر ایک امریکی فوجی سارجنٹ بھی آملا
تھا جو اپنی آمد کے چند ہفتوں بعد اس علاقے سے نکالے جانے سے
پہلے "بریگیڈیر" بن چکا تھا۔ چھاپہ ماروں نے چھوٹی اور ہلکی توپیں
قبضائیں اور انہیں استعمال میں لائے تھے، کہا جاتا تھا کہ مزید بھاری
ہتھیار انہیں پاکستانی فوجی سرد خانوں سے پہنچتے رہتے تھے۔
ہندوستان نے اپنے تمام دستیاب ہوائی جہاز کشمیر میں فوجیں
اتارنے کے لئے وقف کر دیئے تھے کیونکہ سردی میں کوئی قابلِ عمل زمینی
راستہ موجود نہ تھا۔ وسط نومبر تک ایک بریگیڈ سے زیادہ فوج اتاری
جا چکی تھی۔ جب وسط سرما میں لڑائی سست پڑ گئی تو وادی
کافی حد تک قبائلیوں سے خالی ہو چکی تھی، لیکن جموں کے علاقے پر
ایک خوفناک جنگ بھڑک اٹھی جب پانچ چھ ہزار قبائلیوں نے
جھنگر سے ہندوستانی فوجیوں کو نکال باہر کیا۔ وہ ۶ جنوری ۱۹۴۸ء
کو نوشہرہ پر حملہ آور ہوئے لیکن بھاری ہوائی قوت کی مدد سے
پسپا کر دیئے گئے۔ پورے جنوری اور فروری میں شہر جموں جو ہندوستان

اور کشمیر کے درمیان واحد بری راستے پر ایستادہ ہے قبضے کے فوری

خطرے میں رہا۔ ۲۱ر فروری کو چترال سے چھاپہ ماروں کا ایک گروہ

جو گزشتہ نومبر میں گلگت میں نفوذ کر گیا تھا وسط قراقرم میں ۱۲ر

ہزار فٹ اونچا درہ برزیل عبور کر کے بلتستان کے دارالحکومت

سکردو پر کچھ بعد دیگرے حملے کرنے لگا جو وادی میں آنے والے شمالی

راستے کے سرے پر واقع ہے۔

موسم بہار کے آتے ہی ہندوستانی فوج نے میجر جنرل

تھمیا (بعد ازاں کوریا شہرت کا) کے تحت اپنا بھرپور حملہ شروع

کیا تاکہ سڑکیں کھول جا سکیں اور بیرون وادی علاقوں کو صاف

کیا جا سکے جہاں پچھلے سال رسائی نہ ہو سکی تھی۔ اس کے جواب میں

پاکستانی فوج کے باقاعدہ سپاہی ریاست میں داخل ہو گئے اور

اکثر قبائلی واپس چلے گئے۔ وسط اپریل تک صرف چند ہزار رہ

گئے گو بعض آخر تک لڑائی میں شریک رہے جب یکم جنوری

۱۹۴۹ء کو مجلس اقوام متحدہ کی زیر نگرانی جنگ بندی کی گئی۔

جہاد کشمیر میں شریک ہونیوالے قبائیلوں کی کل تعداد کا صحیح

اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ لڑائی کے سال کے دوران غالباً ان کے

کئی کئی ہزار آدمی ایک یا دوسرے وقت وہاں موجود رہے۔ وادی

میں ابتدائی ریل پیل قریب قریب خالصتاً پٹھانوں کی ہی آوردہ

تھی۔ جموں کی لڑائی میں قبائلی غالباً وحشت میں ہوں تو ہوں لیکن

تعداد میں مقامی کشمیریوں (بالخصوص پونچھیوں) سے زیادہ نہ تھے جن کی بغاوت کی حمایت کے لئے وہ میدان میں اترے تھے۔ پاکستان کے تمام اور افغانستان کے اکثر بڑے بڑے قبائل نے کشمیر میں اپنی اپنی ٹولیاں بھیجی تھیں۔

اگرچہ کشمیر کا بڑا معرکہ وادی میں ہوا پھر بھی چھاپہ مار ریاست کے ہر حصہ میں پہنچے۔ سرینگر درہ خیبر کے دروازے پر واقع قلعہ جمرود سے ۲۹۰ میل ہے۔ یہ فاصلہ وزیرستان کے وسط میں واقع رزمک سے قریباً اس سے دوگنا ہے۔ سکردو اور لداخ سرینگر سے ۱۵۰ میل مزید دور اور کرۂ ارض کے بعض بلند ترین پہاڑوں پر ہیں۔ پٹھانوں کے جنگی نعرے ان سب مقامات پر سُنے گئے، چھاپہ ماروں نے لداخ کی دور افتادہ وادی میں قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ وہاں کی ایک اہم ترین بدھ خانقاہ کے سرِ لاماکو مار دیا اور چین کے ساتھ کاروانی تجارت کا راستہ بند کر دیا،

یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ سب قبائل اپنی سرگرمیاں شروع کرنے کے لئے کشمیر کی سرحد پار کرنے کا انتظار نہ کرسکے اور پنجاب کے شمالی اضلاع نے ان کی آمد ورفت سے بہت نقصان اٹھایا۔ کشمیر سے واپسی پر ایک چھاپہ مار گروہ نے ضلع گجرات سے گزرتے ہوئے ۱۳/ جنوری ۱۹۴۸ء کو ایک غیر مسلم پناہ گزین ٹرین پر حملہ کیا اور پاکستانی فوجی یونٹوں نے چھ گھنٹے جم کر لڑائی کے بعد

ہی انہیں پسپا ہونے پر مجبور کیا۔

ہندوستانی الزام کہ حکومت پاکستان نے قبائلی حملے کی حوصلہ افزائی اور چشم پوشی کی نہ صحیح ثابت ہو سکا نہ غلط۔ سابقہ برطانوی ہندوستانی فوج کے مسلم افسروں نے یقیناً چھاپہ مار ٹولیوں کی قیادت کی۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے ارکان جیسے میجر خورشید انور نے جو مظفرآباد پر ابتدائی حملے کے دوران موجود تھا، چھاپے بھی مارے لیکن ان میں اکثر افسروں نے کمان سنبھالی بلکہ زیادہ صحیح طور پر وہ قبائلی لشکروں کے ساتھی بن گئے جب آخر الذکر پہلے ہی کشمیر میں پہنچ چکے تھے یا وہ کشمیر کے لئے رواں دواں تھے۔

۱۹۴۸ء کے موسم بہار میں پاکستانی فوج کے میدان میں آنے سے بہت پہلے بھاری آلات زیر استعمال تھے۔ جو عموماً قبائلیوں کے اسلحہ خانوں میں شامل نہ تھے۔ چھاپہ ماروں کی گاڑیوں کو صوبہ سرحد کے سرکاری ذخیروں سے گیسولین کی باقاعدہ فراہمی ہوتی تھی صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ قیوم نے جنوری ۱۹۴۸ء میں چھاپہ ماروں کی حوصلہ افزائی کا اعتراف کیا گو وزیراعظم لیاقت نے تمام ذرائع کے مطابق کٹر قانون پسند گورنر جنرل قائداعظم کے سخت احکامات کے مطابق حملے کو نہایت مخلصانہ طور پر روکنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ حملے کی

ترغیب و تشویق خود قبائلیوں کے اندر سے پیدا ہوئی۔ گو کبھی کبھار
بے معنی تباہی اور لوٹ مار بھی ہوئی تاہم وہ ایک پر خلوص جذبۂ
جہاد کے تحت ہی حرکت میں آئے تھے۔ نو بیس جھگڑے اور دیرینہ
بین القبائلی دشمنیاں عارضی طور پر بالائے طاق رکھ دی گئیں۔ بہت
سے مبصرین کا خیال تھا کہ جہاں تک چھاپہ ماروں پر کسی کنٹرول
کا تعلق تھا ملوک کی بجائے پیر اور ملانہ یادہ با اثر تھے۔ تمام حصہ
گیر قبائل آج بھی اپنے تجربات کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔
ایک ملک نے ۱۹۵۴ء میں اپنا تجربہ یوں بیان کیا۔ "یہ میری
زندگی کا بہترین دور تھا۔ ہم رائفل بدوش گاتے ہوئے گئے،
کوئی چیز ہمارے سامنے نہ ٹھہر سکی"۔

۱۹۴۸ء سے قبائل مسلسل مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ انہیں
کشمیر واپس جانے دیا جائے۔ بعض اوقات یہ مطالبہ بلا شک و
شبہ پاکستانی اہلکاروں کے اشارے پر نہایت مفتہم انداز میں
بیرونی اصحاب کے سامنے پیش کیا گیا لیکن اکثر و بیشتر یہ مطالبہ
از خود کیا گیا۔ اس مطالبے کا اہم ترین محرک نہایت سادہ لیکن
کلاسیک ہے یعنی بدل یا فرض انتقام۔ بہت سے قبائل کے افراد
کشمیر کے میدان جنگ میں کام آئے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ جنگ
نہ جیت سکے اور واپس جا کر اپنی عزت پر لگے ہوئے اس داغ
کو دھونے کا جذبہ ان کے اندر بہت مضبوط ہے اور یوں ہمارے

دَور کا ایک دھماکہ خیز ترین بین الاقوامی واقعہ اسلامی جہاد کے تنگ تصور سے رونما ہوا جس کی اب بھی پٹھان عزت کے تنگ تر تقاضے کے تحت تجدید ہو سکتی ہے۔

---

(۱۵) باب پانزدہم

پاکستان؛ مسائل اور ترقی

تعارف :-

شمال مغربی سرحدی صوبہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا حصہ بنا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو یہ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے ون یونٹ، صوبہ میں مدغم ہوا۔ اس طرح یہ قریباً آٹھ سال تک پاکستان کی ایک آزاد سیاسی اکائی بنا رہا۔ یہ باب زیادہ تر اسی دور سے متعلق ہے۔ ان میں سے پہلے پانچ سالوں میں صوبہ سرحد کے معاملات کے مدار المہام مسلم لیگی لیڈر خان عبدالقیوم خان ہی رہے جو ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو وزیر اعلیٰ بنے تھے۔ قیوم اس صوبے میں استحکام دار تقاء کا ایک ایسا دور لائے جو اس کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے

۱۹۴۵ء تک قیوم کانگرس پارٹی کا ممبر تھا۔ وہ دہلی کی مرکزی اسمبلی میں عین اس وقت کانگرس کا ڈپٹی لیڈر رہا

جب لیاقت علی خان جو بعد میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بنے، مسلم لیگ کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ ایک کتاب شائع کرنے کے تھوڑا عرصہ بعد ہی جو کانگرس کے اغراض و مقاصد کی قصیدہ خواں تھی اور جو عبدالغفار خان کے نام منسوب کی گئی تھی[۸] قیوم نے اگست ۱۹۴۵ء میں کانگرس چھوڑ دی اور نظریہ پاکستان کی حمایت شروع کر دی جسے مسلم لیگ آگے بڑھا رہی تھی۔ وہ اس وقت سرحد کی چھوٹی سی بے اثر لیگ میں شامل ہوا۔ سرحد لیگ کو پھیلانے اور خان صاحب کی حکومت کا تختہ الٹنے کی تحریک میں اس کا کردار پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے۔

آزادی کے پہلے چھ ماہ تک قیوم نے بلا شرکت غیرے صوبہ پر حکومت کی۔ اس نے اپنی کابینہ میں قانون ساز اسمبلی کا صرف ایک اور ممبر شامل کیا جس میں بٹوارے کے بعد غیر مسلم ارکان کے انخلاء کے نتیجہ میں کل ارکان پچاس کی بجائے انتالیس رہ گئے تھے۔ اسمبلی ممبران کی وفاداری بالکل یقینی نہیں تھی اور کچھ عرصے کے لئے ایسا لگتا تھا کہ غفار خان کے "پختونستان" کی حمایت میں ایک قرارداد پاس ہو جائے گی لیکن ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء

---

[۸] - عبدالقیوم "گولڈ اینڈ گنز، آن دی پٹھان فرنٹیئر" (بمبئی ہند کتاب ۱۹۴۵ء)

تک جب اسمبلی نے پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھایا قیوم نے سول اور پولیس کے محکموں کے مؤثر استعمال اور اسمبلی ارکان کے ساتھ غیر معمولی طور پر کامیاب سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعے صوبے میں اپنا دبدبہ قائم کر لیا تھا۔ اس کی فتح اس وقت یقینی ہو گئی جب غفار خان کا ایک سابقہ نائب میاں جعفر شاہ اپریل میں مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔

جولائی ۱۹۴۸ء میں خدائی خدمت گاروں پر عائد شدہ پابندی نے واحد باقی ماندہ چیلنج کو ختم کر دیا جو امکانی طور پر قیوم کے اختیارات کے خلاف گھمبیر ہو سکتا تھا اور توسیع شدہ لیگ کی تنظیم کے قریباً تمام عناصر نے قیوم کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ صرف لیگ کے سابق صدر پیر صاحب مانکی شریف الگ رہے۔ پیر صاحب اسلامی مملکت کا پروگرام منوانے میں ناکام ہو کر حزب اختلاف میں چلے گئے اور بالآخر ایچ۔ ایس سہروردی کی جناح عوامی لیگ کی سرحد برانچ کے صدر ہو گئے۔ جو اس وقت قومی حزب اختلاف تھی۔

قیوم کے جارحانہ اور بعض اوقات یکطرفہ طریقوں کی وجہ سے کبھی کبھی اس کی مرکزی حکومت سے بھی ٹکر ہوئی اور مقامی لیگی لیڈروں سے بھی۔ اس نے قائداعظم کی خواہشات کے خلاف ۱۹۴۷ء کی سردی میں کشمیر میں جانے والے قبائلی لشکر کی حوصلہ افزائی بلکہ پشت پناہی بھی کی۔ اس نے فوراً ہی قبائلی علاقے کے بہتر ترقی یافتہ حصول

پر صوبے میں انضمام کے لئے زور ڈالنا شروع کر دیا۔ اس نے مرکزی حکومت کی منظوری سے پہلے ہی ترقیاتی سکیموں پر عملدرآمد کرانا شروع کر دیا۔ اس نے سابقہ خدمات کا لحاظ کئے بغیر لیگ کی تنظیم میں سے غیر دوستانہ سیاستدانوں کو نکال باہر کیا۔ اس نے مخالف جماعتوں کو دبانے کے لئے ایف سی آر کے تحت انتہائی اختیارات اور انگریزوں کے چھوڑے ہوئے خصوصی قانونی ہتھکنڈے استعمال کئے۔

۱۹۵۱ء کے انتخابات:۔

قیوم اپنی مقبولیت اور حاکمیت پر اتنا پُر اعتماد تھا کہ وہ جلد از جلد انتخابات کا منتظر رہا۔ یہ ۲۶ر نومبر اور ۱۲ر دسمبر ۱۹۵۱ء کے درمیان ہوئے اور پاکستان میں ہونے والے پہلے انتخابات تھے۔ اسمبلی کی نشستیں بڑھا کر پچاسی کر دی گئیں اور نمائندوں کا انتخاب بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ بیاسی نشستیں مسلمانوں کے علاقائی حلقہ ہائے نمائندگی کے لئے تھیں، ۲ نشستیں مسلمان خواتین کے لئے مخصوص تھیں اور ایک غیر مسلم نمائندگی کے لئے۔ ایک مصمم (گو ہمیشہ کامیاب نہیں) کوشش کی گئی کہ حلقہ ہائے نمائندگی کی حد بندی خالص جغرافیائی بنیادوں پر کی جائے تاکہ اقتصادی یا رشتہ داری کی بناء پر مقامی معتبرین کا روایتی اثر و رسوخ کم کیا جا سکے۔ مقابلے کے لئے فہرست رائے دہندگان

میں ۷۴،۱۶،۵۱ ووٹر تھے جبکہ صوبے کی کل آبادی کا اندازہ ۵۴،۲۷،۲۶۵ تھا۔[1]

نو امیدوار جو سب مسلم لیگی تھے بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ باقی چھہتر حلقوں میں ۶، لاکھ ۰۶، ہزار رائے دہندگان نے جو اہل استحقاق کا انچاس فیصد تھے اپنا حق استعمال کیا۔ قیوم انتخابات میں ایک زبردست فاتح بن کر ابھرا۔ اکثر حلقوں میں اس کے امیدوار جیتے اور مخالف لیگی گروہ جو ابراہیم خان جھگڑا اور قومی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری یوسف خٹک کے تحت تھے دب گئے۔ اسمبلی کا اجلاس ہوا تو قیوم پچاسی میں سے تاسٹھ نشستوں مشمولہ یہ دو نشستیں مخصوص برائے خواتین پر حاوی تھا۔[2] تیرہ نشستوں پر آزاد امیدوار کامیاب ہوئے اور حزب مخالف جناح عوامی لیگ چار

---

[1] - این ڈبلیو ایف پی (پاکستان) انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ "دی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر پراونس ایئر بک" ۱۹۵۳ء (پشاور گورنمنٹ پریس، ۱۹۵۳ء) ص ۲۷

[2] - اسمبلی کے لئے منتخب شدہ دونوں خواتین کا پس منظر پٹھان مستورات کے مخصوص کردار پر دلچسپ ضمنی روشنی ڈالتا ہے دونوں خواتین قریباً تیس سالہ تھیں لیکن دونوں سالہا سال سے مسلم لیگی معاملات میں پیش پیش رہی تھیں مشمولہ یہ تحریک سول نافرمانی، دونوں پردے کی سخت پابند تھیں اور اسمبلی کے کاروبار میں بہت کم حصہ لیتی تھیں۔ دونوں پشتو، فارسی اور اردو روانی سے بولتی تھیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نشستیں لے گئی تھی۔

اسمبلی میں بڑی اکثریت اور سیکرٹریوں اور محکمانہ سربراہوں کے ایک معمولی طور پہ کارگزار دستے کے ساتھ قیوم نے اگلے ڈیڑھ سال میں ایک جامع قانونی اور ترقیاتی پروگرام کو عملی جامہ پہنا دیا۔

اپریل ۱۹۵۳ء میں اس نے بادل ناخواستہ سرحد کی وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دیا تاکہ محمد علی کی مرکزی کابینہ میں شامل ہو سکے جس نے خواجہ ناظم الدین کی جگہ لی تھی جو لیاقت علی خان کی جگہ پاکستان کا وزیر اعظم بن گیا تھا۔ سرحد میں قیوم کا جانشین سردار عبدالرشید خان بنا جو اس وقت تک صوبائی آئی جی پولیس تھا۔ رشید نے قیوم کی قائم کردہ ہموار رفتار ترقی کو جاری رکھا حتیٰ کہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو صوبہ سرحد ون یونٹ مغربی پاکستان میں ضم ہو گیا۔

قیوم اور شمالی صوبہ جات

صوبہ سرحد نے فقدانِ وسائل کے باوجود دیگر پاکستانی صوبوں کے مقابلے پہ آزادی کے بعد کے سالوں میں زیادہ تیزی سے ترقی کی۔

(بقیہ حاشیہ)

ایک نے اپنے شوہر کے ساتھ کشمیر جہاد میں بھی حصہ لیا تھا۔ دیکھئے این ڈبلیو ایف پی (پاکستان) انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ ''گائیڈ ٹو دی این ڈبلیو ایف پی اسمبلی'' (لاہور پاکستان پرنٹنگ ورکس ۱۹۵۲ء) ص ص ۲، ۷ اور ۱۰۰

اس ترقی کا سہرا زیادہ تر قیوم کے سر ہے جو سیاسی میدان میں جمہوری طریقوں کے عدم لحاظ کے باوجود اپنے علاقہ کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے احساس ذمہ داری کا سراپا مجسمہ تھا۔

قبائلی تعلقات کے بغیر ایک "غریب لڑکا"[1] ایک ایسے علاقے میں جہاں اہم ترین معاملات کا فیصلہ موروثی زمینداروں کے ایک چھوٹے سے گروہ یا قائم و دوائم سرکاری خاندانوں پر منحصر تھا۔ قیوم بظاہر ابتداء میں خدائی خدمت گاروں اور کانگرس کی طرف خان برادران کی سماجی و اقتصادی اصلاحات کی تبلیغ کی وجہ سے مائل ہوئے۔ کانگرس سے اس کی حیرت انگیز علیحدگی کا اصلی محرک کبھی واضح نہیں ہو سکا۔ اس کے ناقدین ذاتی اقتدار خواہی کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ خان برادران قیادت میں کسی کو شریک نہ کرنے والے تھے لیکن اس وقت مسلم لیگ میں بھی ذاتی کامیابی کے امکانات بھی مبہم ہی تھے۔ ممکن ہے وہ کانگرس کی سرگرمی میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت پر مضطرب ہوا ہو لیکن اس میں مذہبی جنون کے آثار نہ تھے اور وہ سماجی و سیاسی زندگی

---

[1] - قیوم ۱۹۰۱ء میں چترال میں پیدا ہوا۔ وہ ایک سرکاری اہلکار کا بیٹا تھا۔ گو وہ پشاور میں پلا بڑھا اور پروان چڑھا تاہم اس کے سیاسی حریف خاندانی ماخذ کی وجہ سے اسے ہمیشہ کشمیری ہی کہتے رہے۔

میں ملاؤں کے منفی کردار کا سخت نقاد تھا۔ اغلب ترین وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ بھی ایک علیحدہ ملک کی تخلیق اور پاکستان کے لیے ایک پُراسرار اور خوشگفتہ محبت میں گرفتار ہو گیا تھا جس نے اس وقت کے ہندوستان کے بہت سے دیگر مسلمان رہنماؤں کو بھی اپنا اسیر بنا لیا تھا۔

بہرکیف جب وہ لیگ میں شامل ہُوا تو اس نے اس کے قدامت پسند اقتصادی فلسفے کو قبول نہیں کیا جو اس پر حاوی تھا صوبے میں اپنی طاقت مستحکم کر کے اس نے قدامت پسند عناصر پر کم سے کم انحصار کیا اور وہ ان سے قطعاً لاتعلق ہو گیا جب اس نے ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں یوسف خٹک ابراہیم جھگڑا اتحاد کو مغلوب کر لیا۔ عجیب بات ہے کہ جب اس کا بدترین سیاسی حریف عبدالغفار خان اس کے ہاتھوں جیل کی سلاخوں میں بند تھا، وہ نہایت تندہی سے ایک ایسے اصلاحاتی پروگرام کو نافذ کر رہا تھا جس میں بہت سے ایسے منصوبے شامل تھے۔ جو پرانے خدائی خدمتگار لائحہ عمل میں پیش کیے جا چکے تھے۔

اقتصادی ترقّی :-

صوبہ سرحد کا بجٹ انگریزی دور کی طرح پاکستان کے تحت بھی خسارے کا بجٹ ہی رہا لیکن جیسے جیسے صوبائی حکومت کی سرگرمیاں

بڑھتی گئیں یہ بھی تیزی سے پھیلتا گیا۔ اخراجات ۱۹۴۶-۴۷ء کے
۳,۴۹,۹۳,۰۰۰ روپے سے بڑھ کر ۱۹۵۵-۵۶ء میں ۴,۴۸,۲۰,۰۰۰
روپے ہوگئے۔ بجٹ ریونیو سے باقاعدہ اخراجات کے علاوہ ایک کیپٹل
اخراجات کا بجٹ بھی عمل میں لایا گیا جس کی پشت پناہی پبلک
اور مرکزی حکومت کے قرضوں نے کی۔ یہ صوبے کے ترقیاتی بجٹ
کے مترادف ہے ۱۹۵۵-۵۶ء تک کیپٹل اخراجات کا اندازہ
۲,۵۵,۸۵,۰۰۰ روپے تھا۔ صوبے کی ترقیاتی ترجیحات اس رقم
میں منعکس تھیں مشمولہ یہ

آبپاشی	۱,۵۹,۶۴,۰۰۰ روپے
زیادہ اناج اگاؤ	۵۱,۳۷,۰۰۰ روپے
بجلی	۱,۰۰,۵۵,۰۰۰ روپے
صنعتی ترقی	۷,۰۰,۰۰۰ روپے

۱- صوبہ سرحد کے بجٹ! ۱۹۵۱-۵۲ء تا ۱۹۵۵-۵۶ء

سال	ریونیو	اخراجات	بقایا
۱۹۵۱-۵۲ء	۴,۷۷,۰۰,۰۰۰ روپے	۴,۹۳,۶۰,۰۰۰ روپے	۱۶,۶۰,۰۰۰ روپے
۱۹۵۲-۵۳ء	۵,۳۰,۷۰,۰۰۰ روپے	۵,۷۱,۰۵,۰۰۰ "	۲,۰۲,۰۰۰ "
۱۹۵۳-۵۴ء	۵,۷۷,۰۸,۰۰۰ "	۶,۲۱,۸۶,۰۰۰ "	۴۴,۷۸,۰۰۰
۱۹۵۵-۵۶	۷,۱۹,۹۸,۰۰۰	۷,۴۴,۸۲,۰۰۰	۲۴,۸۴,۰۰۰

سڑکیں اور ٹرانسپورٹ ۵,۰۰,۰۰۰ روپے [1]

زراعت:

صوبہ سرحد کے قریباً پچھتر فیصدی باشندے اپنی گزراوقات کے لئے بالواسطہ یا بلاواسطہ زراعت پر منحصر ہیں۔ اس کے باوجود صوبے کو سالانہ قریباً ۵ ہزار ٹن اناج کا خسارہ ہوتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قبائلی علاقہ میں پیداوار انتہائی کم ہوتی ہے۔ اس خسارے کو کم کرنے کے لئے افزائشی اقدامات کئے گئے ہیں جیسے کناروں کی زمینوں کو زیر کاشت لانا اور بہتر بیجوں، آلات، کھاد اور زمین بندی توڑ طریقوں کے ذریعے موجودہ زمینوں کی پیداوار بڑھانا اور آبادی میں مسلسل اضافہ اور اس کے نتیجہ میں بڑھتی ہوئی غذائی کھپت فی کس نیز وقتاً فوقتاً خشک سالیوں اور سیلابوں نے سالانہ خسارے کو جوں کا توں رکھا ہے۔ پھل کی پیداوار میں بالخصوص قابل ذکر پیش رفت ہوئی ہے اور باغیچوں کا رقبہ ۱۹۴۸ء کے ۱۸ ہزار ایکڑ سے بڑھ کر ۱۹۵۵ء میں ۳۶ ہزار ایکڑ ہو گیا [2] ایک وسیع دیہی ترقیاتی پروگرام موسومہ بہ ویلیج ایڈ (زرعی و صنعتی

---

[1] - این ڈبلیو ایف پی ایئر بک ۱۹۵۵ء ص ۵۸

[2] این ڈبلیو ایف پی ایئر بک ۱۹۵۵ء ص ۸۵

ترقی) صوبے میں سرگرم ہے جس کی کفالت امریکی فارن آپریشنز ایڈمنسٹریشن، فورڈ فاؤنڈیشن اور پاکستانی حکومت کر رہی ہیں۔ ایک بڑا تربیتی مرکز پشاور میں مکمل کیا گیا ہے جو سرحدی فن تعمیر کے روایتی خطوط اور مغربی پبلک بلڈنگ کے افادی نمونے کا امتزاج ہے۔ ویلیج ایڈ پروگرام ممبر دیہات کی کمیٹیوں کے توسط سے سماجی و اقتصادی مسائل کے ملغوبہ پر حملہ کرنے میں خاصا کامیاب رہا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل شامل ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مقدموں کا بلا مقدمہ بازی فیصلہ، شادیوں پر اخراجات کم کرنے کی تلقین، سائنسی کھاد اور بڑھیا بیجوں کا استعمال۔ گندم اور مکئی کی قطار وار بجائی، مرکب کھاد کے گڑھوں کی کھدائی، نالیوں کی تعمیر نو، ٹیکہ لگوائی مہم، ملیریا کے خلاف مہم، دیہات کے درمیان مواصلات کی بہتری اور بنجر زمینوں کی بحالی۔

ان سب کے عقب میں زمینی اصلاحات کا ایک جامع گو معتدلانہ پروگرام تھا جو قیوم نے شروع کیا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں بہت سی جاگیرات یا حقوق مالیہ (بعض حالتوں میں ٹیکس معافی) جو قدیم سیاسی یا مذہبی خدمات کے بدلے حاصل کی گئی تھیں منسوخ کر دی گئیں۔

۱۹۵۰ء کے سرحد کے قانون مزارعت تلے نہ صرف

کاشتکار اور غیر کاشتکار طبقوں کے درمیان دیرینہ رواجی امتیازات کو ختم کر دیا بلکہ قابض مزارعین کو اختیار دیا کہ وہ اپنے زمینداروں کو معقول معاوضہ دیکر اپنی پوری یا جزوی زیرِ کاشت زمین کی ملکیت حاصل کر سکتے تھے۔ اس قانون نے خدمات اور خصوصی ڈیوٹیوں مشمولہ بہ بیگار کو بھی ختم کر دیا جو زمیندار روایتاً پیداوار کے مقررہ حصہ کے علاوہ غیر پابند مزارعین سے وصول کرنے کے مجاز تھے۔ ایک اور قانون کے ذریعے جو اسی کے ساتھ ہی پاس کیا گیا ۱۹۲۰ء سے پہلے کے رہن نامے منسوخ کر دیئے گئے۔ اگلے سال ایک ضمنی قانون منظور کیا گیا جس کے تحت ۱۹۵۱ء کے قانون مزارعت پر عملدرآمد سے پہلے زمینداروں کے نکالے ہوئے مزارعین کی بحالی مقصود تھی۔

۱۹۵۵ء تک ۵٫۱۲۱ ایکڑ زمین جو بڑے زمینداروں کے نام تھی ۲۶۸۶۴ چھوٹے مالکوں کو دے دی گئی جو پہلے صرف قابض مزارعین دکھائے جاتے تھے۔ یہ انتقال بلا معاوضہ تھا کیونکہ مزارعین کا زمینداروں کو روایتی محصول حکومت کو واجب الادا مالیہ اور دیگر ٹیکسوں کی رقم تک محدود تھا۔

مزید ۴ ۱۸٫۱۸ ایکڑ ۲ لاکھ سے زیادہ علیحدہ قابض مزارعین کو معاوضے کے بدلے بذریعہ دستاویز منتقل کر دیئے گئے جس میں کل تقسیم شدہ زمین کا قریباً پچھتر فیصدی حصہ مزارعین کو بطور ملکیت

مل گیا۔

قابض مزارعین جنہوں نے (الف) معاوضہ کی ادائیگی کی پابندی کے بغیر زمینیں لیں (ب) معاوضے کے بغیر زمینیں لیں اور (ج) اپنے زمینداروں کے ساتھ زمینیں تقسیم کیں (بعض حالتوں میں بلا معاوضہ اور بعض میں با معاوضہ) کے درمیان تمیز کرنا انتہائی مشکل ہے کیونکہ روایتی قانون کے تحت بہت سے مختلف قسموں کے مراعات اور مزارعتی حقوق تسلیم کئے جاتے تھے لیکن زمینی اصلاح کسی حالت میں بھی ضبطی نہیں تھی۔ بلا معاوضہ حالتوں میں زمیندار زمینوں سے منافع کا حق ہمیشہ سے یا دیر سے چھوڑ چکے تھے۔ بہت سی حالتوں میں زمیندار محض مالیہ دیتا تھا اسے قابض مزارعین سے وصول کرنے کے بعد جو کسی قبائلی یا سماجی مجبوری کی وجہ سے کسی وقت زمین کی رسمی ملکیت سے نااہل قرار دیئے گئے تھے۔

۱۹۵۸ء کے اوائل تک زمینی اصلاحاتی پروگرام قریباً بند ہو گیا کیونکہ بڑے زمیندار مختصر المیعاد ری پبلکن پارٹی کے ذریعے دوبارہ سر اٹھا چکے تھے جو مغربی پاکستان اسمبلی پر حاوی ہو گئی تھی۔ لیکن سیاسی حالات نے پھر پلٹا کھایا اور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں شروع ہونیوالے دورِ ایوبی نے قیوم کے شروع کردہ زمینی اصلاحاتی پروگرام کو نہایت عجلت اور احسن طریقے سے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

آبپاشی :-

زیادہ اناج اُگاؤ مہم میں آبپاشی کی سہولیات میں توسیع کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے لفٹ اور ٹیوب ویل کے منصوبے پی ڈبلیو ڈی نے تعمیر کئے ہیں جو موجودہ وسیع نظام انہار کی دیکھ بھال کا بھی ذمہ دار ہے۔ زیر تعمیر منصوبوں میں اہم ترین وارسک اور کُرم گڑھی کی سکیمیں ہیں۔

وارسک اس مقام پر واقع ہے جہاں دریائے کابل میدان پشاور میں داخل ہوتا ہے۔ اسے کولمبو پلان کے تحت کینیڈین انجینیئروں کی نگرانی میں تعمیر کیا جارہا ہے۔ کافی توانائی پیدا کرنے کے علاوہ یہ ایک لاکھ ایکڑ سے زیادہ نئی زرعی زمین کو زیر کاشت لے آئے گا جب بند اور نہروں کا بڑا نظام مکمل ہو جائے گا۔ بنّوں کے قریب کرم گڑھی منصوبہ ایک بہت بڑے ذخیرۂ آب کو جمع کر سکے گا جو مٹی سے بھرے ہوئے ڈیم کے عقب میں گرمائی سیلابوں کا ثمرہ ہوگا۔ یہ قریب التکمیل منصوبہ قریباً دو لاکھ ایکڑ زرعی زمین کو سیراب کرے گا اور توانائی کی خاصی مقدار بھی مہیا کرے گا۔

صنعت :- ۱۹۴۷ء سے پہلے کے قریباً ٹھیٹھ زرعی علاقہ

ہیں۔ بجلی کی فراہمی کی مسلسل توسیع کی وجہ سے مختلف النوع ہلکی پھلکی صنعتوں کی ترقی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں کل انسٹالڈ صلاحیت ابھی تک ۵۰ ہزار کلوواٹ سے کم تھی لیکن یہ ۱۹۴۷ء سے پھر بھی نمایاں طور پر زیادہ تھی جب یہ بمشکل ۱۹ ہزار کلوواٹ سے کم تھی۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ بجلی صوبے کے قریباً تمام حصوں میں دستیاب ہو چکی ہے[1]۔ بجلی کی فراہمی وارسک ڈیم کے مکمل ہونے پر کافی بڑھ جائے گی کیونکہ اس سے قریباً دو لاکھ کلوواٹ کی توقع ہے۔ ۱۹۴۷ء میں صوبہ سرحد میں صرف دو اہم صنعتی پلانٹ تھے جو ۱۹۵۵ء تک تیس ہو گئے تھے۔ جن میں شوگر ملیں، کاٹن اور وول ٹیکسٹائل ملیں، فروٹ کیننگ فیکٹریاں، ایک کیمیکل ورکس سٹیل ری رولنگ ملیں، ایک فارماسوٹیکل فیکٹری اور تمباکو پراسیسنگ پلانٹ شامل ہیں۔ گھریلو دستکاری جو پورے ایشیا میں ایک پسندیدہ ترقیاتی ہدف ہے اتنی تیزی سے ترقی نہیں کر سکی حالانکہ صوبے میں ۱۰ ہزار سے زیادہ کھڈیاں ہیں جس میں وادی کاغان کی ایک چھوٹی سی لیکن اعلیٰ معیار کی اونی صنعت بھی شامل ہے۔

---

[1]- این ڈبلیو ایف پی ایر بک، ۱۹۵۵ء ص ۱۳۹

تعلیم :-

۱۹۴۷ء سے اکثر سالانہ میزانیوں میں تعلیم کو سب سے بڑا حصہ ملتا رہا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اس پر ہر سال پولیس اور امن وامان کے اخراجات سے لاکھوں روپیہ زیادہ خرچ ہوتا رہا۔ ۵۶ - ۱۹۵۵ء کے بجٹ میں تعلیم کو قریباً بیس فیصدی دیا گیا[1] نتیجہ یہ کہ دو سو زیادہ سکول کھولے گئے ہیں اور ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان سکولوں میں تعداد طلباء دوگنا ہو گئی۔ تعلیم چھٹی جماعت تک مفت کر دی گئی ہے۔ ہر ضلع میں نیا گورنمنٹ کالج کھولا گیا ہے اور پشاور ایبٹ آباد اور ڈیرہ اسماعیل خان کے تین زنانہ کالجوں میں توسیع کی گئی ہے۔ کُل کالجوں کی تعداد طلباء ۱۹۴۷ء میں ۲۱۰۰ سے بڑھ کر ۱۹۵۵ء میں ۲۸۲۹ ہو گئی[2]

غالباً عظیم ترین کارنامہ پشاور یونیورسٹی ہے جس کا بسیط کیمپس پشاور سے درہ خیبر کی سڑک پر ایستادہ ہے۔ یونیورسٹی قدر اعلیٰ

---

[1]- سکول کالج اور یونیورسٹی عمارات کی تعمیر کے اخراجات بھی اس میں شامل ہیں جو بجٹ کی تقسیم میں سول ورکس کے تحت دکھائے جاتے ہیں۔ دیکھئے این ڈبلیو ایف پی ایئر بک، ۱۹۵۵ء، ص ۵۹

[2]- ایضاً، ص ۶۴

قیوم کا من پسند منصوبہ تھی اور ۱۹۵۱ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء تک ۲۰۰ طلبا رکا ہوسٹل جو غالباً ایشیا میں بہترین ساز و سامان کا مالک ہے ایک مرعوب کن انتظامی عمارت اور ایک انجنیئرنگ کالج نے کام شروع کر دیا تھا۔ اس وقت سے قانون سائنس، میڈیسن، زرعت، فارسٹری، ٹیچر ٹریننگ اور آرٹس فیکلٹیاں بھی جاری کی جا چکی ہیں۔

میڈیسن اور صحت عامہ:۔

سرحدی علاقے میں کئی بہترین ہسپتال موجود ہیں لیکن ان میں سے اکثر فوجی ہیں اور دیہی آبادی کے اہم طبی مسائل ایک وسیع پروگرام کے ذریعے حل کئے جاتے ہیں جس میں چھوٹی چھوٹی مستقل اور متحرک ڈسپنسریاں، وزٹنگ نرسیں اور دائیاں اور سفری ایکسرے، ٹی بی اور ویکسی نیشن یونٹ شامل ہیں ۱۹۵۵ء میں ڈسپنسریوں اور آبادی میں ۲۱۰۰۰:۱ کا تناسب تھا۔ یہ مغربی معیارات کے مطابق ناکافی سہی لیکن ایک دور افتادہ اور اقتصادی طور پر بد حال علاقے میں یہ ایک خاصا کارنامہ ہے۔

نوزائیدگان کی بیماری اور اموات کے سوا موجود مسئلے کے علاوہ علاقے میں صحت کے لئے بڑا خطرہ ملیریا ہے۔ یہ بیماری آبپاشی کے علاقوں میں بہت عام ہے باوجودیکہ مچھروں پر قابو پا

کہ اس بیخ کنی کی کوششیں کی گئی ہیں[1] ملیریے کی وباء ہر ضلع اور ایجنسی میں موجود ہے۔ گو کوہاٹ ہانگو وادی کے ایک آزمائشی علاقے میں جہاں مسئلہ ۱۹۴۹ء سے بھرپور سالانہ توجہ کے تحت ہے، اب نئے مریض نہیں آ رہے۔

ٹائی فس بھی ایک بڑا مسئلہ ہے بالخصوص ان علاقوں میں جہاں سے خانہ بدوش اور اکثر جوں زدہ پوئندے اور ان کے جانور باقاعدگی سے گزرتے ہیں۔ نمونیا اور ٹی بی جو اکثر و بیشتر ملیریا کی وجہ سے کاہیدہ قوت مزاحمت سے پیدا ہوتے ہیں صوبے میں قریباً ۲۵ ر فیصدی اموات کے ذمہ دار ہیں۔

قبائلی علاقہ پاکستان کے تحت:۔

قبائلی علاقے کو پاکستان کے تحت بھی وہی خصوصی مقام حاصل رہا جو انگریزوں نے اسے دیا تھا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد حکومت اور اہلِ کوہ کے درمیان ایک نئے تعلق کا ظہور ممکن ہوا۔ اگر پاکستان قبائل پر زیادہ مہربان تھا تو قبائل بھی پاکستان

---

[1]۔ یہ کوششیں ہنوز بے حد ناکافی ہیں ۵۶-۱۹۵۵ء میں انسداد ملیریا پروگرام کو صرف ۹۱،۵۸۶ روپے ملے۔ دیکھئے این ڈبلیو ایف پی ایئر بک ۱۹۵۵ء ص ۷۶

سے تعاون کرنے پر زیادہ مائل تھے۔ قبائلی علاقہ براہ راست مرکزی حکومت کے تحت رہا لیکن صوبہ سرحد کی حکومت پٹھانوں کی حکومت ہونے کی وجہ سے قبائل پر اثر اندازی کا ایک اہم ذریعہ بن گئی۔ قبائلی علاقے میں پاکستان کا قومی قانون نافذ نہیں ہے۔ باشندے عام ٹیکس ادا نہیں کرتے گو وہ نمک جیسی اشیائے صرف پر بالواسطہ عوائد کے ماتحت ہیں تاہم قبائلی علاقہ پر حکومتی اخراجات مسلسل بڑھتے رہے ہیں۔ مثلاً ۱۹۵۲ء میں پورے پاکستان میں سول نظم و نسق پر کل خرچ ۱۹۵,۲۶۵... روپے تھا جس میں سے ۵,۸۲,۶۵... روپے یعنی قریباً ایک تہائی صرف قبائلی علاقے پر خرچ ہوا۔ اس رقم کا بیشتر حصہ[1] ان انتظامی اور فلاحی اداروں پر صرف ہوا جنہیں پاکستان روایتی برطانوی وظائف کی بجائے ایک نعم البدل کے طور پر قائم کر رہا ہے۔

۱۹۴۷ء میں قبائلی علاقے کا تعلیمی بجٹ ۱۷ ہزار روپے تھا اور کوئی ۱۵۰۰ بچے سکولوں میں تھے۔ ۱۹۵۵ء میں یہ بجٹ ۱۴ لاکھ روپے ہو گیا اور ۲۵ ہزار بچے سکولوں میں آ گئے۔ اس کے علاوہ صرف ۱۹۵۴ء میں اتالیس نئے سکول تعمیر کئے گئے جن

---

[1]۔ بجٹ آف دی سنٹرل گورنمنٹ آف پاکستان فار دی ایئر ۵۲۔۱۹۵۱ء (کراچی سنٹرل گورنمنٹ پریس، ۱۹۵۲ء)

پر کُل لاگت ۵۴ لاکھ روپے آئی (سکولوں کی تعمیر کے اخراجات تعلیمی بجٹ کی بجائے تعمیرات عامہ کے تحت کئے جاتے ہیں)[۱]

صحت کے میدان میں ہر ایجنسی میں اس کا اپنا سرجن اور کئی اسسٹنٹ سرجن، ایک سکاؤٹ ہسپتال اور ایک متحرک ڈسپنسری ہوتے ہیں۔ ویکسی نیٹروں کے گروہ ساری قبائلی پٹی میں پھرتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار ایسے علاقوں میں بھی نکل جاتے ہیں جہاں پولیٹیکل ایجنٹ بھی جانے سے کتراتا ہے کہ بدامنی نہ پیدا ہو۔ ۱۹۵۲ء سے مرکزی حکومت نے گھریلو دستکاریوں کو فروغ دینے کی محدود سی کوشش کی ہے۔ کرم میں ریشم کی پیداوار اور ٹوکری سازی کے سنٹر کھولے ہیں۔ مالاکنڈ میں قالین بافی اور وانا (جنوبی وزیرستان) میں ایک میٹل ورکنگ شاپ کھولی ہیں۔ ان تجربات کا ابھی تک اقتصادی لحاظ سے علاقے پر کوئی مجموعی اثر نہیں ہو سکا تاہم سینکڑوں قبائلیوں نے ایسے کاموں میں تربیت حاصل کر لی ہے جو ان کی قلیل آمدنیوں میں اضافہ کا موقع مہیا کرتے ہیں۔

امن وامان:۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ

---

[۱] - این ڈبلیو ایف پی ایئر بک ۱۹۵۵ء، ص ص ۲۳۵ تا ۲۳۷

امن دامان پر اخراجات مسلسل زیادہ ہی رہے ہیں ۱۹۵۲ء کے مرکزی بجٹ میں صرف ۲۰۰۰۰۰ روپے قبائلی وظائف کے لئے رکھے گئے تھے لیکن اصل خرچ اس سے کہیں زیادہ ہوا (بعد کے میزانیوں میں وظائف بالکل حذف کر دیئے گئے) آج بھی سکاؤٹوں، فرنٹیئر کانسٹیبلری اور خاصہ داروں پر اخراجات قبائلی علاقہ پر مرکزی حکومت کے کل اخراجات کا غالباً نصف سے بھی زیادہ ہیں۔

ایک لحاظ سے قبائلی علاقے کے بعض حصوں پر سرکاری کنٹرول پاکستان کے تحت بڑھنے کی بجائے گھٹ گیا ہے۔ اس کی مثال وسطی وزیرستان میں واقع رزمک کی عظیم چھاؤنی ہے۔ چھاؤنی ترک کر دی گئی ہے۔ یہاں صرف کبھی کبھار ہی افسران جاتے ہیں اور وہ بھی مقامی ملوک کی دعوت پر۔ رزمک کو شمال میں میرانشاہ اور جنوب میں جنڈولہ (ٹانک وانا روڈ پر) سے ملانے والی سڑکیں اب کھلی نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مسافر کو میرانشاہ (صدر مقام شمالی وزیرستان ایجنسی) جانے کے لئے تین چوتھائی راستہ بنوں اور ٹانک میں سے ایک دائرے کے گرد جانا پڑتا ہے۔ فقیر ایپی اپنی موت تک گورویخت میں ناقابلِ رسائی اور غیر اطاعت پذیر بنا رہا۔

ساتھ ہی ساتھ پشاور اور دیگر میدانی قصبوں کو ایسا امن چین نصیب ہوا ہے جو انگریزی دور میں عنقا تھا۔ ان میں سے بعض

اب بھی شام کو اپنے دروازے بند کرتے ہیں اور صبح کو ہی کھولتے ہیں لیکن یہ محض ایک رسمی کارروائی ہے اور واحد پولیس کا سپاہی عام طور پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ وہ معقول طور پر معزز نما مسافر کو دروازے کے اندر جانے دے۔ سرحدی واقعات پر اعداد و شمار حاصل کرنا اب بھی مشکل ہے لیکن زیر انتظام ضلعوں پر قبائلی علاقے سے چھاپے قریباً اب قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ "پختونستان" ایجی ٹیشن کے باوجود سرحد پار سے حملے بھی کم ہو گئے ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۵۲ء اور یکم اکتوبر ۱۹۵۳ء کے دوران صرف اکتیس رونما ہوئے[1]۔ یہ انگریزی دور کے پُرامن ترین سال سے بھی بہت ہی کم ہیں۔

علاقائی انضمام:۔

وزیر اعلیٰ قیوم نے انضمام کی پالیسی پر خوب زور سے عمل کیا اور قبائلی علاقے کے بعض چھوٹے چھوٹے حصے صوبہ سرحد میں ضم ہو گئے۔ پیشتر اس کے کہ آخرالذکر کہ مغربی پاکستان میں شامل کیا گیا، زیریں کوہ سیاہ کے قبائل جن کی نفری قریباً ۳۴ ہزار تھی ۱۹۵۲ء میں ضلع ہزارہ سے مل گئے۔ ریاست امب کا بھی بیشتر حصہ (قریباً ۵۳ ہزار کی آبادی سے کوئی ۴۸ ہزار) قریباً

---

[1] پاکستان نیوز ڈائجسٹ، کراچی، ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۳ء

اسی وقت شامل کیا گیا۔ گدون قبائل دکل تعداد قریباً ۴۵ ہزار)
جو سوات اور دریائے سندھ کے درمیان رہتے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں
ضلع مردان سے مل گئے۔ سندھی کوہستان کا کچھ حصہ جس میں کوئی ۱½
لاکھ کی مخلوط آبادی تھی جولائی ۱۹۵۴ء میں ہزارہ سے ملا دیا گیا۔
حکومت نے امن و امان کی ذمہ داری سنبھال لی ہے اور ضم شدہ
علاقے کے بعض فلاحی پروگرام بھی لے لئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی
ٹیکس نہیں لگایا تاکہ منتقلی آسان سے آسان رہے۔

مغربی پاکستان کے صوبہ ون یونٹ کے قیام سے کوئی انضمام
نہیں ہوا۔ یہ معنی خیز ہے کہ جتنے انضمام ہوئے وہ سب پٹھان علاقے
کے مشرقی کناروں پر ہوئے جہاں قبائلی علاقہ ڈیورنڈ لائن کے علاقوں
کی نسبت کمزور ہے اور کوئی انضمام بین الاقوامی سرحد سے
متصل علاقوں میں نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ نسبتاً ترقی یافتہ علاقے
جیسے کرم اور ریاست سوات بھی اپنا خصوصی درجہ قائم رکھے
ہوئے ہیں۔ ان کا محل وقوع اتنا اہم ہے کہ مرکزی حکومت
ان پر اپنا براہ راست کنٹرول کا ملاً چھوڑنے پر کبھی رضامند
نہیں ہو سکتی۔

تاہم جہاں تک قبائلی مسئلہ کم از کم اقتصادی ہے زیر انتظام
ضلعوں کے ساتھ انضمام اہلِ کوہ کے لئے بہت کشش رکھتا ہے۔
ان کی سرحد پر بی لاریب ہے جبکہ زیرِ انتظام ضلعوں میں معیار زندگی

بلند تر ہے اور وہ پہاڑیوں کی نسبت آگے بڑھنے کے زیادہ مواقع پیش کرتے ہیں۔

انضمام کے طریقہ سے قطع نظر قبائلیوں کی فطرت اور نہج فکر کا تقاضا ہے کہ یہ تدریجی ہونا چاہیئے۔ 1951ء سے 1954ء تک قبائلی علاقوں کے نصف درجن دوروں کے دوران مصنف کو یہ یقین کرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آیا کہ قبائلیوں کی اکثریت اب بھی ایک بہت محدود اقتصادی فائدے کے لئے اپنی آزادی کو خیر باد کہنے پر رضامند ہے۔

ایک واقعہ ایسا ہوا کہ ایک وزیر جرگہ نے پولیٹیکل ایجنٹ سے کہا کہ وہ ان کے گاؤں میں ایک سفری ڈسپنسری اور دیہی سکول کے لئے ایک استاد بھیج دے۔ افسر نے وعدہ کیا کہ اگر بجٹ میں گنجائش ہوئی تو وہ بھیج دے گا۔ جب ایک ملک سے پوچھا گیا کہ اس کا قبیلہ زیر انتظام ضلعوں میں کیوں شامل نہ ہوا جہاں اسے سکول اور ہسپتال خود بخود مل جاتے تو ملک نے زوردار منطقی انداز میں کہا! "اس صورت میں ہم ہسپتال اور سکول لینے اور ان میں جانے پر مجبور ہوتے۔ اب ہم خود ہیں جو فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے مفید ہے یا نہیں۔"

سوات۔ ایک بے نظیر ریاست ٭ قبائلی علاقے کو چھوڑنے

سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے غیر معمولی ترین مظہر یعنی
ریاست سوات پر چھلکتی سی نظر ڈال لیں۔ سوات سرحد کے
سیاسی یا اقتصادی نظام میں اولین اہمیت کی حامل نہیں ہے،
لیکن یہ دو وجوہات کی بناء پر دلچسپ ہے۔ اولاً یہ پاکستان و ہند
کی ایک بے نظیر ریاست ہے اور وہ بھی چھوٹی سی جو نہ صرف
باقی رہی ہے بلکہ بٹوارے کے بعد کے سالوں میں پھلی پھولی ہے۔
ثانیاً یہ اس بات کی مظہر ہے کہ ایک پٹھان ریاست بے مثال قیادت
کے تحت کیا بن سکتی ہے۔

سوات کی آبادی قریباً ۵ لاکھ ہے۔ زیریں وادی سوات
میں یوسفزئی پٹھان آباد ہیں جو زیادہ تر اکازئی سیکشن سے تعلق
رکھتے ہیں۔ بالائی وادی اور سطوح مرتفع میں غیر پٹھان قبیلے
آباد ہیں جن میں قابلِ ذکر توروا اور گھوڑوا ہیں۔ یہ ریاست
اس صدی میں ایک قابلِ قدر انسان کی مساعی سے منظم ہوئی
جس کا نام عبدالودود تھا۔ عبدالودود ۱۹۴۹ء میں اپنے بیٹے
اور موجودہ حکمران جہانزیب کے حق میں دستبردار ہو گیا۔
والی جیسا کہ جہانزیب کہلاتا ہے بہت جز رسی اور کفایت شعاری
سے ریاست پر حکومت کرتا ہے۔ وہ ذاتی طور پر پلوں کی
مرمت اور سڑکوں کی دیکھ بھال کی نگرانی کرتا ہے اور ۱۲۵
سے زیادہ سکولوں (مشمولہ یہ ایک چار سالہ کالج) کے لیل و

نہار کو دیکھتا ہے جو ریاست میں برسرکار ہیں۔ گو حکومت کی باگ ڈور قریباً والی کے ہاتھوں میں ہے تاہم ۱۹۵۴ء سے ایک مجلس مشاورت بھی موجود ہے جس کے دس ممبر والی کے نامزد اور پندرہ منتخب ہوتے ہیں۔ ریاست کا نظم و نسق ایک بہترین نظام مواصلات و حمل و نقل کے ذریعے چلایا جاتا ہے جس میں پندرہ سو میل لمبی ٹیلیفون لائن اور ۳۷۵ میل لمبی ہمہ موسمی سڑک شامل ہے۔

سرحد پاکستان کے ایک حصہ کی حیثیت سے :۔

پٹھانوں کا اپنے نسلی تشخص کا شعور ظہور پاکستان کے بعد کم نہیں ہوا۔ انہوں نے مغربی پاکستان کے صوبہ ون یونٹ کے خلاف سخت ترین دشمن مہیا کئے ہیں جو بنگالیوں، سندھیوں اور بلوچوں کے ساتھ مل کر "پنجابی غلبہ" کے خلاف سیاسی محاذ بنانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ چند پٹھان سیاسی رہنماؤں اور زیادہ تر سرکاری ملازمین نے ون یونٹ کو اس لئے قبول کر لیا ہے کہ یہ ایک انتظامی بہتری ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک مستحکم تر سیاسی توازن کے لئے مفید ہے لیکن بہت سے اسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

لیکن ون یونٹ پر معرکہ آرائی محض واضح ترین اظہار

ہے پٹھان کی اپنے علاقے سے گہری محبت کا جو روایتی طور پر یاغستان رہا ہے یعنی غیر محکوم لوگوں کی سر زمین یا مختلف الفاظ میں سرکش لوگوں کی سرزمین۔ اگر پٹھان قومیت جدید انداز میں ارتقاء پذیر نہیں ہو سکی تو پٹھان قبائلیت اور صوبائیت کسی اور گروہ کے ساتھ میل جول کو اور بھی قابلِ نفرت سمجھتی ہے چہ جائیکہ اس کا غلبہ ہو۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک مصنّف قبائلی ملوک کے ساتھ سلسلہ ہائے کلام میں ہر ایک سے پوچھتا رہا ہے "آپ کون ہیں؟ آپ کا لیڈر کون ہے؟ آپ کا علاقہ کونسا ہے؟" تقریباً بلا استثنا جواباً کا ڈھب ایک ہی رہا۔ مسئول نے اپنا نام بتایا، اپنا قبیلہ یا خیل بتایا اور اپنے خیل کے سرکردہ ملک کا نام بتایا (بشرطیکہ وہ اسے تسلیم کرتا تھا) ان میں سے معدودے چند میں سیاسی شعور یا شاید مصلحت پسندی آتنی و خیل ہو گئی تھی کہ مقامی پولٹیکل ایجنٹ کا نام بھی شامل کر لیا جاتا تھا لیکن سب کا خاتمہ کلام ایک ہی تھا۔ "میں پٹھان ہوں"

سوال کی عبارت کو بھی بدلنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جب تک انہیں صاف طور پر نہ پوچھا گیا کہ وہ پاکستان، افغانستان اور پختونستان، کے متعلق کیا سوچتے تھے اس وقت تک انہوں نے قومی پیرائے میں جواب نہیں دیا۔ سب پاکستان کے لئے اپنی ترجیح کا

اظہار کرتے تھے لیکن پھر بھی یہ ظاہر تھا کہ وہ پاکستان کو اپنے آپ سے علیحدہ اور ممیز سمجھتے تھے۔

اس کے برعکس متعدد پٹھان سیاسی رہنماؤں نے اپنے آپ کو بہت کامیابی و جامعیت کے ساتھ قومی منظر میں جذب کر دیا ہے۔ خان عبدالقیوم خان نے ۱۹۵۳ء میں صوبہ سرحد سے جانے کے بعد ڈیڑھ سال مرکزی کابینہ میں گزارا۔ وہاں اس نے نہ صرف زراعت اور اقتصادی امور کے میدانوں میں حسن کارکردگی کا ثبوت دیا بلکہ ستمبر ۱۹۵۴ء کی پارلیمنٹری بغاوت میں نمایاں حصہ لیا جو گورنر جنرل کے اختیارات کو کم کرنے میں عارضی طور پر کامیاب ہوگئی۔

ایک ماہ بعد گورنر جنرل نے منحرف وزراء پر جوابی وار کیا تو قیوم کابینہ سے نکل گیا اور کچھ عرصے کے لئے منظرِ سیاست سے دور ہوگیا۔ وہ ۱۹۵۸ء میں صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے دوبارہ نمودار ہوا۔ اس حیثیت میں اس کی زوردار سرگرمیاں قریباً تمام کی تمام قومی اور بین الاقوامی مسائل پر مرکوز رہیں اور ان میں پٹھان صوبائیت کا شائبہ بھی نہ تھا۔

قیوم کا جانشین وزیراعلیٰ، عبدالرشید خان اس عہدے سے محروم ہوا جب صوبہ سرحد صوبہ مغربی پاکستان میں مدغم ہوگیا۔ لیکن رشید پولیس میں واپس نہیں آیا بلکہ مغربی پاکستان کی کابینہ میں رہا اور پھر صوبے کا وزیراعلیٰ بن گیا۔ رشید صوبہ سرحد کے باقی پاکستان

سے تعلق کے مسئلہ میں الجھا رہا۔ وہ پہلے پہلے ون یونٹ کا حامی تھا لیکن بعد میں اس کا مخالف ہوگیا اور جولائی ۱۹۵۵ء میں اس نے پرزور وکالت کی کہ عبدالغفار خان سرحد واپس آکر اس منصوبے کے خلاف کام کرے۔ مغربی پاکستان کی سیاست میں حصہ لینے کے دوران اس نے مسلم لیگ کو خیرباد کہا اور وہ نوساختہ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہوگیا۔

میاں جعفر شاہ شاید سرحدی سیاستدانوں میں سب سے زیادہ پرُ کار اور سخت جان تھا۔ وہ قبل تقسیم کی کانگرس حکومت میں رہا، اور اس کے بعد رشید کے ساتھ۔ بعدازاں وہ مرکزی کابینہ میں چلا گیا، جہاں اس نے سرحد میں اپنی گہری ذاتی جڑوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی صلاحیتیں وزارت مواصلات کے لئے وقف کر دیں۔

ان میں سے کوئی بھی قومی منظر پر پٹھان صوبائیت کے علمبردار کی حیثیت سے نہیں آیا۔ یہ بات پٹھان جرنیلوں پر اور بھی زیادہ صادق آتی ہے جو پاکستان کی فوج کے جنرل سٹاف میں کثیرالتعداد ہیں۔ ایسے ہی نسبتاً کم پٹھان سنیئر سول افسران نے پاکستان کے دونوں بازوؤں مشرقی اور مغربی میں نہایت گراں قدر اور غیر جانبدارانہ خدمات انجام دی ہیں۔

خان برادران یعنی ڈاکٹر خان صاحب (جسے ایک غیر مطمئن بے روزگار نے مئی ۱۹۵۸ء میں قتل کر دیا) اور بادشاہ خان عبدالغفار خان ایک قدرے مختلف نقطۂ نظر کے مظہر ہیں۔

خان صاحب بٹوارے کے پہلے نصف درجن سالوں کی گمنامی اور گوشہ نشینی کے بعد نئے صوبہ مغربی پاکستان کے پہلے وزیراعلیٰ بنے. یہ کافی حد تک واضح ہے کہ انہیں اس منصب پر کیوں لایا گیا. سب سے پہلی بات تو یہ کہ وہ ایک مشہور و معروف پٹھان تھے جنکی نئی حکومت کی سربراہی '' پنجابی غلبہ'' کی تردید تھی. دوسرے وہ ایک ایماندار مقبول عام اور محترم اصلاح پسند تھے۔

لیکن یہ کچھ زیادہ واضح نہیں کہ انہوں نے ایک ایسا منصب کیوں قبول کیا جو معززانہ ہونے کے باوجود قدیم خدائی خدمت گاروں کے مرکوز الافغان عزائم و مقاصد کے خلاف تھا. ممکن ہے ایک پرانا جنگی گھوڑا سیاسی معرکے کے لئے اٹھا ہو تا کہ گمنامی و بداعتمادی کے دور کے بعد اپنی قدر و قیمت آشکار کرنے کے موقع سے فائدہ اٹھا سکے. شاید یہ بات بھی تھی کہ وہ دونوں بھائیوں میں سے زیادہ گنجائش پسند تھے. اور چاہتے تھے کہ خدائی خدمت گاروں کے سیاسی و اقتصادی اصلاحاتی تخیلات کو ایک بڑی سٹیج پر روشناس کرائیں۔

عبدالغفار خان کو تقریباً چھ سال بعد ۱۹۵۴ء کے اوائل میں رہا کر دیا گیا. وہ فوراً ہی اپنی ان سیاسی سرگرمیوں میں دوبارہ مشغول ہو گئے جن سے انہیں زبردستی ہٹایا گیا تھا. انہوں نے مرکزی اسمبلی میں اپنی نشست پھر سے سنبھالی اور وہ حکومت کے زوردار ترین نقادوں میں شامل ہو گئے. انہیں سرحد و بلوچستان میں ایجی ٹیشن

کی بناء پر دوبارہ مختصر عرصے کے لئے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ ون یونٹ منصوبہ کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے اپنے محبوب صوبہ کا اور تمام باقی مغربی پاکستان میں روکنے کے لئے ہر ممکنہ طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا کہ وہ ایک آزاد "پختونستان" کے حامی تھے لیکن وہ ہمیشہ اس پر بضد رہے کہ صوبہ سرحد کو لازماً کوئی خصوصی خود مختار درجہ ملنا چاہیئے۔

خدائی خدمت گاروں پر پابندی برقرار رہی تنظیم کے سابقہ کٹر عناصر غفار خان سے وفادار رہے اور وہ زیر انتظام ضلعوں کے تقریری دوروں میں بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب کرتے رہے۔ بالآخر، ۱۹۵۷ء میں غفار خان پاکستان کے دوسرے حصوں کے غیر مطمئن لیڈروں سے ملے اور نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد رکھی گئی جس کا انتہا پسندانہ، صوبہ پیوستہ پلیٹ فارم بہت سی باتوں میں خدائی خدمتگاروں کی یاد دلاتا تھا۔ انہوں نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ وہ نہ صرف خارجہ پالیسی کے مسائل سے لاتعلق تھے بلکہ بیرون سرحد پاکستان میں ہونے والے واقعات سے بھی بے نیاز تھے۔ انہوں نے اس خصوصی درجے کی کبھی وضاحت نہیں کی جو وہ سرحد کے لئے چاہتے ہیں لیکن وہ بضد ہیں کہ موجودہ صورتحال کو لازماً ختم ہونا چاہیئے اور اس پر گاندھی ہٹ کے مظہر ہیں۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں جنرل ایوب خان کی نئی حکومت کے قیام کے بعد غفار خان کو

پھر گرفتار کر لیا گیا۔

عمومی طور پر ایوبی حکومت نے اپنے پیشروؤں سے کہیں زیادہ پٹھانوں کو رشتۂ پاکستان میں پرونے کی کوشش کی ہے۔ کسی وقت کی صوبہ سرحد کی حکومت اور مرکز کے اختیارات کا بیشتر حصّہ لاہور میں مرکوز حکومت مغربی پاکستان کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے، اچھ زیر انتظام ضلعوں کی انتظامیہ بھی ایک دفعہ پھر رہنمائی کے لئے لاہور کی طرف دیکھنے لگی ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ قبائلی علاقے پر حکومتی دباؤ بڑھ گیا ہے، کیونکہ صدر ایوب نے قبائلی بے چینی پیدا کرنے کی افغان کوششوں کے خلاف زوردار ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ کابل کی شہہ پر اٹھے ہوئے مخالف لشکروں کو ۱۹۶۰ء کے موسم خزاں میں وفادار قبائل نے پاکستانی فوج کی مدد سے بذریعہ طاقت تتر بتر کر دیا۔ ایجی ٹیشن کے نتیجہ میں نواب دیر کو معزول کر دیا گیا اور ریاست میں پہلی دفعہ باقاعدہ پاکستانی فوج اور انتظام کار متعیّن کر دیئے گئے ۱۹۶۱ء میں مزید اقدامات کئے گئے جن میں باجوڑی ایجی ٹیشن کے لیڈروں کے گھروں پر پاکستان ائیر فورس کی بمباری بھی شامل تھی۔

مستقبل :۔

موجودہ پیچیدہ سیاسی صورتحال کے سیاق و سباق میں یہ اندازہ

لگانا مشکل ہے کہ مستقبل میں سرحد کا باقی پاکستان سے کیا تعلق ہوگا۔
لیکن ایک چیز "پختونستان" کے باوجود خاصی واضح ہے کہ سرحد کے
ایک آزاد سیاسی یونٹ بننے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی
زیادہ گنجائش پسند قیادت نے پاکستان کو ایک ایسی سٹیج کے طور پر
قبول کر لیا ہے جس پر اس کی تقدیر کا فیصلہ ہوگا اور پہاڑی قبائل
جدید معنویت کی قومیت کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔

اگر متصل علاقوں میں کوئی بڑا انقلاب نہ آجائے تو یہ بھی
غیر اغلب ہے کہ پہاڑی قبائل ایک دفعہ پھر زیر انتظام ضلعوں کی
حکومت کے ساتھ ۱۹۴۷-۴۸ء کی طرح وسیع پیمانے پر گتھم گتھا
ہو جائیں لیکن اس کے ساتھ ہی سرحد اپنا تشخص شاید ہی کبھی مکمل
طور پر نذر پاکستان کرے گا۔ اس سمت میں یہ زیادہ سے زیادہ ایک
قسم کا پاکستانی ٹیکا اس پہنچائے گا۔

پہاڑی قبائل کا مسئلہ اس حقیقت سے اور پیچیدہ ہو جاتا ہے
کہ وہ نہ صرف پنجابیوں، سندھیوں اور بنگالیوں کی ایک قوم میں محض
پٹھان ہی نہیں ہیں بلکہ بیسویں صدی کی ایک جمہوریہ میں قبائلی ہیں۔
انہوں نے آج تک اپنا یہ کردار ترک کرنے کا کوئی میلان ظاہر نہیں
کیا اور خود پاکستان بھی ان کو اس پر مجبور کرنے میں بے حد متامل
ہے۔

اس وقت زیر عمل اقتصادی ترقیاتی منصوبے کچھ قبائلیوں

کو پہاڑیوں سے باہر کھینچ لیں گے لیکن پاکستان خود سنگین بنیادی
اقتصادی مسائل میں گھرا ہوا ہے، اور یہ قرین قیاس معلوم نہیں
ہوتا کہ کم از کم مستقبل قریب میں زیر انتظام علاقے اتنا ترقی کر جائیں
کہ وہ سب اہل کوہ کو اپنے ہاں کھینچ لیں یا ان کے آنے کی صورت
میں انہیں سنبھال لیں۔

دریں اثنا وہ اپنی پہاڑیوں میں مست ہیں اور ان کے پاس
اپنے عظیم الشان انسانی وسائل کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پاکستان اور
افغانستان دونوں ماضی میں اپنے اپنے قومی مفادات کی خاطر ان
انسانی وسائل کے لئے مقابلہ کرتے رہے ہیں اور وہ اب بھی ایسا ہی
کر رہے ہیں جیسا کہ اگلے باب سے ظاہر ہوگا۔ اس مسابقت نے
پہاڑی پٹھانوں کی وحدت اور انضمام میں سب سے زیادہ رکاوٹ
ڈالی ہے۔

سرحد میں افغان دلچسپی

سرحد افغان دلچسپی کے دو سرچشمے ہیں۔ کابل کے حکمران ٹولہ کے نقطۂ نظر سے دونوں برمحل اور جائز ہیں۔ اولاً سرحد ایک لحاظ سے افغانستان بے انفکاک ہے۔ ثانیاً پٹھان قبائل ایک ایسی قوت ہیں جو ماضی کی طرح افغان حکومتیں بنا اور بگاڑ سکتے ہیں۔ دونوں عناصر بہت سے پٹھانوں کے دماغوں میں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور تحریک "پختونستان" میں ممتزج ہیں۔ "پختونستان" پر بحث کرنے سے پہلے ان عوامل پر تبصرہ ضروری ہے جنہوں نے اسے پیدا کیا ہے۔

افغانستان بے انفکاک :۔

سرحد میں تاریخی ارتقاء کا ایک خاکہ پہلے ہی پیش کیا جا چکا ہے لیکن سرحد پر افغان دعاوی کا اعادہ یہاں مفید رہے گا۔ اٹھارہویں اور نصف اول انیسویں صدی میں سرحد پر بالفعل سیاسی حاکمیت

بے تحاشا بدلتی رہی ہے ۔ لیکن افغان نقطۂ نظر سے ایک خاصا مسلسل نقشہ کھینچا جا سکتا ہے ۱۷۳۹ء میں ایران کے افشار ترک بادشاہ نادر شاہ نے مغل شہنشاہ محمد شاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ سلطنت دہلی کے سندھ پار علاقے اس کے حوالے کر دے ۔ جب نادر کی مختصر المیعاد سلطنت ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کی فتوحات کا مشرقی حصہ ایک مقامی افغان ، احمد شاہ ابدالی کے زیر نگیں آ گیا ۔ احمد شاہ نے اپنا دار الحکومت قندھار میں قائم کیا ۔ حکمران پٹھان قبیلے کو درانی کا نام دیا اور ایک ایسی سیاسی مملکت کی بنیاد رکھی جو آج تک قائم ہے اور اسی کایا پلٹ سے گزری جیسے اور بہت سی ریاستیں گزری ہیں ۔

احمد شاہ کے بیٹے اور جانشین ، تیمور شاہ نے دار الحکومت کو کابل منتقل کیا تاکہ ایک دور دراز تک پھیلی ہوئی سلطنت کو بہتر طور پر قابو کر سکے جو ۱۷۷۲ء میں اس کی موت پر قریباً پورے موجودہ افغانستان کے علاوہ پشاور ، لاہور ، ملتان ، سندھ ، قلات بلوچستان ، کشمیر اور خراسان پر محیط تھی ۔ اگلے پچاس سال میں درانی سلطنت ٹوٹ پھوٹ گئی لیکن سندھ پار کے علاقے انیسویں صدی میں بھی اس کے قبضے میں رہے ۔ پشاور پر سکھوں کے حملے ۱۸۱۸ء کے قریب شروع ہوئے لیکن ۱۸۳۴ء تک یہ شہر درانی قبضے میں رہا جب رنجیت سنگھ نے اس کا الحاق کر لیا ۔

امیر دوست محمد نے بیس سال سے بھی کم سکھ حکومت کے دوران اس علاقے کی بازیابی کے لئے اپنی کوششیں کبھی ترک نہیں کیں۔ انگریزوں نے اپنے سکھ اتحادی کے خلاف افغان دعاوی کی کبھی حمایت نہیں کی لیکن بہت سے برطانوی افسروں نے انفرادی طور پر سندھ پار علاقوں میں افغان دلچسپی کو جائز قرار دیا۔ ان میں الیگزنڈر برنز، میکناٹن، جان لارنس اور لمسڈن شامل تھے۔

اصل میں پہلی جنگ افغان (۱۸۳۸ تا ۱۸۴۰ء) میں انگریز سکھ تعاون نے ان اتحادیوں کی فوجی برتری کو واضح طور پر قائم کر دیا۔ (زیادہ تر انگریزوں کی بلاشک وشبہ) اور وسط ایشیا کے اس حصے میں دوست محمد کی بازیابی کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا جو وہ اس گمشدہ صوبے کو بزور شمشیر حاصل کرنے پر لگائے ہوئے تھا۔ لیکن ۱۸۴۹ء میں برطانوی قبضے کے بعد اور دوسری جنگ افغان (۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۰ء) کے دوران اور اس کے بعد بھی افغان مسلسل انصاف کا مطالبہ کرتے رہے۔

۱۸۹۳ء میں ڈیورنڈ معاہدہ تک افغانستان نے سرحد کے بیشتر حصوں پر اپنے دعوے رسمی طور پر ترک نہیں کئے۔ امیر عبدالرحمان کا یہ دعویٰ کہ اس نے مجبوراً سر تسلیم خم کیا کافی حد تک درست ہے لیکن یہ بھی یکساں طور پر صحیح ہے کہ سندھ پار علاقے پہلے نادر شاہ نے لئے اور پھر احمد شاہ نے محض بزور شمشیر قبضا لئے ۱۹۰۱ء

میں سندھ پار علاقے کو رسمی طور پر سیاسی تشکیل دے دی گئی جب لارڈ کرزن نے صوبہ سرحد اور اس سے پرے قبائلی علاقہ کی تخلیق کی۔

ڈیورنڈ معاہدہ میں امیر عبدالرحمان اور انگریزوں نے وعدہ کیا کہ وہ ڈیورنڈ لائن کے مطابق تقسیم کردہ ایک دوسرے کے علاقے میں "مداخلت کاری" نہیں کریں گے۔ وہ دونوں اس معاہدے کو "سرحد کے سلسلے میں تمام بڑے بڑے اختلافات رائے کا ایک مکمل اور تسلی بخش تصفیہ" سمجھتے تھے۔ عبدالرحمان کے بیٹے اور جانشین امیر حبیب اللہ نے ۱۹۰۵ء میں ایک اور معاہدے پر دستخط کئے کہ وہ ۱۸۹۳ء میں اس کے والد کی اختیار کردہ ذمہ داریوں کو پورا کرے گا۔

گو دستخطوں کے تحت وہ سندھ پار علاقے دے چکے تھے اور ان میں عدم مداخلت کا وعدہ بھی کر چکے تھے تاہم افغان انگریزوں کی طرف سے سرحدی قبائل میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور خفیہ سیاسی خط وکتابت کے ذریعے اس علاقے کا کم از کم کچھ حصہ واپس دینے پر اصرار کرتے رہے۔
اس کی کوئی دستاویزی شہادت موجود نہیں ہے لیکن افغانستان اور سرحد میں ایک خیال اب بھی موجود ہے کہ انگریزوں نے حبیب اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ پہلی جنگ عالمگیر میں ہمدردانہ غیر جانبداری برتے تو قبائلی علاقہ اسے واپس کر دیا جائے گا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

اسے ۱۹۱۹ء میں اسی لئے قتل کیا گیا کہ وہ اس معاہدے کو ہوا نہ دے
اور اپنا معاوضہ نہ مانگے۔ ایسا معاہدہ بالخصوص اس کا آخری حصہ
مغربی دنیا کو خواہ کتنا ہی غیر اغلب معلوم ہو یہ پٹھان کے لئے ہرگز خلاف
معمول یا ناممکن نہیں ہے جو وسط ایشیائی سیاست کی ریشہ دوانیوں میں
جکڑا ہوا ہے۔ آیا اس میں کوئی حقیقت ہے یا نہیں بہرحال حبیب اللہ
کے رویئے اور موت کی یہ توجیہ اس توجیہہ سے زیادہ بعید از قیاس نہیں
ہے جو اس وقت انگریزوں نے کی تھی یعنی یہ کہ حبیب اللہ نے
اپنے والد سے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعاون کی قدروقیمت
اور دانشمندی کی آگاہی ورثے میں پائی تھی اور وہ دل وجان سے
ان کا مداح تھا اور اس کے بیٹے امان اللہ نے اس کے قتل کا منصوبہ
بنایا تاکہ وہ تخت پر قابض ہو سکے۔

۱۹۱۹ء میں امان اللہ نے جو تیسری جنگ افغان شروع
کی تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ سندھ پار علاقوں کو بازیاب کیا
جائے یا انہیں انگریزوں کے لئے غیر مستحکم بنا دیا جائے۔ اس میں بھی
کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی حکومت کے خلاف داخلی مخالفت سے
آگاہ تھا اور وہ ایک جہاد کے ذریعے اسے منعطف کرنا چاہتا
تھا اور یہ سرحدی قبائل کے لئے بھی باعث کشش ہوگا۔ بہرکیف
اسے اپنا اصل مقصد تو حاصل نہ ہو سکا گو ۸ راگست ۱۹۱۹ء کے
معاہدہ راولپنڈی کے تحت جنگ ختم ہوگئی اور امور خارجہ میں

افغانستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا لیکن امان اللہ نے ڈیورنڈ لائن کی قائم کردہ انڈو افغان سرحد کو بھی قبول کر لیا۔

۲۲، نومبر ۱۹۲۲ء کو معاہدہ کابل نے عارضی معاہدہ راولپنڈی کی جگہ لی تو اس نے پہلی دستاویزات کے مشتملات کی تصدیق کر دی لیکن امان اللہ نے ایک شرط اس میں شامل کروا دی کہ سرحد کے دونوں طرف قبائلی علاقے میں دونوں طاقتوں کو دلچسپی تھی۔ دفعہ ۲، کے تحت طرفین نے "اپنی اپنی سرحدات کے قریب رہائش پذیر قبائل کے متعلق اپنے اپنے نیک عزائم سے باہمی طور پر مطمئن ہو کر فیصلہ کیا ہے کہ وہ مستقبل میں کسی بڑی فوجی کارروائی سے جو ان کے اپنے حلقے کے اندر رہنے والے قبائل میں قیام امن و امان کے لیے ضروری سمجھی جائے آغاز کارروائی سے قبل ایک دوسرے کو مطلع کریں گے۔"[1]

امان اللہ نے ایک اور چیز بھی حاصل کر لی۔ یہ کابل میں برطانوی وزیر کے ایک نوٹ میں شامل تھی جو ۱۹۲۱ء کا معاہدہ کرنے کے ضمن میں لکھا گیا۔ نوٹ کے ایک حصہ میں کہا گیا۔ "چونکہ دونوں حکومتوں کے سرحدی قبائل کی حالت حکومت افغانستان کی دلچسپی کا باعث ہے لہذا میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ برطانوی حکومت تمام سرحدی قبائل کے لئے خیر سگالی کے جذبات رکھتی ہے اور ان سے فیاضانہ سلوک کا عزم رکھتی ہے بشرطیکہ وہ ہندوستان کے باشندوں

---

[1] ان دونوں دستاویزات کے متن ایچی سن، ایضاً، جلد ۱۳، ص ص ۲۳ تا ۴۲ پر ہیں۔

کے خلاف زیادتیوں سے احتراز کریں"۔[1]

اشارتاً یہ بھی کہتے چلیں کہ سرحدی علاقے میں افغان حاکمیت کسی نہ کسی شکل میں آخر تک تسلیم کی جاتی رہی۔ پشین اور سبی کے بلوچ ضلع، پاڑا چنار اور تھل کے درمیان وادیٔ کرم اور خیبر بھی ۱۸۷۹ء کے معاہدۂ گنڈمک کے تحت انگریزوں کو دیئے گئے۔ کرم پر رسمی قبضہ ۱۸۹۲ء میں ہوا جب ڈیورنڈ معاہدہ کے مطابق سرحد کی عمومی صفائی بندی لازمی قرار دی گئی۔ پشین اور سبی بھی ۱۸۸۷ء میں واقعتاً انگریزی علاقہ قرار دیئے گئے۔ ڈیورنڈ معاہدہ کے مطابق تمام موجودہ قبائلی ایجنسیاں افغانستان سے علیحدہ کر دی گئیں لیکن صرف کرم کو ہی رسمی طور پر انگریزی علاقہ قرار دیا گیا۔

جہاں تک سرحدی قبائل کی ذاتی سرگرمیوں کا تعلق ہے ڈیورنڈ لائن کا اثر قبائلی علاقے اور صوبہ سرحد کے درمیان انتظامی سرحد سے بھی کم محدود کن رہا۔ قبائلی علاقے میں انگریزی کی بجائے افغان کرنسی زیادہ چالو رہی (یہ آج بھی ایجنسیوں کے اکثر حصوں میں رائج ہے)۔ اس میں بھی شک نہیں کہ سماجی و ثقافتی میدانوں میں قبائل، ۱۹۴۷ء تک دہلی کی بجائے کابل سے زیادہ قریب رہے گو وسیع تر اقتصادی اور ۱۹۳۰ء کے بعد سیاسی میدانوں میں ان کا

[1] ایچی سن، ایضاً جلد ۱۳، ص ص ۲۳ تا ۲۴

رخ برطانوی ہند کی طرف زیادہ رہا۔

نام نہاد برطانوی مقبوضہ قبائل میں افغان دلچسپی اور ان کے ساتھ رابطہ ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔ گو بزورِ شمشیر اس علاقے کو انگریزوں سے لینے کی امید تیسری جنگ افغان کے بعد نہ رہی تاہم انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کا خیال افغان ذہنوں میں ضرور موجود رہا جب کبھی آزادیٔ ہند کا امکان زیرِ بحث آیا۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کی گول میز کانفرنسوں کے دوران افغانستان نے لندن کو مطلع کیا کہ سندھ پار کے علاقوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے اسے بھی لازماً شریک ہونا چاہیئے۔ ایسے شواہد بھی موجود ہیں کہ یہ خیال ۱۹۴۲ء میں کرپس مشن کے دوران اور خاتمۂ جنگ پر بھی دہرایا اور رہرایا گیا۔[1]

تاہم کابل ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے متعلق برطانوی منصوبوں کی عجلت و فوریت پر سراسیمہ رہ گیا۔ ۳۰ مئی ۱۹۴۷ء کو ظاہر شاہ نے کابل میں قومی اسمبلی کو بتایا کہ افغانستان یونائیٹڈ کنگڈم اور ہندوستان میں اس کے جانشینوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا خواہاں تھا اور مزید کہا کہ "ہندوستان میں سیاسی تبدیلیاں شاید ہی تعلقات پر اثر انداز ہوں" اس نے سویٹ یونین کے ساتھ حالیہ

۱۔ بی۔ شیمولداو "کنفنکٹ بی اونڈ دی انڈس" دی نیشن، جولائی ۱۶، ۱۹۴۹ء

سرحدی نظر ثانی کا ذکر تو کیا لیکن ڈیورنڈ لائن کا حوالہ تک نہ دیا[1]

لیکن ایک ماہ بعد افغان وزیر اعظم، ہاشم خان نے دورۂ بمبئی کے دوران اعلان کیا کہ انگریزوں کو مطلع کر دیا گیا تھا کہ افغانستان سمندر تک راستہ چاہتا تھا۔ اس نے مزید کہا کہ افغانستان صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کو منظور نہیں کرتا تھا جو باشندگان کو صرف ہندوستان اور پاکستان کے درمیان انتخاب کا حق دیتا تھا نیز یہ کہ افغانستان کو ریفرنڈم میں اپنا نمائندہ بھیجنے کا حق حاصل تھا۔ عین اسی وقت پونا میں افغان باشندوں کے ایک گروہ نے اپنے آپ کو ایک آزاد "پختونستان" سے منسوب کیا[2]

قریباً اسی وقت غفار خان اور اس کے خدائی خدمت گاروں نے اپنی سیاسی زندگیوں کے لئے لڑتے ہوئے صوبہ سرحد میں بھی ایسی ہی آواز اٹھائی (دیکھئے باب دہم) کوئی ایسی شہادت موجود نہیں کہ دونوں مطالبے کابل اور غفار خان کے درمیان پیشگی ساز باز کا نتیجہ تھے لیکن ہندوستان کی آزادی و تقسیم کا منصوبہ جوں جوں اوقات کے مطابق آگے بڑھا ووں ووں یہ دونوں تحریکات ناگزیر طور پر ایک دوسرے سے قدرے ہم آہنگ ہو گئیں خواہ ان کے محرکات کتنے بھی مختلف کیوں نہ تھے جب تقسیم کے سالوں کے بعد کابل

1۔ ٹائمز (لندن) ۳۰ رمئی ۱۹۴۷ء

2۔ سٹیٹسمین، ۲۲ رجون ۱۹۴۷ء

نے ایک آزاد "پختونستان" کے لئے زیادہ سے زیادہ سرکاری حمایت کی تو اس نے اپنے بھی دعاوئ بازیابی بھی اس کے ماتحت کر دیئے۔

افغان احساسات کی شدت کا مظاہرہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں ہوا جب کابل نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی شمولیت کے خلاف واحد مخالفانہ ووٹ دیا۔ یہ اس بناء پر کیا گیا کہ افغانستان صوبہ سرحد کو اس وقت تک پاکستان کا حصہ تسلیم نہ کرے گا جب تک اس علاقے کے لوگوں کو آزادی کے انتخاب کا موقع نہ دیا جائے اس اقدام سے کابل نے یہ واشگاف کر دیا کہ وہ مسئلہ سرحد کا حل اپنے نئے ہمسائے کے ساتھ تعاون کے ذریعے تلاش نہیں کرے گا۔

اس طرح مسئلہ "پختونستان" پیدا ہوا۔ کابل کے بے لچک رویئے کے عقب میں ایک ایسا سلسلۂ استدلال موجود تھا جسے جنوبی ایشیا کے باہر تو کوئی عمومی وقعت نہیں ملی لیکن ہندوستان اور افغانستان میں اسے ہرگز خارج از امکان قرار نہیں دیا گیا۔ یہ استدلال ان شکوک پر مرکوز تھا جو پاکستان کی "بقائیت" کے متعلق تھے۔ نئی قوم کی شکست و ریخت کی صورت میں کسی نہ کسی صورت میں "پختونستان" کے ظہور کے امکانات قوی تھے۔ یہ قرین قیاس تھا کہ ایسی ریاست فوراً ہی افغانستان میں شامل ہو جائے گی۔ بالخصوص ہندوستان کی حمایت کی بناء پر یہ جو شرقی سندھ کے علاقے لے جائے گا۔ گو یہ شکست و ریخت تو نہیں ہوئی تاہم "پختونستان" کے لئے افغان جوش و خروش پاکستان

سے استحکام کے مدوجذر کے ساتھ بڑھتا اور گھٹتا رہا ہے۔ اب بھی "پختونستان" افغانوں کے احساسات بازیابی کا مفید ترین اور عملی اسلحہ خانہ ہے۔ مزید برآں یہ باہمی تعلقات کے پورے دائرے میں کابل پر پاکستانی دباؤ کا مؤثر توڑ بھی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے کسی حد تک سرحدی قبائل کے اندرون افغانستان عزائم کو ایک دوسری سمت میں منتقل کر دیا ہے۔

طاقت کے مراکز

سرحدی قبائل نے افغانستان کے حکمرانوں کے سلسلے میں ہمیشہ ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں تخت کے لئے جو برادرانہ کشمکش ہوئی قبائل نے یکے بعد دیگرے امیروں کو بنایا اور ہٹایا۔ انہوں نے شاہ شجاع کو قبول نہ کر کے پہلی جنگ افغان کے بعد انگریزوں کے لئے اسے تخت پر رکھنا ناممکن بنا دیا۔ شیر علی (۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۹ء) اور یعقوب خان (۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۰ء) دونوں اپنی حکومت قائم رکھنے میں قبائل کی حمایت پر منحصر رہے۔ صرف عظیم عبدالرحمان (۱۸۸۰ء تا ۱۹۰۱ء) اپنا تخت کھوئے بغیر قبائلی بغاوتوں کو دبانے میں کامیاب ہو سکا۔

امان اللہ کا اخراج !

قبائلی طاقت کا نقش امان اللہ کے اخراج میں پُرزور ترین طریقے سے بیٹھا۔ امان اللہ کے خلاف بغاوت کے بیج اس کے انقلابی اصلاحاتی پروگرام کی قبائلی مخالفت میں موجود تھے جس کے ذریعے وہ افغانستان کو ایسے ہی جدید بنانا چاہتا تھا جیسے اتاترک نے ترکی کو بنایا تھا۔

امان اللہ ابن حبیب اللہ ۱۹۱۹ء میں تخت نشین ہوا۔ فوراً ہی بعد اس نے انگریزوں کے خلاف تیسری جنگ لڑی۔ برطانوی سرحد پر شمالی قبائل کی بغاوت جس پر امان اللہ کے جرنیل نادر خان کے وادیٔ کرم پر قبضہ کے تسلسل کا انحصار تھا خلافِ توقع ہرگز رونما نہ ہوئی۔ قبائل امان اللہ کے دور کے ابتدائی سالوں میں ایک زبردست لیکن غیر یقینی عامل بنے رہے ۱۹۲۴ء میں وہ اپنے اصلاحاتی پروگرام میں سے بڑی بڑی رعایتیں دے کر ہی ایک بغاوت کا سامنا کر سکا جس میں ایک وقت قریباً تمام غلزئی شامل ہو گئے تھے۔

کمزوری کے اس مظاہرے کی یاد تازہ رہی اور بعد میں اس کے زوال کا اہم سبب بن گئی نومبر ۱۹۲۸ء میں شمالی قبائل ٹوٹ پڑے۔ شنواری اٹھے اور جلال آباد پر قابض ہو گئے۔ مہمند بھی

لوٹ کا حصہ لینے کے لئے لپک پڑے۔ خوست کے ارد گرد جاجی اور زدران باغی ہو گئے۔ امان اللہ کے مسائل اور بھی بڑھ گئے جب ایک تاجیک ڈاکو، حبیب اللہ المعروف بہ بچہ سقہ اپنے گروہ کے ساتھ شمال میں نمودار ہوا۔

امان اللہ کو چشم زدن میں تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا۔ بچہ سقہ تھوڑے عرصہ کے لئے تخت پر بیٹھا حتیٰ کہ نو ماہ بعد اس نے اپنا تخت اور زندگی دونوں نادر خان کے حوالے کئے جس کی حمایت جنوبی پٹھان قبائل بالخصوص سرحد کی ہندوستانی طرف کے وزیر اور محسود کر رہے تھے اس کے بدلے نادر خان نے وحشیانہ قبائل کو اپنا دارالحکومت لوٹنے کی اجازت دے دی۔ چند سالوں کے اندر اندر ہی وزیر اور محسود نادر شاہ کی مخالفت پر اتر آئے تھے اور برور کہہ رہے تھے کہ انہوں نے اس کی حمایت صرف اس لئے کی تھی کہ وہ امان اللہ کو بحال کرے گا جو بچہ سقہ کے مقابلے پر فرار ہو گیا تھا۔

۱۹۳۳ء میں حکومت ہند کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وزیروں اور محسودوں نے دوبارہ ڈیورنڈ لائن کو عبور کر لیا اور صوبہ خوست کے دارالحکومت متون کا محاصرہ کر لیا۔ انہیں نادر شاہ کے بھائی، ہاشم خان نے افغان حکومت کی تمام افواج کی کمان کرتے ہوئے بمشکل ایک لڑائی میں پسپا کیا۔

نادر شاہ کے نوزائیدہ خاندان کے لئے دیگر قبائلی مخالفتوں کی بھی کمی نہ تھی۔ جنوب میں "ملائے لنگ" اور "لیتے نبی کا فقیر دیوانہ" کابل کی حکومت کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ فرغانہ کی سوویٹ ریاست کا ایک باسماچی مخالف، ابراہیم بیگ جیحوں پار کر آیا اور روسی اس کے تعاقب میں افغانستان میں بہت اندر تک آگئے۔ بچہ سقہ مرحوم کے پیروؤں نے کابل کے قریباً مضافات میں بغاوت کر دی تو نادر شاہ کو ایک دفعہ پھر پٹھان قبائل کو حمایت کے لئے بلانا پڑا۔ اس دفعہ وہ ان کو کابل کو لوٹے بغیر واپس بھیجنے میں کامیاب ہوگیا۔

یہ خطرات ابھی ختم ہوئے ہی تھے کہ ایک اور خطرہ نمودار ہوا۔ امان اللہ کا ایک منظور نظر اور شاہی خاندان کے دیرینہ دشمن زبردست چرخی خاندان کا سربراہ غلام نبی جلاوطنی سے واپس آیا اپنے پرانے گناہوں سے تائب ہوا اور نادر شاہ کی خدمت پر مامور ہوا۔ جنوب میں ایک قبائلی بغاوت کا بڑا احتیاط منصوبہ بنا کر وہ کابل میں نمودار ہوا تاکہ کسی مناسب وقت پر نادر شاہ کو اکھیڑ دے۔ اس کے عزائم کا پتہ چل گیا اور ۸ ر نومبر ۱۹۳۲ء کو روایتی افغان انداز میں توپ زد کر دیا گیا، لیکن اس کی سزائے موت نے اپنے تمام تر جواز کے باوجود ان قبائل کی نفرت کو بڑھا دیا جو خاندان کے لئے اس کی حمایت کر رہے تھے۔

۱۹۳۷ء میں کابل نے ایک غلزئی بغاوت کو آسانی سے

دبا دیا، لیکن ۱۹۲۸ء کے موسم بہار میں ایک نیا خطرہ منڈلایا۔ ایک شامی مہم آزما، سیدالگیلانی المعروف بہ شامی پیر وزیرستان میں آدھمکا۔ وہ امان اللہ کے اصلاحاتی پروگرام کے رہنماؤں، طرزی خاندان کا ایک رشتہ دار بتایا جاتا تھا جس سے اس کی ملکہ ثریا بھی تعلق رکھتی تھی۔ شامی پیر نے محسود علاقے کے وسط میں واقع کنی گورام سے امان اللہ کی بحالی کے لئے اعلانِ جہاد کیا۔ وزیر اور محسود احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک بڑا لشکر سرحد کی طرف روانہ ہوا حالانکہ ان کے لئے مقامی تفریح بکثرت موجود تھی جو فقیر ایپی اور ایک برطانوی مہم پر مرکوز تھی۔

۱۹۲۹ء کے فرار کا اعادہ نہ ہونے دیا گیا۔ دیوانہ وار اور پرزور احتجاجات کے بعد انڈین پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے یورپ کے جنگ کے امنڈتے ہوئے بادلوں کے پیش نظر شامی پیر کو بلطائف الحیل پکڑ لیا اور اسے ۲۰ ہزار پونڈ کے برابر سونے کے ساتھ اس کی جلب توجہ کے لئے ایک ہوائی جہاز میں بٹھایا اور واپس دمشق اتار دیا۔ یہ سبق حکومت کابل کو بھولے نہیں۔ جو کچھ ۲۰ ہزار پونڈ روک سکتے تھے اتنے ہی یا ان سے بھی کم شروع بھی کر سکتے تھے۔ افغان وظائف پٹھان قبائل کے لئے بالخصوص جو ڈیورنڈ لائن کی برطانوی طرف بڑھا دیئے گئے۔ دربار کابل میں حاضر ہونے والے ملوک کو کھلے دل سے خلعتیں تقسیم کی گئیں۔

کشمیر کے جہاد میں وسیع پیمانے پہ شمولیت (دیکھئے باب دہم)
نے حکومت کابل کو ایک دفعہ پھر یاد دہانی کرائی کہ افغان قبائیلیوں
پر اس کا کوئی قابو نہ تھا۔ "پختونستان" کے لئے ہندوستانی حمایت افغانستان
سے کوئی معاوضہ چاہتی تھی اور کابل نے ہر ممکنہ طریقے سے جہاد کشمیر
کی مخالفت کے ذریعے اسے ادا کرنے کی کوشش کی۔ حکومتی احکامات
کے تحت قوم کی سرکاری مذہبی کونسل، جماعت علماء نے قبائلی نقل و
حرکت کی مذمت کی اور اسے جہاد کا درجہ دینے سے انکار کر دیا۔

لیکن جماعت قریباً سراسر نوجوان، سرکاری تربیت یافتہ
علماء پر مشتمل تھی اور اصل مذہبی اثر و رسوخ کہیں اور تھا! افغانستان
میں مذہبی و سیاسی جوڑ توڑ کے بزرگ محترم، مرحوم و مغفور ملا صاحب
شور بازار نے واضح کر دیا کہ وہ سرکاری نقطۂ نظر کے حامی نہ تھے۔
قدیم مکتب کے ایک محترم و محتشم ملا نور مشائخ نے جہاد کے خلاف
جماعت کے فتوے کی کھلم کھلا تردید کی اور افغانستان کے
مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے کی تلقین کی۔

افغان قبائلی کسی قسم کی سیاسی یا مذہبی رہنمائی کے بغیر
ہی اپنے ذہنوں کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ کثیر تعداد میں افغانستان
گئے۔ حکومت پاکستان قبائلی حملے کو روک سکتی تھی یا نہیں، یہ ایک
متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ افغان حکومت سب
سے بڑے اور با اختیار مذہبی ادارے کے فتوے اور زیادہ سے

زیادہ سرکاری دباؤ کے باوجود ایسا نہ کر سکی اور وہ اپنے شہریوں کو بھی شرکت سے روکنے میں ناکام ہو گئی۔

"پختونستان":

ایک آزاد پٹھان ریاست کا افغان تصور عبدالغفار خان کے تصور سے کہیں زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے۔ گو کابل کے پختونستانی علمبردار کبھی کبھار کہتے ہیں کہ وہ پرانے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے پر مشتمل رقبے پر ہی قانع ہو جائیں گے تاہم ریاست کی جو اکثر و بیشتر تشریح کی جاتی ہے اس میں سے بلوچستان، قلات اور لسبیلہ، مکران اور خاران کی جنوبی بلوچ ریاستیں بھی شامل بتائی جاتی ہیں۔ یہ سب مل ملا کر مغربی پاکستان کے کل علاقے کے نصف سے کچھ ہی کم رقبہ بنتا ہے۔

ایسی ریاست کی "پختونیت" مشکوک ہے۔ شرق سندھ کے ضلع ہزارہ میں پشتو بولنے والے بہت کم ہیں۔ یہی حال ریاست چترال کا ہے۔ بلوچستان بلوچ ریاستوں اور ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے نچلے حصے میں صرف پٹھان اقلیتیں موجود ہیں۔ افغان تجویز میں ساحل مکران پر واقع گوادر کا نقطہ معین و محصور بھی شامل تھا جو ۱۹۵۸ء تک مسقط و عمان کے سلطان کے تحت تھا۔ اس میں ملوث بین الاقوامی مسئلے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ایسی ریاست میں جو

اپنا وجود ہی نسلی، لسانی اور ثقافتی تشخص کی بنیاد پر رکھتی ہو کابل کے "پختونستان" میں ڈیورنڈ لائن کے مغرب یعنی افغانستان میں رہنے والے پانچ ملین یا اس سے بھی زیادہ پٹھان شامل نہیں ہیں۔

۱۹۴۸ء سے مجوزہ ریاست کی طرف سے پراپیگنڈا کی ایک محتاط اور شدید مہم بیرونی دنیا میں چلائی گئی ہے اور اس کے اہم ذرائع افغان سیاسی عملے اور ادارے رہے ہیں۔ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ نقشے چھاپے گئے ہیں اور "پختونستان" کے شہری، بین الاقوامی محفلوں میں شریک ہوئے ہیں۔ ریڈیو کابل نے قبائل کو متاثر کرنے کے لئے نشریات کا زیادہ وقت "پختونستان" کی واقعاتی خبروں اور پشتو میں پاکستان کے خلاف مواد کو دیا ہے۔ یہ بوچھاڑ ۵۹ - ۵۶ ۱۹ء کے دور میں کافی حد تک کم ہو گئی جب کابل اور کراچی بتدریج ایک مصالحت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لیکن ۶۱ - ۱۹۶۰ء میں یہ پھر تیز ہو گئی، جب تعلقات ایک دفعہ پھر بگڑنے لگے۔

شروع شروع میں پاکستانی افسر "پختونستان" کی تحریک سے انکار کرتے رہے اور اس کے محرکات کی مذمت کرتے رہے۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کہا کہ "ایک نام نہاد آزاد پختونستان"، کا مطالبہ افغانستان میں چند افراد کے ذہنوں کا ایک شوشہ ہے"[1] بعد ازاں پاکستان نے اس پوری ایجی ٹیشن کو ایک بیکار

---

[1] ڈیبیٹس آف دی کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی آف پاکستان، کراچی ۹ جنوری ۱۹۵۰ء

افغان واہمہ کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جو حسد، نفرت، اور ہندوستانی اور شاید روسی بل بوتے کی بناء پر پیدا ہوا ہے۔ کراچی اس کے حل کے لئے جو تجاویز دیتا تھا وہ "اخوت اسلامی" اور "مسلمانوں کے استحکام" کی پرزور اور دل خوش کن اپیلیں ہوتی تھیں۔ عام طور پر کراچی افغان افسروں کے ساتھ "پختونستان" پر بات کرنے سے انکار کرتا رہا ہے۔ گو اس مسئلے کے وجود کا ایک بالواسطہ اعتراف ایک کمیونک میں شامل تھا جو وزیر اعظم داؤد کے دورے کے بعد ۱۹۵۷ء میں کراچی میں جاری کیا گیا ۱۹۶۰-۶۱ء میں صدر ایوب نے ایک سخت پالیسی اختیار کی جس کے تحت افغانوں کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ انہیں اپنے اس مطالبہ کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ اگر وہ اسی پر اڑے رہے۔ اب تک اس کا نتیجہ پراپیگنڈا اور قبائلی ہل چل کی شدت کی صورت میں ہی نکلا ہے۔

پختونستان کا کوئی بامعنی بیان آسان نہیں ہے۔ اس کا بیشتر حصہ صورت تو ہے لیکن ہیولے سے محروم اور صورت بھی وقتاً فوقتاً بدلتی رہی ہے۔ اس کُل کے اندر اتصال پذیری کی مقدار کا صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ تاہم بعض اہم عوامل اس سے منسلک ہیں۔ کابل کے مطابق "پختونستان" کی حکمران جماعت ایک صدر جس کے تحت کئی سربراہان محکمہ جات ہیں اور ایک نیشنل

اسمبلی پر مشتمل ہے۔ اسمبلی جنوبی، وسطی اور شمالی حصوں میں تقسیم ہے۔ سالہا سال تک فقیرایپی اسکا صدر رہا۔ اس کے محکمانہ سربراہ بھی اسی کے ساتھ گورویخت کے چٹانی غاروں میں رہتے تھے۔ یہیں خوراک اور اسلحہ کے ذخائر تھے اور ایک چھوٹا سا پشتو پرنٹنگ پریس تھا جو ایک ماہنامہ چھاپتا تھا، لیکن اصل میں اس کا حکم ۵۰۰ مربع میل سے بھی کم پر چلتا تھا۔

۱۹۵۴ء کے محکمانہ سربراہوں میں قابلِ ذکر محمد ظاہر شاہ اور رمضانی تھے۔ ان میں سے اول الذکر داخلی امور کی سربراہی کی بے حوصلہ حیثیت پر فائز تھا، اور آخرالذکر نشرواشاعت کا سربراہ اور کبھی کبھار قومی اسمبلی کے وسطی حصہ کا بھی صدر ہوتا تھا۔

قومی اسمبلی جسے قبائلی کبھی کبھار لوئے جرگہ کہتے تھے ہر بڑے پہاڑی قبیلہ سے ایک دو ممبران اور پاکستان کے زیرانتظام ضلعوں میں سے چند افراد پر مشتمل تھی۔ اس کا جنوبی حصہ گورویخت وسطی حصہ تیراہ اور شمالی حصہ دریائے کابل کے اوپر مہمند علاقے میں مرکوز ہے۔ اجلاس شاذونادر ہی ہوتے ہیں اور کسی قسم کا کاروبار شاید ہی ہوتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ "پختونستان" کی پوری حکومتی تنظیم" عمل کی بجائے نظری طور پر ہی موجود ہے اور نظری طور پر بھی اکثر یہ آئیں بائیں شائیں ہی ہے۔

"پختونستان" کے لیڈر پاکستان کے جلاوطن کردہ ہیں۔ ان میں

سے اکثر اپنا بیشتر وقت کابل میں گزارتے ہیں جہاں وہ "قبائیل" یعنی افغان وزارت قبائلی امور کی ذمہ داری ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنے علاقوں میں ہوتے ہیں تو مقامی افغان افسران کی حمایت و کفالت کرتے ہیں۔ اکثر "پختونستانی" لیڈر اپنے اپنے قبائل میں خاصی شہرت کے مالک ہیں لیکن ڈیورنڈ لائن کی پاکستانی طرف ان کے اثر و رسوخ کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

۱۹۵۴ء میں "پختونستانی" ملوک میں کوکی خیل آفریدیوں کا سابقہ سرکردہ ملک ولی خان[1] کوکی خیل آفریدیوں کا سعید احمد، ایک مہمند صاحب سیف و قلم میرا جان سیال، ایک اور مہمند امین جان، ایک محسود اورنگ زیب خان، بلوچستان کا ایک اچکزئی سردار ایوب خان، فقیر ایپی کا ایک پرانا محسود نائب ملا جنگوی تبیر علی ضلع مردان کی تحصیل صوابی کا جلا وطن محمد ارباب خان اور آدم خیل آفریدی، عجیب خان (جس نے کوہاٹ سے مولی ایلس کو اغوا کر کے نام کمایا تھا۔ (دیکھئے باب ہفتم) کا بھائی شاہزادہ خان شامل تھے۔

انفرادی طور پر یہ مؤثر شخصیات ہیں اور اجتماعی طور پر ایک مؤثر اسمبلی۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کی طاقت روایتی قبائلی

---

[1]- ولی خان ۱۹۵۹ء میں واپس آگیا اور حکومت پاکستان سے صلح کر لی۔

رشتوں اور تقاضوں پر مبنی ہے نہ کسان کے پیروؤں کی "پختونستان" سے وفاداری پر۔ آج تک ایسے کوئی آثار نہیں ہیں کہ کچھ زیادہ قبائلی اس جھنڈے تلے جمع ہونے پر تیار ہیں جس نے ان کے ملوک کو اکٹھا کیا ہے۔ تاہم تیراہ، مہمند علاقے کے بعض حصوں اور گوروینت کے ارد گرد باغی ملوک اپنا کچھ نہ کچھ اثر ڈالنے کے لائق ہوئے ہیں۔

اپنے قومی علاقے کے ان چھوٹے چھوٹے حصوں میں پاکستان اپنا براہ راست اختیار قائم کرنے پر مائل اور شاید اس کا اہل ثابت نہیں ہوا۔ یہ کتنا بھی غیر اہم سہی لیکن ان نقطہ ہائے اختلاف کا مسلسل وجود راولپنڈی کے پہلو کا ایک کانٹا ہے اور "پختونستان" کو حقیقت کا شائبہ دے دیتا ہے۔ "پختونستان" کے باقی مبینہ علاقوں میں کہیں بھی ایسی صورتحال موجود نہیں ہے کیونکہ وہاں پاکستانی نظم ونسق مکمل طور پر اور بلا مقابلہ کارگر ہے۔

"پختونستان" کے متعلق قبائلی اکثریت کے احساسات کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن ۱۹۴۸ء سے لے کر اب تک تحریک کے لئے عوامی حمایت کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ سرحد پار سے کرائی جانے والی خفیہ ایجی ٹیشن جاری ہے لیکن مصنف ۱۹۵۱-۵۴ء کے طویل دوروں کے دوران نئی ریاست کے لئے کوئی اہم مقامی حمایت نہ دیکھ سکا حتیٰ کہ وہاں بھی یہ نظر نہ آئی جہاں پاکستانی تخویف کا شبہ نہ تھا۔

تحریک "پختونستان"۔ بیرونی دنیا کو صرف افغان ذرائع ابلاغ کے واسطے سے پیش کی گئی ہے۔ ایک غیر ملکی کے لئے اس تحریک تک رسائی بھی افغان افسر شاہی کی ہی مرہون منت ہے۔ حالیہ سالوں میں تحریک کا ایک سرگرم افغان علمبردار سردار نجیب اللہ خان تھا (اب ریٹائر شدہ) جو یکے بعد دیگرے نئی دہلی، لندن اور واشنگٹن میں سفیر رہا۔ نجیب اللہ نے پاکستان کے ساتھ ۱۹۴۷ء کے اواخر اور ۱۹۴۸ء کے اوائل میں ایک مشن کے سربراہ کی حیثیت سے کراچی میں اولین مذاکرات کئے تھے۔ ایک اور افغان افسر، عبدالرحمان پژواک نے مسئلہ "پختونستان" میں اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ حال ہی میں اقوام متحدہ میں افغان وفد کا سربراہ رہا ہے۔ پژواک نے ایک قلمکار کی حیثیت سے اس مقصد کے لئے متعدد کتابچے تحریر کئے جب وہ لندن میں پریس اتاشی تھا۔[1]

افغانستان کے اندر "پختونستان" کے ساتھ رابطہ کابل کے توسط سے ہوتا ہے۔ جسکا قابل ناظم میر شمس الدین مجروح سرحد کے دو طرفہ قبائلی معاملات سے گہرا رابطہ رکھتا ہے۔ مذکورہ بالا کثر

---

[1] مثلاً پژواک، عبدالرحمان "افغانستان" (لندن، افغانستان انفارمیشن بیورو ۱۹۵۲ء) "دی پختونستان کریسینٹ" (سسکس، دی کی پریس) "پختونستان" (لندن۔ افغانستان انفارمیشن بیورو، سال ندارد)

ملوک غیر ملکیوں سے انٹرویو کے لئے عموماً کابل میں موجود ہوتے ہیں
۱۹۵۴ء میں تقریباً بیس سال میں پہلی دفعہ ایک غیر ملکی نامہ نگار
گور دیخت میں فقیر ایپی سے مل سکا اور اس نے "صدر پختونستان"
کو واقعی بہت سنجیدگی سے دیکھا۔[1] تھوڑے عرصہ بعد دو روسی افسر
میسرز ایگز ووچ اور ڈیمر ووچ نے (جو کابل میں ایک ٹیکنیکل مشن
کے ممبر تھے) بھی فقیر سے اس کے صدر مقام میں ملاقات کی۔[2]

"پختونستان" کے لئے سرمائے کا اہم ذریعہ افغان حکومت
ہے۔ قوی احتمال ہے کہ کچھ عرصے کے لئے ہندوستانی ذرائع سے
بھی امداد ملتی رہی بلکہ ایک وقت تو یہ اطلاع ملی تھی کہ نئی دہلی
کابل کے توسط کی بجائے ایپی کو براہ راست ادائیگی کے لئے کوشاں
تھا ۵۳-۱۹۵۲ء میں ایپی کو روپے کی فراہمی بہت کم ہو گئی
اور افواہیں پھیل گئیں کہ ایپی اور کابل کے "پختونستان" رہنماؤں کے
درمیان تعلقات منقطع ہو گئے تھے لیکن ۱۹۵۴ء میں جنوبی
صوبہ کے افغان گورنر، فیض محمد کے توسط سے وظائف بظاہر
بحال کر دیئے گئے۔ آج تک یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ تحریک

---

[1] - کرسٹوفر اینڈ "اور فار فلنگ کا رپیا نڈ مٹس، فرام دی سویٹ ٹو دی بیٹر" دی نیو یارکر، ۱۹ فروری ۱۹۵۵ء، ص ص ۱۰۰ تا 115

[2] ملاقات کا ایک قدرے مبالغہ آمیز بیان نیو یارک ٹائمز ۹ فروری ۱۹۵۵ء میں چھپا۔

بُختونستان" کو کسی اور بیرونی ذریعہ سے بھی مالی امداد ملی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق کل رقم کتنی بھی ہو وہ بہرحال اس رقم سے کم ہے جو پاکستان اپنے وفادار قبائل پر وظائف کی صورت میں خرچ کرتا ہے۔

"پختونستان" کی حمایت افغان افسرشاہی کے اعلیٰ ترین طبقے تک کی جاتی ہے۔ قبائلیوں کا کابل میں استقبال کیا جاتا ہے اور چھٹیوں میں ظاہر شاہ انہیں برسرعام اعزاز بخشتا ہے۔ وزیراعظم داؤد محمد خان نے اپنی حیثیت اور ذاتی وقار کو نہایت گہرے طریقے سے اس تحریک سے منسلک کر دیا ہے اور اس کے سلسلے میں اس کی آزادیٔ عمل قدرے محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

عملاً سرحد کے خلاف "پختونستان" کا دباؤ تقریباً قبائلی علاقے تک ہی محدود رہا ہے۔ مختلف اوقات پر اس میں ایجنسیوں کے لئے نامزد پاکستانی افسروں کے قتل کے لئے معاوضوں کی پیشکش بھی رکھی گئی ہے۔ لشکر ۵۴-۱۹۵۰ء کے عرصے میں کبھی کبھار پاکستانی علاقے پر حملے بھی کرتے رہے تاکہ "پختون جھنڈا" نصب کرنے کے لئے حمایت حاصل کی جا سکے۔ غالباً ان میں اہم ترین ۱۹۵۲ء کے اوائل میں قلعہ جمرود کے قریب ۵ ہزار قبائلیوں کا اجتماع تھا جو زیادہ تر آفریدیوں اور شنواریوں پر مشتمل تھا اور اسی سال کے ماہ دسمبر میں ایک اتنا ہی بڑا لشکر نمودار ہوا جس نے پشاور

کوہاٹ روڈ کو کاٹنے کی کوشش کی۔ آخر الذکر کا علانیہ مقصد سندھ کے کناروں پر جھنڈا لگانا تھا۔ دونوں مہمات ملک ولی خان کی قیادت میں ہوئیں۔ ایک افغان مہمند لیڈر رحمٰن خان کے تحت مہمند لشکروں نے ۱۹۵۴ء میں سرحد عبور کی اور دریائے کابل کے شمال کے پاکستانی علاقے میں جرگے منعقد کیے۔

سرحد کی مقبول روایت کے مطابق "پختونستان" کے خلاف سرگرمیوں کی کبھی کبھار سزا بھی دی جاتی ہے ۱۹۵۴ء کے موسم خزاں میں پاکستان ائیر فورس کے ٹرکوں کے ایک ڈرائیور ٹریننگ کانوائے پر کوہاٹ اور بنوں کے درمیان گھات لگائی گئی تین ہوائی مارے گئے اور ایک کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں اس کارروائی کو دو سال پہلے ولی خان کے لشکر پر بمباری اور تیراہ میں اس کے گھر کی بموں کے ذریعے تباہی کا انتقام قرار دیا گیا۔

سکاؤٹوں اور خاصہ داروں کی وفاداری کو ختم کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ خیبر رائفلز کے کوئی ایک درجن ارکان ۱۹۵۳ء میں "پختونستان" چلے گئے اور بعد میں انہیں سرکاری خرچ پر کابل اور جلال آباد رکھا گیا۔ پاکستانی قبائل کے نمایاں رہنماؤں کو "پختونستان" حکومت میں مناصب جلیلہ اور فیاضانہ الاؤنسوں کے وعدے کیے گئے۔ چترال کے دو شہزادے، عزیز الرحمان اور اور محمد عثمان خان، ۱۹۵۰ء میں تحریک سے جا ملے لیکن واپس آگئے

اور ۱۹۵۳ء میں پاکستان سے وفاداری کا اعلان کیا۔ ایک سرکردہ مہمند ملک خان نورگئی نے موسم بہار ۱۹۵۳ء میں جلال آباد میں ایک اعزاز لینا قبول کیا لیکن ۱۹۵۴ء میں پشاور کے ایک دورے میں اس نے برسرعام پاکستان سے وفاداری کا اعلان کیا۔ ایک اور قابلِ ذکر نائب خلیفہ مہردل تھا جسے کسی وقت فقیرایپی نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ مہردل نے نومبر ۱۹۵۴ء میں بنوں میں اپنے ستر پیروؤں کے ہمراہ پاکستانی افسروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ ۱۹۳۶ء میں ٹوچی سکاؤٹس سے مفرور ہوکر فقیرایپی سے جاملا تھا اور اس وقت سے ایپی کا ایک بڑا نائب رہا تھا۔ (مہردل کا ہتھیار ڈالنا اور اعلان وفاداری غالباً سراسر رضاکارانہ نہ تھا کیونکہ جب اس نے صلح کا فیصلہ کیا تو وہ پاکستانی فوج کے نرغے اور محاصرے میں آچکا تھا۔)

جوڑ توڑ اور جوابی جوڑ توڑ جو دوطرفہ قبائلی لیڈروں اور افسروں کے درمیان جاری رہا ہے دلچسپ پہلوؤں سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً ۱۹۴۸ء میں کابل نے حضرت صاحب شوربازار کو قبائلی علاقے میں بھیجا تاکہ ان کی قابلِ احترام موجودگی سے "پختونستان" کو تقویت ملے۔ حضرت صاحب نے دعاؤں کے ساتھ ساتھ روپیہ بھی فراواں تقسیم کیا لیکن صرف سردمہری کا ردعمل ہوا۔ پاکستان کے خفیہ سفیروں نے جو حضرت صاحب کے

تقریری جرگوں میں موجود تھے۔ سابق مفتی اعظم یروشلم، الحاج محمد امین حسینی کا ایک پیغام پہنچایا۔ مفتی اعظم نے حضرت صاحب کو حکم دیا کہ وہ اسلامی اقوام کے درمیان منافرت نہ پھیلائیں۔ حضرت صاحب نے فن کے مسلمہ استاد کے سامنے سر تسلیم خم کیا، اور واپس کابل چلے گئے۔ یہاں افواہیں پھیل گئیں کہ انہوں نے قبائل کے لئے مرسلہ وظائف اپنی جیبوں میں ڈال لئے ہیں۔

اس قسم کی لگائی بجھائی اور کبھی کبھی کی سرحدی معرکہ آرائی اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود سرحد۔ یہ بٹوارے کے بعد بڑھتی گھٹتی رہی ہے اور یہ اپنے ایک نقطۂ عروج پر ۵۴ - ۱۹۵۰ء کے دوران پہنچی اور پھر اگلے پانچ چھ سال میں گھٹتی گئی یہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں پھر اٹھی جب باجوڑ میں جم کر لڑائیاں ہوئیں اور پاکستان نے نواب دیر کو معزول کر دیا۔ کافی حد تک کسی ایک وقت میں پیدا کردہ دباؤ کا انحصار خود سرحد کی بجائے کراچی اور کابل پر ہے۔ اس سے نہ صرف دلجوئی عملاً ناممکن ہو جاتی ہے بلکہ مدت مدید تک انتشار و خلفشار خود افزا بن جاتا ہے اور آسانی سے قابو سے باہر بھی ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں "پختونستان" کا ایک خطرناک ترین حربہ کابل کا خوشحال خان سکول ہے۔ سکول مغل شہنشاہ بابر کے مزار کے پاس مضافات میں ایک پہاڑی پر واقع ہے ۱۹۵۴ء میں اس

ہیں چھ تا اٹھارہ سالہ قریباً ۵۰۰ طلباء تھے۔ ایک سو مزید فارغ التحصیل طلباء خوشحال خان ہوسٹل میں رہتے تھے اور کابل کے مختلف افغان کالجوں میں پڑھتے تھے۔

قریباً یہ تمام لڑکے اپنی تعلیم، خوراک اور رہائش افغان حکومت کے وظائف سے حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر پاکستان کے قبائلی علاقہ سے ہیں۔ خوشحال خان سکول دیگر افغان تعلیمی اداروں کے برعکس جو وزارت تعلیم کے تحت ہیں، براہ راست کابینہ کے تحت ہے۔ سہولیات اور معیار تعلیم غالباً افغانستان میں بہترین ہیں ذریعہ تعلیم پشتو ہے اور زور پٹھان تاریخ، ادب اور روایت پر دیا جاتا ہے۔ عام ثانوی مضامین نیز انگریزی اور اسلامیات بھی پڑھائے جاتے ہیں۔

عام طلبائ اکٹھے پٹھان ثقافت سے مملو فضا میں رہتے ہیں۔ تمام اہم قبائل کے لڑکے ایک دوستانہ مساوات کی بنیاد پر اکٹھے بیٹھتے ہیں جو ان کے آباؤ اجداد میں معدوم اور ناقابل تصور تھی۔ پختون ولی کے روایتی تصورات جو گھروں میں بنیادی طور پر بین القبائلی مناقشات کے لئے سمجھے اور استعمال کئے جاتے ہیں یہاں ایک پٹھان قوم کے نقطۂ نظر سے پڑھائے جاتے ہیں۔

کم از کم خوشحال خان سکول میں ایک حقیقی پٹھان قومیت کا تصا

پذیر ہوئی ہے۔ اسے نہایت احتیاط سے پروان چڑھایا جا رہا ہے اور ایک اہم اور توجہ طلب مشن کا احساس لڑکوں کے ذہنوں میں تاثر پذیر عمر میں پیدا کر دیا جاتا ہے۔ بعض "پختونستان" کے مخالف پاکستانی ملوک تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنے بیٹوں کو اپنی میراث کی منفت تعلیم کے حصول کے لئے بھیجتے ہیں جو ان کی پاکستانی طرف کی تعلیم سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہ لوگ اس خیال کو خاطر میں نہیں لاتے کہ ان کے بیٹے ان کے برعکس سیاسی خیالات اخذ کر سکتے ہیں۔

اس یقین کا جواز مشکوک ہے۔ لڑکے لازماً اپنی گھریلو آبادیوں میں لیڈر بن کر ابھریں گے۔ جب گروہ یکے بعد دیگرے سکول سے نکلیں گے تو وہ بربنائے استحقاق مسلسل اہمیت کی ایک طاقت ہوں گے، ان ملوک سے کہیں زیادہ جو اب تحریک "پختونستان" کے سربراہ ہیں اور جن کی شدید موقع پرستی انہیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ کسی وقت بھی سرحدی مسئلے کا حل قبول کر لیں جو راولپنڈی یا کابل کے لئے تسلی بخش ہو۔ خوشحال خان سکول کی بنیادیں کتنی بھی مصنوعی ہوں لیکن اس کے نتائج خود قبائل سے باہر کسی کے بھی قابو میں نہ رہیں گے۔

خوشحال خان سکول سے کبھی کبھار لڑکے فرار بھی ہوئے ہیں جیسا کہ دنیا میں ہوتا ہے لڑکے یہاں سے بھی اپنے گھروں کو بھاگ جاتے ہیں ۱۹۵۴ء میں ایک گروہی فرار اتنا اہم تھا کہ افغان وزیر اعظم

خود سکول میں آیا اور طلبا کو ان کی ناشکری پر لیکچر دیا، لیکن گروہ کی اکثریت "پختونستان" سے نہایت مخلصانہ اور دیوانہ وار عقیدت رکھتی ہے۔ ان میں سے اکثر ایک وسیع سیاق و سباق میں اس کی عدم حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

تحریک "پختونستان" کے وسیع مضمرات کا واضح مظاہرہ ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ اس سال کے شروع میں پاکستان میں مغربی پاکستان کے صوبوں کو ایک صوبہ وَن یونٹ میں مدغم کرنے کا عمل شروع ہوا۔ ان میں سے بعض تحتی یونٹ افغان دعوائے "پختونستان" میں بھی شامل تھے اور کابل میں اس پر ردِ عمل بہت متشددانہ تھا یہ ردِ عمل ۲۸ مارچ کو افغان وزیرِ اعظم داؤد خان کی ایک آتش ناک تقریر کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اگلے دن افغان ہجوم پولیس سے بے خوف، جلال آباد اور قندھار کے پاکستانی سیاسی اداروں اور کابل میں سفارت خانے پر حملہ آور ہوئے اور انہیں لوٹ لیا۔

پاکستان نے بھی اسی زور سے جواب دیا۔ پشاور میں افغان قونصل خانہ پر حملہ ہوا۔ جنوبی وزیرستان میں ایک محسود جرگہ اور شمالی وزیرستان کے ۱۰ ہزار قبائلیوں کے نمائندہ ملوک کے ایک جلسہ نے قومی عزت کو بحال کرنے کے لئے کابل پر حملہ کی اجازت مانگی۔ پاکستانی پریس میں افغانی تخت پر موجودہ خاندان کے حق

کا سوال کھلم کھلا اٹھایا گیا۔ افغان درآمدات براستہ پاکستان پر غیر سرکاری پابندی لگا دی گئی۔ افغان سیاست کاروں کو واپس بلا لیا گیا۔ جب کئی سالوں کے بعد سرحد کشمیر پر پاکستانی اور ہندوستانی فوجوں میں ایک بڑی سرحدی ٹکر ہوئی تو کراچی میں افغان ہندوستانی قینچی چال کا دیرینہ خوف عود کر آیا۔ کئی ماہ کی مصالحتی کوششوں کے بعد جوزیادہ تر سعودی عرب نے کیں ایک سمجھوتہ نہ ہو سکا لیکن "پختونستان" کی ایک بڑا بین الاقوامی بحران پیدا کرنے کی صلاحیت کا کھل کر مظاہرہ ہو چکا تھا۔

دوسرا مظاہرہ ۱۹۶۱ء کے موسم خزاں میں ہوا جب باجوڑ میں افغان حمایت سے ہونے والی قبائلی ایجی ٹیشن اور پاکستان کے جوابی اقدامات سے دونوں ممالک کے لئے بین الاقوامی سرحد بند کر دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانستان رسل و رسائل اور حمل ونقل کے لئے قریباً مکمل طور پر سویٹ یونین کا دست نگر ہو گیا اور امریکی امدادی پروگرام، رسد اور ساز و سامان میں لازمی طور پر کمی ہو گئی جو عموماً پاکستان کے راستے فراہم ہوتا تھا لیکن افغانوں نے خواہ پہلے ہی زبردست روسی اثر و رسوخ میں مزید اضافہ کو پسند نہ کیا ہو وہ "پختونستان" پر سمجھوتہ کی بجائے اس اضافے کو قبول کرنے پر رضامند ہو گئے۔

خلاصہ کلام یہ کہ "پختونستان" بحیثیت ایک قومی وجود

درحقیقت کوئی بنیاد نہیں رکھتا۔ یہ اقتصادی، سیاسی اور جغرافیائی لحاظ سے ناقابلِ عمل ہے جہاں تک اس کے قومی تحریک ہونے کا تعلق ہے یہ وقت سے پہلے ہے کیونکہ قبائلیوں کی بہت بڑی اکثریت اس سے بے نیاز ہے، لیکن یہ ایک حساس سرحد پر ایک مسلسل ذریعۂ ہیجان ہونے کی وجہ سے ایک حقیقی اہمیت کا حامل ہے اور وسیع تر آویزش کا ایک خطرناک ہتھیار ہے۔ "پختونستان" افغانستان کے دو اہم اور دیرپا مسائل کو حل کرنے کی کوشش کا مظہر ہے۔ گمشدہ علاقوں کی بازیابی کی تاریخی تڑپ اور قومی تحفظ کا ایک زبردست اور غیر ذمہ دارانہ خطرے سے بچاؤ۔ یہ تحریک پاکستانی افغان تنازعہ کی ایک وجہ بھی ہے اور اس کا ماسکہ اور محور بھی۔ اگر بنیادی مسائل کا کوئی حل ممکن ہے تو وہ ابھی پردۂ مستقبل میں پوشیدہ ہے۔ سرحد نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک معلق انفجار کی ہوشربا کیفیت میں بھی طویل عرصے تک ہوش و حواس بحال رکھ سکتا ہے اور ایسی صورت حال اکثر اس کے باشندوں کے مزاج اور فائدہ طلبی کے عین مطابق ہے۔

---

(۱۷) باب سیزدہم

"عظیم مقابلہ" جاری ہے

تعارف:۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، ۱۹۰۷ء کے اینگلو رشین معاہدہ پر دستخطوں کے بعد روس اور انگلستان کے درمیان "عظیم مقابلہ" میں کچھ وقفہ پیدا ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں ایران میں مقابلے کا مختصر سا احیاء ہوا لیکن سرحد اور اس کے ساتھ متعلقہ علاقے زار حکومت کے باقی ماندہ چند سالوں میں پرامن رہے۔

لیکن بالشویک حکومت کے قیام کے قریباً فوراً ہی بعد وسط ایشیا پر گرفت کی روایتی جدوجہد پھر شروع ہوگئی۔ بدقسمتی سے "عظیم مقابلہ" کے بیسویں صدی کے دور پر نئی روشنی ڈالنے والے بہت سے دستاویزات سویٹ اور برطانوی آثار خانوں میں دستیاب نہیں ہیں۔ لہٰذا واقعات کا جو خاکہ آگے دیا گیا ہے وہ کسی حد تک جزدیاتی ہے۔ جہاں تک یہ خالصتاً سرحد پر اثر انداز ہونے والے

معاملات مرکوز ہے۔ یہ صرف ایک ہی حصّہ پر حاوی ہے جو لازماً
اہم ترین حصّہ نہیں یعنی وہ حصّہ جو پہلی جنگ عالمگیر کے بعد کے
عشرے میں سامراجی برطانیہ اور سوویٹ یونین کی آویزش سے متعلق ہے۔

ٹرانس کا کیشیا میں مداخلت:۔

بالشویک انقلاب کے بعد اتحادیوں نے روس میں جتنی مداخلتیں
کیں برطانیہ کا ان تمام میں نمایاں ترین کردار تھا۔ لیکن نہیں یہاں جس
واحد مداخلت سے براہ راست سروکار ہے وہ ۱۹۱۸ء کے موسم گرما
میں ٹرانس کا کیشیا کے علاقے میں کی گئی۔

اس وقت وسط ایشیا پر برطانوی تردّد و تفکّر کی فوری
وجوہات دو تھیں، ہزاروں جرمن، آسٹروی، ہنگری اور روسی
جنگی قیدی جو زار حکومت نے ترکستان میں قید کر رکھے تھے بالشویکوں
نے روس کو جنگ سے باہر نکالتے ہی رہا کر دیئے۔ یہ لوگ ترکستان
میں آوارہ پھر رہے تھے، اور کوششیں کی جا رہی تھیں کہ انہیں نئے
لڑاکا یونٹوں میں منظّم کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ ترک جو مشرق
وسطیٰ میں شکستوں سے دوچار ہونے کے باوجود ابھی تک برسرپیکار
تھے، بحرۂ کیسپئن تک پہنچنے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ واقعات نیز
نوآبادیاتی علاقوں کی آزادی کے متعلق بیانات جو بالشویکوں کی
طرف سے پہلے ہی دیئے جا رہے تھے۔ لندن میں سلطنت ہند کے

لئے ایک معنی تیز اور لامکانی خطرہ قرار دیئے گئے۔

یہ خطرہ افغانستان میں جرمن سرگرمیوں کی وجہ سے شدید ہوگیا جہاں غیر معمولی طور پر قابل دِس مُس، فان نیڈر میئر اور فان ہنٹگ قبائل کو یقین دلا رہے تھے کہ اس حملے میں ترکستان کے جنگی قیدی ان کی حمایت کریں گے۔

انگریزوں نے بزبان سر اولف کیرو "ہندوستانی قلعہ کے پشتہ کے دور دراز ترین لیکن قابلِ رسائی مقام پر کم سے کم ممکنہ فوج کے استعمال سے[1] اس خطرے کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ حقیقت کہ پشتے پر جو مقام چُنا گیا وہ کسی اور کے قبضے میں تھا کارروائی کے راستے میں حائل نہ ہونے دی گئی۔

دو چھوٹی چھوٹی برطانوی فوجیں عراق اور ایران سے وسط ایشیا کی ابتر صورت حال میں داخل ہوگئیں جہاں سرخ، سفید اور ترک فوجیں ایک جنگ مابقت لڑ رہی تھیں۔ دونوں برطانوی فوجیں اپنی ساخت پرداخت میں اینگلو انڈین تھیں اور ان میں گائیڈز جیسے مشہور و معروف بہ "نارتھ ویسٹرن کارڈن" جنرل میلیسن کے تحت مشہد سے روانہ ہوئی۔ مرو پر قابض ہوئی لیکن تاشقند پر قبضہ

---

[1] - سر اولف کیرو "سوویٹ ایمپائر دی ٹرکس آف سنٹرل ایشیا اینڈ سٹالنزم" (لندن، میکملن ۱۹۵۱ء)، ص ۱۱۵

کرنے میں ناکام رہی۔ لیکن اس نے منشویکوں کے تعاون سے کچھ وقت پر ٹرانس کیپیئن ریلوے پر قبضہ جما لیا اور اس طرح تاشقند کی بالشویک حکومت اور اس کے یورپی روس میں جنم داتا گروہ کے درمیان مواصلات کو منقطع کر دیا۔ دوسری فوج المعروف بہ "ڈنسٹر فورس" میجر جنرل ڈنسٹرویلے کے تحت بغداد سے ساحل کیسپئن پر واقع انیزلی (پہلوی) کو روانہ ہوئی اور ۱۶ اگست ۱۹۱۸ء کو باکو چلی گئی جہاں ایک ڈانواں ڈول سوویٹ حکومت قائم کی گئی تھی۔ ایک ماہ کے اندر اندر دونوں برطانوی اور سوویٹ فوجیں انور پاشا کے ایک بھائی نوری پاشا کے ایک غیر متوقع ترک حملے میں باہر دھکیل دی گئیں۔ نوری پاشا نے بعد میں وسط ایشیا کے لئے جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔

باکو سے پسپائی پر متعدد سوویٹ کومسار (دار وغہ رسد رسانی۔ مترجم) سفید جرنیل ڈینی کن نے گرفتار کر لئے جس کے ساتھ انگریز تعاون کر رہے تھے۔ چھبیس کومساروں کو ہندوستان میں جلا وطنی کی سزا دی گئی۔ انہیں سفر کے لئے کراسنوو سک سے ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور پھر فوراً ہی انہیں قصبے کے باہر اتار کر گولی مار دی گئی۔ دریں اثناء برطانوی فوج نے جو انیزلی واپس آگئی تھی جنرل ڈینی کن کی مدد کی تاکہ وہ روسی کیسپئن بیڑے پر قبضہ کر سکے جو وہاں بندھا ہوا تھا اور اسے بالشویکوں کے خلاف استعمال کے لئے دوبارہ

ٹھیک ٹھاک کرے۔ بیشتر اس کے کہ بیڑہ حرکت میں آتا اسے ایک سرخ بحری افسر، ایف ایف راشکولی کوف نے ایک دلیرانہ چال سے سوویٹ روس کے لئے قبضہ لیا جس کا ذکر آگے بھی آئے گا۔[1]

ان دونوں واقعات میں برطانوی کردار مداخلتوں کے خاتمہ کے مدتوں بعد تک بالشویکوں نے یاد رکھا اور اس پر تیز و تند نفرت کا اظہار کرتے رہے۔ بعض سوویٹ لیڈروں نے بعد میں اصرار کیا کہ کومساروں کی موت کے ذمہ دار انگریز تھے۔ سوویٹ حکومت نے خود اپنے ایک نوٹ مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۲۳ء میں اس مسئلے کو اٹھایا جس میں بالشویکوں کی انگریز دشمن سرگرمیوں کے الزامات کی تردید کی گئی تھی۔[2]

---

[1]- ایگزینیا جے یوڈین اور ہیرلڈ ایچ فشر "سوویٹ رشیا اینڈ دی ویسٹ" ۱۹۲۰ تا ۱۹۲۷ء "اے ڈاکومنٹری سروے" دسٹریٹ فورڈ، یونیورسٹی، ۱۹۵۷ء) ص ۲۲۶ + ڈبلیو پی کوٹس اور زیلڈے کوٹس "آرمڈ انٹروینشن ان رشیا" ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۲ء (لندن، دی گلانیز، ۱۹۳۵ء) ص ص ۱۷ تا ۶۴ ۔

---

[2]- یوڈین اور فشر، ایضاً ص ۲۲۶ نیز پارلیمنٹری پیپرز ۱۹۲۳ء سی ایم ڈی ۱۸۷۴ء (رشیا نمبر ایک) "ایپلائی آف دی سوویٹ گورنمنٹ ہز مجسٹیز گورنمنٹ ریکارڈنگ دی ریلیشنز بٹوین دی ٹو گورنمنٹس" ص ۷

کاشغر میں برطانوی سرگرمی :-

دریں اثناء انگریز وسط ایشیا کے ایک اور کلیدی علاقے میں بھی بالشویکوں کی مصمم مخالفت کر رہے تھے۔ ۱۹۱۸ء کے موسم بہار میں وسط ایشیائی امور میں تجربہ کار ایک سہ رکنی مشن چینی ترکستان میں کاشغر کے برطانوی قونصل خانہ کو بھیجا گیا۔ اس کے دو افسر، لیفٹیننٹ کرنل ایف۔ ایم۔ بیلی اور میجر ایل۔ وی۔ ایس بلیکر اگست میں تاشقند چلے گئے تاکہ وہاں کی بالشویک حکومت سے رابطہ قائم کریں اور اس کی طاقت اور عزائم کا پتہ چلائیں[1]۔ تیسرا افسر، لیفٹیننٹ کرنل پرسی ایتھرٹن سر جارج میکارٹنی کی جگہ کاشغر میں قونصل جنرل بنا۔

تاشقند میں بیلی کو جو سلوک ملا وہ بعید از دوستی تھا۔ کیونکہ سوویٹ حکومت کیپٹن کے علاقے میں برطانوی فوج کے حملے سے خائف تھی لہٰذا اسے فوراً ہی تحت الزمین جانا پڑا۔ کئی ماہ کے محیرالعقول تجربات کے بعد بیلی اپنے آپکو پکڑنے کے لئے بالشویک خفیہ سروس میں بھرتی ہو کر براستہ بخارا ایران بچ کر نکل گیا۔

تاشقند علاقے میں رہتے ہوئے اس نے جاسوسی کا ایک خاصا

---

[1] دیکھئے بیلی کا اپنی مہمات کے متعلق اپنا بیان فریڈرک ایم۔ بیلی "مشن ٹو تاشقند" میں (لندن! جوناتھن کیپ، ۱۹۴۶ء)

پھیلا ہوا ادارہ قائم کیا اور سفید جرنیل کارنی لوف کے ساتھ بھی رابطہ قائم رکھا اور خوقند میں ارگاش کے تحت اٹھنے والی نوخاستہ بسماچی تحریک کے ساتھ بھی۔

دریں اثناء کاشغر میں ایتھرٹن نے چینی حکام کو آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر بالشویکوں کی مخالفت کریں۔ اس نے بھی جلد ہی جاسوسی کا ایک جال پھیلا دیا جس نے بخارا اور فرغانہ میں سوویٹ دشمن فوجوں کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور زیر چینی ترکستان میں مشتبہ بالشویک گماشتوں اور خیر خواہوں کی تلاشیاں لیں اور انہیں قید میں ڈالنے کے لئے چینیوں کے حوالے کر دیا۔ ایتھرٹن نے خود بھی کاشغر میں مبینہ بالشویک نہاں خانوں پر چھاپے مارے اور عمومی طور پر شہر میں حکومت کی بہت سی ذمہ داریاں سنبھال لیں[1]

روس کے خلاف ایک اخبار اور پراپیگنڈا سروس چلانے کے علاوہ بہادر کرنل بالشویکوں کو چینی سوتی پارچات کی برآمد رکوانے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے کئی سوویٹ مشن بے نیل و مرام واپس بھجوا دیئے جو کاشغر میں چینی حکام سے رابطہ قائم کرنے آئے تھے۔ اس مفروضے پر کہ یہ بالشویک حمایت یا کم از کم منظوری سے ہوتی تھی اس نے یارقند اور سرحد کے درمیان افغانوں اور پٹھانوں کی اسلحہ کی

1- پرسی تھامس ایتھرٹن "ان دی ہارٹ آف ایشیا" بوسٹن ۱۹۲۶ء ص ۶۲

منافع بخش تجارت میں بھی روڑے اٹکائے[۲۱]

ایتھرٹن ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے پورے دو سال کاشغر میں رہا۔ آخر الذکر سال میں وہ خوفزدہ امیر بخارا کے ساتھ خط و کتابت کرتا رہا جس نے امیر کے ۲۵ ملین پونڈ کے ذاتی اثاثے بالشویکوں سے بچانے کے لئے برطانوی ذمہ داری کے بدلے بخارا سلطنت برطانیہ کے حوالے کرنے کی پیش کش کی۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں ایتھرٹن نے بادل ناخواستہ اس پیش کش کو اس بناء پر ٹھکرا دیا کہ کچھ عرصہ پہلے فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ مختلف بالشویک مخالف تنظیموں کو دی جانے والی امداد بند کر دی جائے"[۲۲]

امیر کی پیش کش کو ٹھکرانے کے باوجود ایتھرٹن نے اپنی سرگرمیاں اس وقت کا ملاً بند نہیں کیں۔ چند ماہ بعد جب ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کو اینگلو سوویٹ تجارتی معاہدہ پر دستخط ہو گئے تو اس نے تبصرہ کیا کہ اسے ایک الجھن میں ڈال دیا گیا تھا کیونکہ اسے پتہ نہیں تھا کہ معاہدہ (جو طرفین کو ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں سے روکتا تھا) زیرِ غور تھا اور "لہٰذا جوابی پراپیگنڈا کی بندش کے لئے راستہ ہموار کرنے کا کوئی موقعہ نہ تھا جس کے لئے اسے مامور کیا گیا تھا"[۲۳]

۲۱- ایضاً، ص ص ۱۲۳، ۲۲۹ تا ۲۳۰، ۲۶۸ تا ۲۷۱

۲۲- ایضاً، ص ص ۱۶۹ تا ۱۷۱

۲۳- ایضاً ص ص ۲۱۶ تا ۲۱۷

سوویٹ سرگرمی:

بالشویک اگرچہ اہل بھی ہوتے تو بھی انہیں مدا خلتوں سے براہ راست لڑنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ خود ہی جلد ہی اپنے ہی بوجھ تلے ٹوٹ پھوٹ گئیں، پھر بھی انہوں نے کوئی وقت ضائع کئے بغیر ایشیا میں انگریزوں سے دو دو ہاتھ کر لئے۔ جو آلات انہوں نے استعمال کئے وہ دورِ زاریت سے قدرے مختلف تھے اور عالمی رائے کی نئی آب و ہوا میں ان سے بھی خطرناک تر تھے۔

سابقہ زار سلطنت کے اندر اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لئے لڑتے ہوئے سوویٹ نظریہ پرستوں نے باقی ایشیا بالخصوص ہندوستان کی اہمیت کے متعلق عالمی اشتراکی انقلاب کے سیاق و سباق میں بے تکلفی سے اظہار کیا۔ پہلی جنگ عالمگیر کو ختم ہوئے ابھی تین ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے اور برطانوی فوجیں ابھی کیسپین کے علاقے میں تھیں کہ سٹالن نے مسلمان کمیونسٹوں کی ایک کانگریس ماسکو میں بلائی۔ اس نے انہیں کہا:

"آپ سے زیادہ آسانی اور تیزی سے کوئی اور مغرب اور مشرق کے درمیان پل تعمیر نہیں کر سکتا۔ یہ اس لئے کہ آپ کے لئے ایک دروازہ ایران، ہندوستان، افغانستان اور چین میں کھلا ہے ان ممالک کے لوگوں کی سامراجیوں کے چنگل سے آزادی.....

سامراج کی جڑوں کو اکھیڑ دے گی"۔[18]

مئی ۱۹۱۹ء میں پیپلز کمِسریٹ آف نیشنلٹیز کے سرکاری مجلہ وژن نیشنلسٹ کے ایک مقالہ میں تجویز کیا گیا کہ سٹالن کے پیچلنج کو اس طرح نافذ کیا جائے کہ ترکستان میں سوویٹ مسلمانوں کی خصوصی پلٹنیں قائم کی جائیں تاکہ مشرق میں برطانوی سامراج پر حملہ ہو سکے اور وہاں پراپیگنڈا کا ایک ایسا ادارہ کھڑا کیا جا سکے جو اس مقصد کے لئے "خصوصی طور پر تربیت یافتہ سفیروں" کو استعمال کر سکے۔ مقالہ اس بیان پر ختم ہوا "کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر نمودار ہونے والے قازق نیزے ماضی میں برطانیہ کے سینے کے کابوس بنے رہے تھے۔ اب روسی پرولتاریہ مسلمانوں کے نیزے ہوں گے جو ایران ہندوستان اور افغانستان میں ان کے بھائیوں کی امداد کے لئے نمودار ہوں گے۔[19]

---

[18]- وژن نیشنلسٹ، شمارہ ۳، ۲۴ نومبر ۱۹۱۸ء، ص ۲ بحوالہ الگزینیا بیجے یوڈین اور رابرٹ سی نارتھ "سوویٹ رشیا اینڈ دی ایسٹ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۷ء "اے ڈاکومنٹری سروے" دسٹینفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۷ء، ص ص ۷۷ تا ۷۸، وژن نیشنلسٹ پیپلز کمِسریٹ آف نیشنلٹیز کا سرکاری مجلہ تھا جس کا سربراہ اس وقت سٹالن تھا۔

[19]- ایضاً نمبر ۱۹، ۲۴ مئی ۱۹۱۹ء مقتبس از یوڈین اور نارتھ ایضاً، ص ۱۶۱

چند ماہ بعد لینن نے خود ترکستانی کمیونسٹوں کو ایک خط (مطبوعہ پراودا) میں کہا کہ وہ وسط ایشیا میں کمیونسٹ پارٹی کو مضبوط کریں "تاکہ ہم انگریزوں کی سربراہی میں قائم شدہ عالمی سامراج کے خلاف پوری ایمانداری اور تندہی سے لڑ سکیں"[1] نومبر ۱۹۱۹ء میں مسلمان کمیونسٹوں کی دوسری کانگرس ماسکو میں بلائی گئی۔ اس میں ایک قرارداد پاس کی گئی جس کے مطابق تیسری انٹرنیشنل "آئندہ ہندوستان، مصر، ترکی اور دیگر ریاستوں کو جو سامراج کے چنگل میں ہیں آزاد اور خودمختار تصور کرے گی"۔ یہ اعلان اس امید پر ختم ہوا کہ اس سے متعلقہ ممالک میں "انقلابی روح" بیدار ہو گی۔[2]

ایشیا میں انقلابی مہم کے لئے بالشویکوں کی تیاری ستمبر ۱۹۲۰ء میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی جب باکو میں اقوام ایشیا کی مشہور و معروف کانگریس بلائی گئی۔ یہاں بالشویک لیڈروں، زینوفیف، راڈک اور بافوتیج نے ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر قریباً دو ہزار ایشیائیوں کو انقلاب کی تلقین کی جن میں انور پاشا بھی شامل تھا۔

---

[1] - پیٹروگراڈ پراودا، نمبر ۲۵۹، ۱۳ نومبر ۱۹۱۹ء مقتبس از لیوڈین اور نارتھ ایضاً، ص ۱۶۰

[2] - دی انٹرنیشنلسٹ نمبر ۴، ۱۴ دسمبر ۱۹۱۹ء، ص ۲، بحوالہ لیوڈین اور نارتھ ایضاً ص ص ۱۶۴ تا ۱۶۵۔

زینوفیف نے مشرق میں ایک سرخ فوج کی تخلیق کو سراہا جو انگریزوں کے عقب میں ایک بغاوت شروع کرے گی.... اور ہر اس گستاخ انگریز افسر کو کاٹ ڈالے گی جو ترکی، ایران، ہندوستان اور چین میں آقا بننے کا عادی رہا ہے"۔[1]

اگلا اقدام اقوام ایشیا کے لئے پراپیگنڈا اور کارروائی کی غرض سے ایک مستقل کونسل کا قیام تھا۔ یہ جلد ہی تین کونسلوں میں بٹ گئی۔ ایک کا صدر مقام باکو میں تھا برائے مشرق قریب' دوسرے کا ارکٹسک۔ برائے مشرق بعید اور تیسرے کا تاشقند برائے وسطی ایشیا مشمولہ بہ افغانستان اور ہندوستان[2] ہمیں یہاں باکو اور ارکٹسک (اول الذکر کبھی منظم نہ ہو سکا) سے کوئی واسطہ نہیں لیکن تاشقند مرکز آئندہ کئی سالوں تک ہندوستان میں وجہ تفرت و دہشت بنا رہا۔

---

[1]۔ اقوام مشرق کی پہلی کانگرس باکو ستمبر ا تا ۸، ۱۹۲۰ء سٹینوگرافک رپورٹ (ماسکو، بے صفحہ، ۱۹۲۰ء) بحوالہ یوڈین اور نارتھ، ایضاً ص ۱۶۷۔

[2]۔ وڑن نیشنلٹ، نمبر ۴۶، ۱۵ دسمبر ۱۹۲۰ء ص ۱ تا ۲۔ بحوالہ یوڈین اور نارتھ، ایضاً ص ۸۲۔

تاشقند سکول :-

بالشویک حکومت کی ابتداء سے ہی تاشقند ہندوستان کے خلاف سرگرمیوں کا مرکز رہا تھا۔ ۱۹۱۹ء کے اوائل میں جب بیلی ابھی زیرزمین تھا۔ ہندوستانی انقلابیوں کے گروہ میں سے ایک، پروفیسر برکت اللہ نے جس نے پہلی جنگ عالمگیر کے دوران برلن میں "ہندوستان کی عارضی حکومت" قائم کی تھی تاشقند میں نمودار ہوا۔ برکت اللہ کا کابل کے سرکردگان سے گہرا رابطہ تھا اور وہ ان کے اور بالشویکوں کے درمیان ایک قسم کا واصل بنا ہوا تھا تاکہ ہندوستان کے خلاف ایجی ٹیشن کو مربوط کیا جا سکے۔[1] وسط ایشیاء میں برکت اللہ کے ساتھ ہی مہندرا پرتاپ تھا جو برلن میں "عارضی حکومت" کا صدر رہا تھا۔ وہ بھی انگریزوں کے خلاف روسی اور افغان حمایت حاصل کرنے کے لئے سرگرم تھا۔[2]

---

[1]۔ بیلی، ایضاً، ص ۱۴۴۔ برکت اللہ نے ۱۹۱۹ء میں ازولستیا کو اپنے سیاسی فلسفہ پر مختصر بیان دیا "میں کمیونسٹ یا سوشلسٹ نہیں ہوں لیکن میرا سیاسی پروگرام اب تک انگریزوں کو ایشیا سے نکالنا ہے" (ازولستیا، نمبر ۹۵، ۴ مئی ۱۹۱۹ء ص ۱ بحوالہ بوڈین مارتھ، ایضاً، ص ۱۸۱)

[2]۔ بیلی نے سویٹ چیکا افسر کی حیثیت سے پرتاپ کے ساتھ بخارا کے باہر کاران کے ایک ہوٹل میں طویل گفتگو کی۔ دیکھئے بیلی ایضاً، ص ص ۲۲۶ تا ۲۳۰

۱۹۲۰ء کے اوائل میں سوویٹ کمسر سٹیٹ برائے خارجہ امور کی تاشقند شاخ نے تاشقند میں ہندوستانی انقلابیوں کے لئے ایک خصوصی ٹریننگ سکول کھولا تھا۔ اس سکول کو جلد ہی تاشقند بیورو آف دی کمیونسٹ انٹرنیشنل نے اپنے انتظام میں لے لیا جس کا سربراہ ایک کٹر کمیونسٹ اور پیشہ ور تحریک باز ، ایم ۔ این رائے تھا جو برکت اللہ یا پرتاپ سے کہیں زیادہ لائق و فائق تھا۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں چھتیس ہندوستانی جن میں اکثر تحریک ہجرت (مسلمانوں پر مشتمل جو پہلی جنگ عالمگیر کے بعد ترکی سے برطانیہ کے سلوک کے خلاف ہندوستان میں اپنی سکونت ترک کر رہے تھے) کے ارکان تھے تاشقند پہنچے جہاں رائے نے انہیں خوش آمدید کہا اور وہ سکول میں داخل کر لئے گئے۔ تاشقند میں نو مہینے کا ایک کورس مکمل کرنے کے بعد ان میں سے تین ، شوکت عثمانی ، عبدالمجید اور عبدالقادر صحرائی مزید ٹریننگ کے لئے ماسکو بھیج دیئے گئے۔ بعد میں یہ تینوں ماسکو کی کمیونسٹ یونیورسٹی آف ٹوائلرز آف دی ایسٹ (محنت کاران مشرق ۔ مترجم) میں داخل کر لئے گئے ۱؎ اور جب ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کے اینگلو سوویٹ تجارتی معاہدہ کے تحت مارچ ۱۹۲۱ء میں تاشقند سکول بند کر دیا گیا تو اور بھی کئی ان سے آملے ۲؎ انگریزوں کے مطابق تاشقند سکول کو اپنی

۱؎ سوسندرا ناتھ ٹیگور "ہسٹاریکل ڈیویلپمنٹ آف دی کمیونسٹ موومنٹ ان انڈیا"
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مختصر زندگی کے دوران دو ملین گولڈ روبل ملے*

جون ۱۹۲۱ء میں پندرہ تاشقندی طلباء ہندوستان واپس آتے ہوئے پشاور میں گرفتار کر لئے گئے، اور تاشقند مقدمہ سازش کے تحت قید کر دیئے گئے۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں سات مزید دھر لئے گئے جو انگریزوں کے دعوے کے مطابق کوئی باسٹھ میں سے تھے جو ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد ۱۰۰ پونڈ کے کئی بنک نوٹ۔ جو لندن کے لائیڈز بنک نے ایک سویٹ افسر تجارت کو جاری کئے تھے۔ ہندوستان کے ایک انقلابی نے ہندوستان میں تڑوا لئے جو تاشقند کے فارغ التحصیل طلباء اور کابل میں سویٹ مشن کے ساتھ قریبی رابطہ رکھتا تھا۔ انگریزوں نے دعویٰ کیا کہ تھرڈ انٹرنیشنل کی چوتھی کانگرس نے اپنی نومبر ۱۹۲۲ء کی میٹنگ میں ۲۰،۱ لاکھ پونڈ ہندوستان میں تخریب کاری کے لئے مختص کئے

(بقیہ حاشیہ)

(کلکتہ۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا، ۱۹۴۴ء) ص ۳

* پارلیمنٹری پیپرز ۱۹۲۷ء سی ایم ڈی ۲۸۹۵ (رشیا نمبر ۲) "اے سیلیکشن آف پیپرز ڈیلنگ ود دی ریلیشنز بٹوین ہز مجسٹیز گورنمنٹ اینڈ دی سویٹ گورنمنٹ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۷ء" ص ۸ ۔

تھے۔[۱۰] ایم این رائے بھی ۱۹۳۱ء میں ہندوستان واپس آتے ہوئے سابقہ الزامات پر گرفتار کر لیا گیا۔

سوویٹ افغان تعاون:۔

بالشویکوں کو کابل میں اپنی انگریز دشمن سرگرمیوں کے لئے متعدد اتحادی مل گئے۔

افغان امیر حبیب اللہ کو فروری ۱۹۱۹ء میں قتل کر دیا گیا تین ماہ کے اندر اندر حبیب اللہ کے تیسرے بیٹے امان اللہ نے اپنے ایک چچا اور دو بڑے بھائیوں کی بجائے تخت حاصل کر لیا تھا اور برطانوی ہند کے خلاف لڑائی شروع کر لی تھی۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں امان اللہ نے جنرل محمد ولی خان کو ایک خط بنام لینن کے ساتھ ماسکو بھیجا۔ خط میں سوویٹ حکومت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں اسلحہ کی امداد کی درخواست کی گئی تھی۔ تاشقند میں ایک افغان قونصل جنرل تعینات کیا گیا جس کا اہم فرض پروفیسر برکت اللہ کو اس کی انگریز دشمن سرگرمیوں میں مدد دینا تھا۔

---

[۱۰]۔ پارلیمنٹری پیپرز ۱۹۲۳ء سی ایم ڈی ۱۹۶۹ء (رشیا نمبر ۲) "کارسپانڈنس بٹوین ہز مجسٹیز گورنمنٹ اینڈ دی سوویٹ گورنمنٹ ریسپیکٹنگ دی ریلیشنز بٹوین دی گورنمنٹس" ص ۸ تا ۹۔

لینن نے امان اللہ کے خط کا جواب دیا جس میں افغانستان کو ایک آزاد مملکت تسلیم کیا گیا اور بیرونی گدھوں کی کسی بھی کوشش کے خلاف باہمی امداد" کی تجویز پیش کی گئی جو افغانستان یا سویٹ یونین کی نو حاصل کردہ آزادی کے خلاف کی جائے[1]۔ یہ تبادلہ خطوط و خیالات ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو معاہدۂ راولپنڈی سے کئی مہینے پہلے ہوا جس میں انگریزوں نے سرکاری طور پر افغانوں کے اپنے امور خارجہ کو آزادانہ طور پر چلانے کا حق تسلیم کیا۔

افغان فوج کی کرم میں پیش قدمی کے ساتھ ہی پشاور میں ایک بغاوت پشاور کے افغان پوسٹماسٹر نے ترتیب دی تھی جس میں شاید پرتاپ اور برکت اللہ کی امداد حاصل تھی لیکن یہ بغاوت چیف کمشنر سر راس کیپل نے سر اٹھاتے ہی کچل دی جس نے پشاور کے پرانے شہر کی ناکہ بندی کر دی اور فراہمی آب روک دی۔ جب دہلی اور وہائٹ ہال افغانستان پر عائد کی جانیوالی شرائط صلح پر حیص بیص کر رہے تھے تو یہ اطلاع ملی کہ سویٹ روس نے امان اللہ کو ضلع پنجدہ واپس کرنے کی پیشکش کی تھی جس پر قبضہ چالیس سال پہلے برطانیہ اور زار روس کو جنگ کے دہانے تک لے آیا تھا۔

۱۹۱۹ء کے آخر میں براونی کے تحت ایک سویٹ مشن کابل

---

[1] - لُوڈین اور نارتھ، ایضاً، ص ۱۰۷

آیا اور ایک مستقل نمائندہ، آئی۔ اے۔ زیڈ سورِٹز افغان دارالحکومت میں تعینات کر دیا گیا۔ پنجدہ کی واپسی کی تجاویز تو بار ور نہ ہو سکی لیکن افغان سوویٹ مصالحت بڑھتی رہی۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۲۰ء کو کابل میں سوویٹ معاہدے کا ڈرافٹ تیار ہوا اور ۲۸ فروری ۱۹۲۱ء کو ماسکو میں ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ ۱۹۲۱ء کے اس معاہدے کے تحت طرفین نے قونصل خانے قائم کئے (۵ سوویٹ قونصل خانے افغانستان میں اور سات افغان قونصل خانے سوویٹ یونین میں) سوویٹ یونین کے راستے افغان اشیاء کی مفت نقل و حمل کا فیصلہ ہوا اور بخارا اور خیوا کی خانیوں کی آزادی کو باہمی طور پر تسلیم کیا گیا۔ دفعہ ۱۰ کے تحت سوویٹ یونین نے عہد کیا کہ وہ حکومت افغانستان کو مادی اور اقتصادی امداد فراہم کرے گا۔" بعد میں انگریزوں نے الزام لگایا کہ یہ امداد ایک ملین سونا یا چاندی سالانہ کے وظیفہ پر مشتمل تھی [1]

زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے فروری ۱۹۲۱ء کے اینگلو سوویٹ معاہدہ کی تکمیل کے فوراً ہی بعد ماسکو نے سورِٹز کی بجائے سرخ بحری افسر ایف ایف راسکولنی کوف کو مقرر کیا جس نے تین سال پہلے انیزلی میں کیپٹن بیڈرے کو انگریزوں کے قبضے سے چھڑا لیا تھا۔ سوویٹ یونین نے اپنے اس عزم کا بھی اعلان کیا کہ وہ قندھار

---

[1]۔ متن کے لئے دیکھئے لیونارڈ شاپیرو "سوویٹ ٹریٹی سیریز" جلد اول (واشنگٹن: جارج ٹاؤن یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۰ء) ص ص ۹۶ تا ۱۰۹ نیز پارلیمنٹری پیپرز، ۱۹۲۷ء سی ایم ڈی ۲۸۹۵ ص ۹

اور غزنی میں اپنے قونصل خانے کھول لے گا۔ جو ہندوستانی سرحد کے سرے پر واقع تھے۔

جون ۱۹۲۱ء میں سٹالن نے افغانستان کو ایک ایسا ملک بنایا" جس کے ذریعے کمیونسٹ انٹرنیشنل براہ راست مزید جنوب میں برطانوی ہند کے ساتھ رسل و رسائل قائم رکھتا ہے، پراپیگنڈا جو شرقی سیکرٹریٹ کا بنیادی مقصد ہے"[1]

راسکولنی کوف نے فوراً ہی ان ذرائع کو پھیلانا اور مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ پروفیسر برکت اللہ اور دیگر ہندوستانی انقلابی جو پہلی جنگ عالمگیر کے خاتمہ کے بعد بالشویکوں سے رابطہ رکھتے تھے کابل میں لائے گئے۔ ڈاکٹر حفیظ نامی ایک "مشہور و معروف انارکسٹ جو ویانا میں بم سازی کا مطالبہ کرتا رہا تھا" افغان دارالحکومت لایا گیا تاکہ ایک بم فیکٹری قائم کرے[2]

جمال اور انور

برکت اللہ کے ساتھ ہی جمال پاشا بھی کابل آیا تھا جو انور پاشا اور نوری پاشا کا ایک رفیق تھا۔ پیشتر اس کے کہ ہم سوویٹ یونین

۱۔ پارلیمنٹری پیپرز، ۱۹۲۲ء سی ایم ڈی ۲۸۹۵ (رشیا نمبر ۲) ص ۵

۲۔ ایضاً، ص ۷

اور سامراجی برطانیہ کے درمیان وسط ایشیائی سرحدی سرزمین کے متعلق جدوجہد میں جمال کے کردار پر بحث کریں ترکی پاشاؤں کا مختصر سا ذکر ضروری ہے۔

جمال، انور اور طلعت ہی وہ مثلث تھے جو ۱۹۱۴ء میں ترکی کو لڑائی میں جرمنی کی طرف لانے کے زیادہ تر ذمہ دار تھے۔ ترکی کی شکست اور کمال اتاترک کے عروج کے ساتھ ہی جمال اور انور بالشویک روس میں چلے گئے۔ دونوں ایک بین الاسلامی سلطنت کے مبہم سے خواب دیکھتے تھے جو ترکستان میں مرکوز ہوتی اور بالآخر افغانستان اور مسلم ہند پر بھی محیط ہوتی۔ اُن کی امنگیں اس وقت سوویٹ منصوبوں سے ہم آہنگ تھیں جو ہندوستان کے خلاف بنائے جا رہے تھے لہذا بالشویکوں نے ان دونوں کی حمایت اور حوصلہ افزائی کی۔

انور اقوامِ مشرق کی باکو کانفرنس کا ایک اہم مقرر تھا، لیکن تھوڑا عرصہ بخارا میں ٹھہرنے کے بعد انور بالشویکوں سے مایوس ہو گیا اور باسماچیوں سے جا ملا جو وسط ایشیائی قبائلی تھے اور سوویٹ حکومت کے خلاف ایک جنگ چپاول لڑ رہے تھے، انور نے اپنے ایک بین الاقوامی مملکت کے منصوبے کے لئے افغانستان سے اپنے حامی تلاش کئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ اس کی فوج میں ایک ہزار افغان شامل بتائے گئے[۱] لیکن بغاوت ناکام رہی اور انور ۸ اگست

۱۔ ڈبلیو پی اور زیلڈ کے کوٹس "دی سوویٹس ان سنٹرل ایشیا"، ص ۸۰

۱۹۲۲ء کو آخر دم تک لڑتا ہوا ایک جانباز کی موت سے ہمکنار ہوا۔[1]

انور یا سماچیوں سے مل گیا تو جمال کابل چلا گیا۔ اس کے یہاں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے خوابوں پر انگریز دشمنی کو اولیت حاصل تھی۔ اس کی کافی شہادت موجود ہے کہ افغانستان میں اس کی سرگرمیوں کی کفالت بالشویک کرتے تھے بلکہ غالباً کافی حد تک ان کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔ جمال نے ایک "اسلامی انقلابی لیگ" قائم کی جس کا مبینہ مقصد ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شاہ امان اللہ کے لئے افغان فوج کی ایک اعلیٰ کور بھی تیار کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ اس نے سرحدی قبائل کے ساتھ بھی رابطہ قائم کیا جو ابھی تک تیسری جنگ افغان کے بعد سلگ رہے تھے اور جنوری ۱۹۲۱ء میں وہ کابل میں وزیر ملوک کے ایک گروہ سے بھی ملا۔ اس نے بعد میں قبائلی علاقہ کا خفیہ دورہ کیا اور ممکن ہے کہ اس نے محدود تعداد میں اسلحہ بھی مہیا کیا ہو، جو ۲۲-۱۹۲۱ء میں وزیرستان میں لڑائی کے دوران استعمال ہوا۔ انگریزوں کے مطابق بالشویکوں نے اسے اس مقصد کے لئے ایک ملین روپے دیئے تھے۔[2]

لیکن جمال ایک دورے کے لئے سوویٹ یونین واپس گیا اور

---

[1]- انور اور باسماچیوں کی تفصیلات کے لئے دیکھئے کیرو، ایضاً، ص ص ۱۱۴ تا ۱۳۰

[2]- پارلیمنٹری پیپرز، ۱۹۲۲ء سی ایم ڈی ۱۶۹۵ (رشیا نمبر ۲) ص ص ۱۰ تا ۱۱

پیشتر اس کے کہ اس کے اسلامی انقلاب کے منصوبے خاص پیشرفت کر سکتے اسے ۲۱ جولائی ۱۹۲۲ء کو غالباً بالشویکوں نے طفلس میں قتل کر دیا جو اس پر اب اعتبار نہیں کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ اب اپنی افادیت کھو چکا تھا۔[1]

دریں اثناء راسکولنی کوف اپنے کام میں منہمک رہا۔ اس کی سرگرمیوں کا اندازہ ان بحری تاروں کے سلسلوں سے ہو سکتا ہے جو کابل اور ماسکو اور تاشقند کے درمیان گھومتی رہیں اور پھر انگریزوں کے ہاتھ لگ گئیں جنہوں نے انہیں شائع کر دیا۔ ۸ نومبر ۱۹۲۲ء کو راسکولنی کوف نے ماسکو کو تار بھیجا "اب پشاور کے شمالی خطے، مہمندوں پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے لیکن قلت سرمایہ کی وجہ سے ہم کچھ زیادہ نہیں کر سکتے"۔[2]

۱۷ فروری ۱۹۲۳ء کو راسکولنی کوف نے سوویٹ دفتر خارجہ کی تاشقند شاخ کو ایک تار میں ذکر کیا کہ "اسلحہ و سرمایہ کی فوری دستیابی ایک بے پناہ اہمیت رکھے گی" تاکہ برطانوی ہند کے خلاف ایک نئی افغان نقل و حرکت کو ابھارا اور سنبھالا جا سکے۔ چار دن بعد اسنے ماسکو کو بتایا "میں وزیرستان کی مدد کرنے کے انتظامات کر رہا ہوں جو تقریباً ۳ ہزار روبل اور کارتوسوں کے ۱۰ صندوقوں

۱۔ کیرو، ایضاً، ص ۱۲۳

۲۔ پارلیمنٹری پیپرز ۱۹۲۳ء سی ایم ڈی ۱۸۶۹ء (رشیا نمبر ۲) ص ۸

کے برابر ہوگی"۔[1] قبائل کو مالی امداد دینے کے علاوہ راسکولنی کوف ہندوستان کے اندر انقلابی گروہوں سے رابطہ قائم رکھے ہوئے تھا جن میں سے اکثر تاشقند سکول کے فارغ التحصیل طلباء تھے جن کے لئے اس نے ماسکو سے ۲۵ ہزار زریں روبل مانگے۔[2]

۱۶ مارچ ۱۹۲۳ء کو راسکولنی کوف کے ماسکو مشورے کے لئے جانے سے عین پیشتر اسسٹنٹ کومسار برائے امور خارجہ نے اسے ہدایت کی۔ "اپنے ساتھ ایک ٹھوس تجویز لائیے جس میں قبائل کی امداد کی شکل اور تعاون واضح ہو۔ (بموجب اصل)۔۔۔۔۔ ہمیں تعاون کی شکل سے مطلع کیجئے جو اسلحہ کی تقسیم میں مقامی نگرانی کے لئے ضروری ہوگی"۔[3]

چند ماہ بعد راسکولنی کوف کی سرگرمیاں بند ہوگئیں جب اسے لارڈ کرزن کے الٹی میٹم مورخہ ۸ مئی ۱۹۲۳ء کے بعد واپس بلالیا گیا، ویسے بھی قبائل کے ساتھ اس کا جوڑ توڑ کوئی رنگ نہ لاسکا

۱۔ ایضاً ص ۷

۲۔ ایضاً ص ۹

۳۔ ایضاً ص ۸

برطانوی اندازوں کے مطابق اس نے برطانوی ہند پر حملہ کرانے کی کوششوں پر اکتوبر ۱۹۲۲ء اور اکتوبر ۱۹۲۳ء کے درمیان ۸ لاکھ کابلی روپے خرچ کئے۔[1] اس کا اہم کارنامہ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے قبائل کو اتنا روپیہ مزید دے دیا۔

ہندوستان میں ردِ عمل:۔

وسط ایشیا اور افغانستان سویٹ سرگرمیوں پر ہندوستان میں ردِ عمل ہراس سے کم نہ تھا۔ حکومت ہند کے سینئر افسران جنہوں نے اپنے ایام شباب میں زارِ روس کے ساتھ عظیم مقابلہ" میں اپنا کردار ادا کیا تھا بالشویکوں کو زاریت پرستوں سے زیادہ بڑا اور فوری خطرہ سمجھتے تھے۔ ۱۹۲۰ء کے لئے سالانہ بیان بابت اخلاقی و مادی ترقی اور حالات در ہند کے ابتدائی الفاظ یہ تھے:۔

حالیہ سالوں میں شاید ہی سیاست کے مطالعہ کاروں پر یہ بات اتنی اثر انداز ہوئی ہو کہ ہندوستان ایشیا کا ایک جزو لاینفک ہے جتنی زیر تبصرہ وقت میں ہوئی ہے۔ ایک طرف ہندوستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات اور دوسری طرف ہندوستان اور سرحدی قبائل کے درمیان روابط کو سمجھنا ناممکن ہے جب تک

---

[1] ایضاً

بالشویک سرگرمی کے طوفانی پس منظر سے کچھ واقفیت نہ ہو جس پہ یہ تعلقات کم یا زیادہ درجے تک منحصر تھے[1]

ہندوستان کے حکمرانوں کے لئے خاص طور پر پریشان کن اور انور اور جمال کا پان توران ازم اور پان اسلام ازم تھا۔ ان کے ہندوستان پر براہ راست اثرات ہوئے۔ مولانا محمد علی نے تحریک خلافت کی حمایت میں برصغیر کے مسلمانوں کو کانگرس پارٹی کے ساتھ ایک بے نظیر رشتہ تعاون میں پرو دیا۔ ہجرت کے تحت ہزاروں ہندی مسلمان برطانوی ہند کو خیرباد کہہ کر افغانستان چلے گئے جن سے میں کافی بعد میں تاشقند میں انجام پذیر ہوئے۔ اس سال کی حکومت ہند کی سرکاری رپورٹ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے "۱۹۲۰ء کے وسط سے بالشویکیت اور اسلام کے گٹھ جوڑ کا بیانگ دہل اعلان کیا گیا"[2]

ہمارے پرانے دوستوں، سید احمد کے پیروؤں نے اس گٹھ جوڑ کو ہندوستانی سرحدات کے اندر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا چمرقند میں سید کی کالونی کو ڈیرا اور ہزارہ سرحد کے قبائل میں کمیونسٹ پراپیگنڈا پھیلانے کا اڈا" قرار دیا گیا۔ ضلع ہزارہ میں ٹل کے

---

[1] - مورل اینڈ میٹریل پراگریس آف انڈیا، ۱۹۲۰ء، صفحہ ۱

[2] - ایضاً، ص ۶۸

ایک سابقہ جاگیر دار محمد ایوب خان کو جس نے چند سال پہلے افغانستان میں پناہ لے لی تھی "پان اسلامک بھیس میں بالشویک نظریات" کو پھیلانے کے الزام میں مورد تعزیر ٹھہرایا گیا ہے[1]

لیکن ساتھ ہی ساتھ انگریز اس گٹھ جوڑ کے بالشویک اور پان اسلامک پہلوؤں میں مفادات کا تصادم بھی دیکھ رہے تھے ۱۹۲۲ء کی سالانہ پراگریس رپورٹ بابت اخلاقی و مادی ترقی میں رائے زنی کی گئی تھی کہ شاہ امان اللہ اپنی سرکردگی میں ایک عظیم وسط ایشیائی وفاق کی تخلیق کے لئے کام کر رہا تھا۔ رپورٹ کے مطابق "ظاہر ہے کہ یہ سکیم بالشویکوں کو گوارا نہیں جو ایک مضبوط اسلامی بلاک کو ہندوستان کے راستے میں اپنے لئے سد راہ سمجھتے ہیں"[2]

امان اللہ کا وفاق متوازن نہ ہو سکا ۲۲-۱۹۲۱ء کی وزیرستانی بغاوت دبا دی گئی۔ بالشویکوں نے وسط ایشیاء میں زار کی فتوحات کو مستحکم تو کیا لیکن وہ کم از کم جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کے راستے پر ایک انچ بھی آگے نہ بڑھے۔ لیکن اس کی وجہ وسط ایشیا میں "عظیم مقابلہ" کی نئی چالوں کی بجائے یورپ میں کی جانے والی سیاسی ریشہ دوانیوں میں مضمر تھی۔

---

[1] این ڈبلیو ایف پی بارڈر ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۲۳-۱۹۲۲ء ص ۳

[2] مورل اینڈ میٹریل پراگریس آف انڈیا ۱۹۲۲ء ص ۸

سفارتی لڑائی ؎۱

پُرکار قدیم برطانیہ اور جلد باز نئی سوویٹ مملکت کے درمیان سفارتی معرکہ آرائی کا مفصّل بیان اتنی جگہ گھیرلے گا جتنی یہاں ممکن نہیں۔ لیکن بالاختصار کہا جا سکتا ہے کہ سوویٹ یونین کو اپنے سامراجی اور انقلابی عزائم کے باوجود تیسرے عشرے میں امن اور خارجی دنیا کے ساتھ رابطۂ نو کی اشد ضرورت تھی۔ سوویٹ معیشت جنگ اور انقلاب کے چھ سالوں میں تباہ ہو چکی تھی اور اسے بڑی طرح درآمدات کی ضرورت تھی۔ خام مال کی صورت میں بھی اور اشیائے پیداوار کی صورت میں بھی۔ برطانیہ کو اپنی برآمدات کے لئے منڈیاں درکار تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان انقلاب کے لئے اتنا تیار نہیں تھا جتنا کہ کمیونسٹ نظریہ پرستوں نے پہلے سمجھا تھا۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل نے اپنے زور کا رخ مشرق کی طرف موڑ دیا جہاں چین سرگرمیوں کے لئے زیادہ زرخیز میدان مہیا کرتا تھا۔

ان عوامل کا نتیجہ ایک سال کے مذاکرات کے بعد ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کے اینگلو سوویٹ تجارتی معاہدہ کی صورت میں نکلا۔ اس دستاویز نے سوویٹ یونین کو بالکل تسلیم کر لیا اور بالشویک مملکت کے

؎۱۔ متن کے لئے دیکھئے شاپیرو، ایضاً، ص ص ۱۰۲ تا ۱۰۴

خلاف اتحادیوں کی جنگ بے اعلان کو ختم کر دیا۔ معاہدے کا بنیادی تعلق تجارت سے تھا لیکن دونوں ملکوں کے درمیان حساس ترین نکاتِ اختلاف میں سے ایک کا احاطہ اس کے دیباچہ میں کر لیا گیا۔

اس میں سوویٹ حکومت نے "فوجی یا سیاسی یا کسی بھی دوسری قسم کے عمل یا پراپیگنڈا سے اقوام ایشیا میں برطانوی مفادات یا برطانوی سلطنت بالخصوص ہندوستان اور افغانستان کی آزاد مملکت کے سلسلے میں کسی قسم کی مخالفانہ کارروائی کی حوصلہ افزائی کرنے کی کسی بھی کوشش" سے اجتناب کرنے کا عہد کیا۔ برطانیہ نے بھی سوویٹ حکومت کو ایسا ہی مخصوص قول" دیا جو "ان ممالک" سے متعلق تھا جو سابقہ روسی حکومت کے حصے کے تھے اور جو اب آزاد ہو گئے ہیں۔"[x]

یہ عبارت برطانیہ کی طرف سے خاصی رعایت کی مظہر تھی کیونکہ وزیر خارجہ لارڈ کرزن نے ابتداء میں اصرار کیا تھا کہ سوویٹ کی برطانیہ دشمن سرگرمیوں پر پابندی میں کاکیشیا، ایران اور ایشیائے کوچک کو بھی شامل ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں سوویٹ حکومت کا عہد کومنٹرن پر لاگو نہیں کیا گیا حالانکہ فریقین اچھی طرح جانتے تھے کہ بیشتر سرگرمیوں کا منبع تھا جن پر برطانیہ کو اعتراض تھا۔

---

x ایضاً ص ۱۰۲

افغانستان میں راسکولنی کوف اور ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء
میں بے شمار دیگر کمیونسٹ سرگرمیوں نے نیم حیران برطانوی دفتر خارجہ
کے سامنے جلد ہی بکثرت ایسے شواہد پیش کر دیئے کہ تجارتی معاہدے
میں سوویٹ عہد بے کار تھے۔ چنانچہ وائٹ ہال نے مسئلہ سے نمٹنے کے
لئے ایسے اقدامات کئے جو اس کے بس میں تھے۔ مثلاً ۲۲ر نومبر ۱۹۲۱ء
کے اینگلو افغان معاہدہ کے ساتھ مراسلات کا جو تبادلہ ہوا اس میں
افغان وزیر خارجہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ برطانیہ کو یقین دلائے کہ
معاہدہ کی دفعہ ۷ کے تحت دی جانے والی کسٹم معافی کے بدلے
میں افغانستان "روسی حکومت کو قونصل جنرل یا قونصل یا نمائندے
مقرر کرنے کا موقعہ ان مقامات اور علاقوں یعنی جلال آباد غزنی
اور قندھار میں نہ دے گا کیونکہ یہ سرحدات ہند سے متصل ہیں"۔
یہ نو ماہ پہلے کے سوویٹ افغان معاہدہ کی دفعہ ۵ کے واضح طور پر
خلاف تھا۔ جس کے تحت قندھار اور غزنی میں سوویٹ قونصل
خانوں کے قیام کی خصوصی طور پر منظوری دی گئی تھی[۱۸]
برطانیہ نے براہ راست سوویٹ یونین سے بھی احتجاج کیا۔ ۲ ستمبر

۱۸۔ پارلیمنٹری پیپرز ۱۹۲۲ء، سی ایم ڈی ۱۷۸۶، "ٹریٹی بٹوین دی برٹش اینڈ افغان
گورنمنٹس ۲۲ر نومبر ۱۹۲۱ء (ٹریٹی سیریز ۱۹۲۲ء، نمبر ۱۹)، شاید (؟) ایضاً،
ص ۹۶ ۔

۱۹۲۱ء کو لارڈ کرزن نے سوویٹ وزیرِ خارجہ، چچرین کو ایک سخت نوٹ ارسال کیا۔ نوٹ میں ہندوستانی انقلابیوں کی سوویٹ حمایت کا ذکر تھا جن میں برکت اللہ اور ایم ساتہ، ڈاکٹر حفیظ شامل تھے اور تاشقند سکول کے خلاف بھی شکایت کی گئی تھی۔ اس میں افغانستان میں سوویٹ سرگرمیوں کے خلاف بھی احتجاج کیا گیا جس میں جمال کی حمایت بھی شامل تھی اور ۲۸ فروری ۱۹۲۱ء کے سوویٹ افغان معاہدے کو بھی نشانہ تنقید بنایا گیا[1]۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۲۱ء کو لیٹوی نوف نے جواباً ان الزامات سے انکار کیا جو غلط معلومات اور جعلسازیوں پر مبنی تھے۔ ڈاکٹر حفیظ اور تاشقند سکول سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا اور افغانستان میں جمال اور ہر جگہ تھرڈ انٹرنیشنل کی سرگرمیوں سے سوویٹ حکومت کی لاتعلقی کا اعلان کیا[2]۔

وائٹ ہال نے سوویٹ انکار کی تیز و تند تردید روانہ کر دی لیکن اگلے ڈیڑھ سال تک مزید کوئی کارروائی نہیں کی جس کے دوران راسکولنی کوف کابل میں اپنی سرگرمیوں میں ہمہ تن مشغول رہا اور تاشقند سکول کے فارغ التحصیل طلبا روز افزوں تعداد میں ہندوستان آنے لگے۔ پھر لارڈ کرزن نے بلا پیشگی سیاسی تنبیہ اپنے ۲ مئی ۱۹۲۳ء

---

[1]۔ کرزن کے نوٹ کا متن پارلیمنٹری پیپرز ۱۹۲۳ء سی ایم ڈی ۱۸۹۵ (رشیا نمبر ۲) ص ص ۴ تا ۱۲ دیکھیے

[2]۔ متن کے لئے دیکھیے، ایضاً، ص ص ۱۲ تا ۱۶

کے نوٹ میں اپنا مشہور "الٹی میٹم" بذریعہ ہوائی جہاز بھیج دیا۔ کرزن کے نئے نوٹ میں اینگلو سویٹ تجارتی معاہدہ کی بہت سی خلاف ورزیاں گنوائی گئیں اور آخر میں نتیجہ نکالا گیا کہ اگر سویٹ افسروں کو (شمولہ بہ راسکولنی کوف) جو شدید خلاف ورزیوں کے مرتکب ہوئے تھے۔ "معزول" نہ کیا گیا اور انہیں "ان کے ناپسندیدہ جوڑ توڑ کے مناظر سے واپس" نہ بلایا گیا تو معاہدہ ختم کر دیا جائے گا۔[1]

کرزن کے الٹی میٹم نے انگلستان اور سویٹ یونین دونوں ممالک میں تہلکہ برپا کر دیا۔ ٹراٹسکی بخاریہ اور راڈک نے اسے ایک اور مداخلت یا سویٹ یونین کو جنگ کی اشتعال دہی کا ایک نقطۂ آغاز قرار دیا۔ بہت سے انگریز لبرل حضرات نے بھی اسے اسی روشنی میں دیکھا۔ بہت سے عام طور پر بالشویک مخالف قدامت پسند بھی ان تجارتی انتظامات کو درہم برہم کرنے کے خلاف تھے جن کے تحت وہ فائدہ اٹھا رہے تھے۔[2]

لیکن رسمی سویٹ جواب نرم تھا ۴ جون ۱۹۲۳ء کے نوٹ میں سویٹ دفتر خارجہ نے الزامات کی تردید کی بالخصوص

1۔ پارلیمنٹری پیپرز ۱۹۲۳ء سی ایم ڈی ۱۸۶۹ء (رشیا نمبر ۲) ص ۹

2۔ دیکھئے نوٹ دین اور فقرہ ایضاً ص ص ۱۸۱ تا ۱۸۹ نیز ڈبلیو پی اور زیڈ کے کوٹس "اے ہسٹری آف اینگلو سویٹ ریلیشنز" (لندن: لارنس اینڈ وشارٹ ۱۹۴۳ء) ص ص ۱۰۲ تا ۱۲۹

راسکولنی کوف سے منسوب سرگرمیوں سے انکار کیا۔ نوٹ کے مطابق یہ سرگرمیاں سویٹ وزیر کی نہ تھیں بلکہ کسی اور شخص کی تھیں جس کا روسی حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن جس کا نام مسلّمہ بین الاقوامی کے آداب کے مطابق روسی حکومت منظر عام پر نہیں لا سکتی[1] یہ غالباً جمال کی طرف اشارہ تھا۔ یہ واضح نہ ہو سکا کہ ماسکو آتنا بے دست و پا کیوں تھا۔

ماسکو کی مغرب سے اقتصادی تعلق کی اشد ضرورت کا مظاہرہ چند ماہ بعد ہُوا جب راسکولنی کوف اور اس کے ساتھی مُقسد واپس بلا لئے گئے۔ غالباً دیدہ و دانستہ کدورت کے ساتھ شاہ امان اللہ نے جفاکش راسکولنی کوف کو "سردار" کا خطاب دیا اور اس بوڑھے بالشویک کو کابل سے رخصت ہونے سے پہلے مناسب اعزاز بھی بخشا۔

اس کے بعد ہندوستان کے خلاف سویٹ سرگرمی بتدریج کم ہوتی گئی اور کرزن کے الٹی میٹم پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی گو لندن اور ماسکو کے درمیان الزام تراشی جاری رہی حالانکہ فوری

---

[1] ۔ سویٹ نوٹ کا متن پارلیمنٹری پیپرز ۱۹۲۳ء سی ایم ڈی ۱۸۷۴ء میں ہے اور "ریپلائی آف دی سویٹ گورنمنٹ ٹو ہز مجسٹیز گورنمنٹ ریسپیکٹنگ ریلیشنز بٹوین دی ٹو گورنمنٹس" (رشیا نمبر ۲، ۱۹۲۳ء) صفحہ ۴

۱۹۲۴ء میں نئی برطانوی لیبر پارٹی حکومت نے سویٹ یونین کو قانوناً بھی تسلیم کر لیا تھا۔

مئی ۱۹۲۷ء میں ۱۹۲۱ء کا تجارتی معاہدہ منسوخ کر دیا گیا اور دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات بھی معطل کر دیئے گئے،[1] جب بدنام آرکوس کیس کے سلسلے میں لندن میں ایک سویٹ جاسوسی حلقہ دریافت کیا گیا لیکن یہ انقطاع توقع کے خلاف مکمل نہ تھا کیونکہ طرفین کے اب تک نہایت ٹھوس اقتصادی روابط قائم ہو چکے تھے، اور تجارت غیر رسمی طور پر جاری رہی۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں تعلقات بحال کر دیئے گئے اور برطانیہ اور روس کے درمیان "عظیم مقابلہ" کا آخری مرحلہ ختم ہو گیا۔ جہاں تک سرحد اور وسط ایشیاء کا تعلق تھا مقابلہ "۱۹۲۳ء میں ہی ختم ہو چکا تھا جب راسکولنی کوف کو کابل سے واپس بلا لیا گیا تھا اور بین الاقوامی کمیونزم نے اپنا اوّلین ہدف ہندوستان کی بجائے چین کو بنا لیا تھا۔

بعد میں بھی کچھ تدابیر آزمائی ہوئی جیسے ۳۱ اگست ۱۹۲۶ء کو کابل کے قریب پغمان میں ایک سویٹ افغان معاہدہ غیر جانبداری و عدم جارحیت پر دستخط ہوئے۔ اس دستاویز میں ہر فریق نے

---

[1] آرکوس کیس پر چیمبرلین کے نوٹ کا متن پارلیمنٹری پیپرز، ۱۹۲۷ء رسی اٹم ڈی ۲۸۹۵، ص ص ۶۹ تا ۷۰، پر ہے۔

عہد کیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں غیر متعلقہ لوگوں کو ایک دوسرے سے خلاف کارروائی کرنے سے روکیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف کسی سیاسی یا فوجی اتحاد یا مقاطعہ یا ناکہ بندی میں شرکت سے اجتناب کریں گے۔ کردستان میں بھی کچھ توتڑاق جاری رہی جہاں برطانیہ اور سوویٹ یونین نے اپنا اثر ورسوخ مسلط کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے کافی حد تک ترکو ایرانی پیکیٹ مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۲۶ء نے روک دیا جس کے تحت ایشیاء کے دو نئے سرواں آہن اتاترک اور رضا شاہ نے اپنے اپنے کرد علاقوں میں مشترکہ اقدامات کا فیصلہ کیا۔

چوتھے عشرے میں ہندوستان کی کانگرس پارٹی کی روز افزوں طاقت اور ۳۰-۱۹۲۰ء اور ۳۷-۱۹۳۶ء کی عظیم قبائلی بغاوتوں نے توجہ "سرخ خطرہ" سے ہٹا دی اور فی الحقیقت سوویٹ سرگرمی جنوبی ایشیا میں برائے نام ہی رہ گئی سوائے اس کے کہ ہندوستان کی نسبتاً غیر اہم کمیونسٹ پارٹی کی تھوڑی بہت حمایت کی گئی۔

۱۔ متن کے لئے دیکھئے شاپیرو، ایضاً ص ص ۲۲۲ تا ۲۲۳

دوسری جنگ عالمگیر اور مابعد!

دوسری جنگ عالمگیر کی آمد آمد پر وسیع تر مفادات پھر سر اٹھانے لگے۔ امان اللہ اور اس کے بعد نادر شاہ کے بنا کردہ خاندان کے تحت کابل کے برلن کے ساتھ گہرے ذاتی اور اقتصادی تعلقات پیدا ہوگئے اور کابل میں جرمن اور اطالوی سفرا نے ایک دفعہ پھر سرحدی قبائل کو برطانوی ہند کے خلاف ابھارنا شروع کیا۔ یہ سرگرمیاں انگریزوں کے لیے پریشان کن ہوگئیں کیونکہ ایران بھی زیادہ سے زیادہ محوری طاقتوں کی طرف مائل ہوتا گیا۔ جنگ میں جاپان کے داخلے اور ہندوستان کی مشرقی سرحدات پر براہ راست دباؤ کے آغاز نے صورتحال کو نازک بنا دیا۔ لیکن ظاہر شاہ نے وہی پالیسی اختیار کی جو حبیب اللہ نے پہلی جنگ عالمگیر میں کی تھی۔ اور افغان حکومت نے مخالفانہ اقدامات سے اجتناب کیا اور ہندوستان کے خلاف ایسی کارروائی کی حوصلہ افزائی سے دور رہی۔ ایران پر اتحادیوں کے قبضہ اور برما میں جاپانی پیش قدمی کو روکنے سے صورت حال کچھ بہتر ہوئی اور سرحد جنگ کے آخری سالوں میں اتنا پرامن رہا جتنا سابقہ جنگ کے بعد کبھی نہ رہا تھا۔

ان حالات کا پہلے ہی مختصر ذکر کیا جا چکا ہے جنہوں نے

برطانیہ کو ۱۹۴۷ء کے نصف اول میں ہندوستان چھوڑ دینے کے فیصلے پر مجبور کیا۔ جب انگریز رخصت ہو گئے تو بہت اہم تغیرات رونما ہوئے خود جنوبی ایشیا میں بھی اور "عظیم مقابلہ" کے گردوپیش میں بھی۔

پاکستان میں تغیرات!

ہندوستان سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ایشیا میں طاقت کا جو خلا پیدا ہوا اس پر مبصرین بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ سب سے زیادہ سرحد میں ہی ظاہر ہوا۔ بٹوارے سے پہلے سالوں میں سرحد میں عام طور پر فوج کی تعداد (بہ استثنائے جنگ عالمگیر دوم جب یہ گھٹا دی گئی تھی) قریباً تیس بٹالین ہوتی تھی اور اس کی پشت پناہی غیر منقسم ہندوستان کی پوری مختلف النوع عسکری قوت کرتی تھی جس میں بحری اور ہوائی عناصر بھی شامل تھے۔ ہندوستانی افواج کی پشت پناہی اپنی جگہ برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی عالمگیر قوت کرتی تھی۔

انگریزوں کے چلے جانے کے بعد یہ سب کچھ ختم ہو گیا سوائے برطانوی ہندوستانی فوجی لاؤ لشکر کے چھوٹے سے حصہ کے جو پاکستان کو ملا۔ یہ مل ملا کر دو لاکھ سے بھی کم آدمی بنتے تھے ایک ماہ کے اندر اندر یہ سب کی سب سرحد کشمیر پر متوجہ بھی

جہاں یہ برصغیر کے باقی ماندہ لاؤ لشکر کو منسوخ کرنے کے لئے استعال کی جا رہی تھی۔ ۱۹۴۸ء کے موسم بہار تک دونوں پاکستانی اور ہندوستانی فوجوں کے بہترین یونٹ متنازعہ ریاست میں جھونک دیئے گئے تھے۔ قبائلی علاقے سے تمام باقاعدہ فوجی یونٹ واپس بلا لئے گئے اور سرحد کی حفاظت کوئی نصف درجن سکاؤٹ یونٹوں، فرنٹیئر کانسٹیبلری اور چند ہزار غیر تربیت یافتہ خاصہ داروں پہ چھوڑ دی گئی جن میں سے بہت سے کشمیر جا چکے تھے۔ علاوہ ازیں "پختونستان" پر افغان دباؤ پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

اپنی نئی قومی اور مذہبی آزادی کے جوش میں پاکستان نے خارجی ممالک سے اتحاد حاصل کرنے کی کوششیں صرف مشرقِ وسطیٰ کے دیگر مسلمان ممالک تک ہی محدود کر دیں جن سے حقیقی حمایت ممکن نہ تھی اور نہ ہی واقعی مل رہی تھی۔ ہندوکش کے نیچے وسط ایشیائی سطوح مرتفع پر فوجی غلبہ اور جنوبی ایشیائی اڈے سے بحرِ ہند اور بحیرہ عرب پہ بحری کنٹرول کا کوئی امکان ہی نہ رہا تھا جو عرصہ دراز تک ایک مسلّمہ حقیقت بنا رہا تھا۔ عین اسی وقت قدیم وسط ایشیائی تجارتی راستے جو صدیوں سے عالمی معیشت کے لئے تو اپنی اہمیت کھو چکے تھے لیکن سرحد کے طرزِ حیات کا ایک جزو لاینفک تھے "آہنی پردہ" کی وجہ سے کاٹے جا چکے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں چین بھی اسی پردے کے پیچھے چلا گیا اور انگریزوں سے ورثے میں ملنے

والی کاشغر اور تبت کی سیاسی شنید کی چوکیاں بھی جلد ہی نئے ممالک کے لئے بند ہو گئیں۔

"پختونستان" کی پیچیدگی کے علاوہ سرحدی قبائل کے ساتھ پاکستان کے تعلقات بھی اتنے ہموار نہ چل سکے جتنا کہ فتح مندا اسلامی آزادی کی نئی نئی زرق برق میں متصوّر تھے۔ پاکستان کو قبائلی نظم و نسق کا برطانوی نظام تقریباً جوں کا توں ملا لیکن اسے نظام کو چلانے کے لئے اکثر و بیشتر نوجوان اور نسبتاً ناتجربہ کار پولیٹیکل افسر رکھنے پڑے۔ جن کی قبائلیوں سے مذہبی یگانگت ان کو قابو میں رکھنے کے سلسلہ میں نسبتاً محدود تجربے کا پوری طرح مداوا نہ کر سکی۔ متعدد ملوک "پختونستان" چلے گئے کیونکہ پولیٹیکل افسروں کے ہاتھوں ان کے عزت و وقار کو حقیقی یا متصوّرہ زک پہنچی تھی۔ حکومت پاکستان نے اسلامی مملکت پر زور دیکر جو مذہبی جوش و خروش پیدا کیا اس نے قبائلیوں کو جہاد جوئی کے لئے مشتاق اور بے چین کر دیا تاکہ ان کی دبی ہوئی قوتیں اپنا نکاس حاصل کر سکیں۔

پاکستان کی اقتصادی مشکلات جنگ کوریا کے خاتمہ پر بڑھ گئیں اور قبائلی علاقے پر اخراجات میں تخفیف کرنا پڑی، وظائف اور ترقیاتی منصوبے وقتاً فوقتاً کم کئے گئے اور کچھ خاصہ دار یونٹیں توڑ دی گئیں۔ بڑی فوجی چھاؤنیوں جیسے رزمک کے خالی کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمسایہ قبائل کو اقتصادی مشکل پیش آئی جو چھاؤنیوں

پر چھاپوں کے درمیانی وقفوں میں انہیں اشیا اور خدمات مہیا کر کے اپنی قلیل آمدنیاں بڑھاتے تھے۔

خود پاکستان کے اندر سیاسی غلبے کی جدوجہد نے جو بنگالی مشرقی پاکستان اور پنجابی غلبہ کے مغربی پاکستان کے درمیان رونما ہوئی پٹھان صوبہ سرحد کو ایک ایسی حیثیت دے دی کہ وہ مشرقی پاکستان سے مل کر ایک مخدوش توازن کو درہم برہم کر سکے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور سب ڈویژنوں کو ون یونٹ میں مدغم کیا گیا۔ لیکن مسئلہ حل نہ ہو سکا اور عبدالغفار خان بلکہ اکثر پٹھان ون یونٹ کے خلاف سرگرمیوں کا قراول بنے رہے اور مملکت کا استحکام رتی بھر بھی بہتر نہ ہو سکا۔

پاکستان کی ابتدائی خارجہ پالیسی کا مقصد "سرد جنگ" سے دامن بچانا تھا لیکن فروری ۱۹۵۱ء میں مسلم لیگ حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے ایک مبینہ کمیونسٹ وابستہ سازش کا پتہ چلا۔ اس میں مسلح افواج کے افسر شامل تھے جو سب کے سب قید کر دیئے گئے بعد میں ایک قطعی کمیونسٹ مخالف داخلہ اور خارجہ پالیسی رونما ہونے لگی۔ غیر جانبدار ہندوستان کے مسلسل خوف نے مشرقی پاکستان میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی مداخلت اور ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کی نیشنل کانفرنس کی حکومت میں روزافزوں کمیونسٹ اثر سے مل کر ایک قطعی مغرب نواز میدان پیدا کر دیا۔

سرحد پر روس کی حمایت اور پشت پناہی کی بنا پر افغان دباؤ اور مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کی سوویٹ طرف داری نے مغرب سے استمداد کی خواہش کو دوچند کر دیا۔ ۱۹۵۳ء کے موسم بہار میں سیکرٹری آف سٹیٹ ڈلس نے اپنا "شمالی ٹائر یا صف بندی" کا تصور پیش کیا جس میں اس نے روس کی سرحدوں پر واقع مشرق وسطیٰ کے ممالک کے "باہم مربوط" دفاع کے لئے امریکی حمایت تجویز کی۔ موسم خزاں میں پاکستان نے جواباً فوجی امداد کی درخواست کی۔ اگلے سال یہ سیٹو میں شامل ہو گیا اور ۱۹۵۵ء میں برطانیہ ترکی عراق اور ایران کے ساتھ بغداد پیکٹ (اب سنٹو) کا ممبر بن گیا۔ وسیع پیمانے پر امریکی تکنیکی، اقتصادی اور فوجی امداد کا ایک پروگرام ظہور میں آیا اور پاکستان ایشیا کی سب سے زیادہ مغرب پسند اقوام میں شامل ہو گیا جس کے امریکہ کے ساتھ بالخصوص گہرے تعلقات پیدا ہو گئے۔

افغانستان میں تغیرات:

انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کے پانچ سال بعد تک افغانستان اپنی الگ تھلگ پن اور غیر جانبداری کی روایتی پالیسی پر چلتا رہا۔ اس کی زیادہ تر دلچسپی "پختونستان" میں تھی اور اسی مقصد کے پیش نظر یہ سرحدی قبائل کو پاکستان کے خلاف گڑبڑ کرانے

کی کوششوں میں لگا رہا اور موقعہ ملنے پر اقوام متحدہ میں اس کی تشہیر کرتا رہا تھا اور اسی محدود سی حمایت پر قانع رہا جو ہندوستان اسے پیش کر رہا تھا۔

اندرونی صورتحال بھی نسبتاً جوں کی توں رہی۔ تیز اور ہنگامہ خیز اصلاحات نافذ کرنے کی امان اللہ کی کوششوں کے نتائج کو ذہن میں رکھتے ہوئے حکومت نے جدیدیت کے لئے نہایت کم اور محتاط اقدامات ہی کئے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک مختصر سی ڈھیل دی گئی جس نے ایک آزاد پریس اور سیاسی پارٹیوں کی تشکیل کی اجازت دی لیکن جونہی سیاسی شعور اور بے چینی کے آثار بڑھنے لگے حکومت نے اسے فوراً واپس لے لیا۔ اختیار و اقتدار شاہی خاندان کی اجارہ داری رہے جس میں ظاہر شاہ کا کردار ثانوی تھا اور حکومت کی باگ ڈور اس کے چچاؤں ہاشم خان اور شاہ محمود کے ہاتھوں میں تھی جو وزیراعظم تھے ۱۹۵۳ء میں شاہ محمود کی بجائے اس کا بھتیجا اور ظاہر شاہ کا عمزاد، داؤد محمد خان وزیراعظم بنا۔ داؤد کے برسر اقتدار آتے ہی جو نتیجہ فوری طور پر منظر عام پر آیا "پختونستان" ایجی ٹیشن کی شدت تھی۔

پاکستان کی طرح ۱۹۵۳ء افغانستان کے لئے فیصلے کا سال تھا۔ وزیراعظم داؤد نے جلد ہی اپنے ملک کی تیز تر جدیدیت میں دلچسپی اور ایک وسیع پیمانے پر اقتصادی ترقی کے پروگرام کی طرف میلان کا پتہ دیا۔ اس نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ وہ افغانستان

کی طاقت کو مستحکم کرے گا اور اسے ایک زیادہ فعال بین الاقوامی کردار کا اہل بنائے گا۔ جب ۱۹۵۳ء کے اواخر میں "مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم" یا ایک "شمالی صف بندی اتحاد" کا تذکرہ بڑھنے لگا تو افغانستان نے بھی دلچسپی کے محتاط اشارے دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ افغانستان اور پاکستان کے درمیان "پختونستان" تنازعہ کے ممکنہ حل کے امکانات بھی کابل اور کراچی دونوں جگہ سنے گئے، لیکن اس کے باوجود سرحد پر افغان دباؤ گھٹنے کی بجائے بڑھ گیا۔

اس مرحلے پر سوویٹ یونین افغان ڈرامے میں سٹیج کے وسط کی طرف حرکت کرنے لگا، جس کی وجہ شاید پاکستان میں بڑھتا ہوا مغربی اثر و رسوخ اور "نئے شمالی صف بندی اتحاد" کی تیاریوں کی گہما گہمی تھی۔

دوسری جنگ عالمگیر کے خاتمہ کے کئی سال بعد تک افغانستان کے ساتھ سوویٹ تعلقات بہت ہی کم رہے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۶ء کے افغان سوویٹ معاہدے زیر عمل رہے اور جولائی ۱۹۵۰ء میں ایک چار سالہ تجارتی معاہدے کا اضافہ ہوا جس کے نتیجے کے طور پر کابل میں سوویٹ ٹریڈ ایجنسی کو از سر نو زندہ کیا گیا۔ سوویٹ ایئر لائن ایروفلوٹ ملک کے اندر اور باہر واحد ہوائی سروس تھی جو ہفتے میں ایک یا دو بار تاشقند تا کابل تا تاشقند آتی جاتی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں مزار شریف میں فرانسیسی عملے نے تیل کی تلاش کے

افغان منصوبے پر جو کام شروع کرنا تھا وہ ختم کر دیا گیا کیونکہ روس کو اعتراض تھا کہ اہل مغرب روسی سرحد کے اتنے قریب رہ کر کام کریں۔

وسط ۱۹۵۳ء میں روس نے افغانستان کو متعدد چھوٹے چھوٹے قرضے پیش کئے تاکہ اناج گودام، بیکری، تیل گودام کے حوض اور پختہ سڑکیں کابل میں بنائی جا سکیں۔ کچھ تاخیر کے بعد یہ قبول کر لئے گئے اور ۱۹۵۴ء میں روسی دلچسپی کے آثار بڑھ گئے۔ چیکوسلواکیہ نے ایک ٹیکسٹائل مل اور ایک سیمنٹ پلانٹ کی تعمیر کے لئے مدد کی پیشکش کی۔ ایک سوویٹ ثقافتی مشن افغانستان آیا، ۱۹۵۰ء کے تجارتی معاہدہ کی تجدید کی گئی اور اسے مزید وسعت دی گئی اور روس نے جیحوں کی روسی طرف سے مزار شریف تک پٹرولیم پائپ لائن بنانے کی بھی پیشکش کی (پائپ لائن بچھائی نہیں گئی) برسبیل تذکرہ یہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ کمیونسٹ اقتصادی جارحیت جس نے مشرق وسطیٰ اور دنیا پر عموماً اتنا زبردست اثر ڈالا، افغانستان میں ان چھوٹی چھوٹی کوششوں سے شروع ہوئی۔

اوائل ۱۹۵۵ء تک متعدد منصوبے سوویٹ کفالت کے تحت زیر تکمیل تھے اور الگ تھلگ افغانستان نے چند سو روسی اور ان کے طفیلی ٹیکنیشنوں کے لئے اپنے دروازے کھول دیے تھے لیکن ان کی تعداد پھر بھی امریکیوں کی اچھی خاصی محنت کار طاقت کے مقابلے

پر زیادہ تھی۔ جسے افغان حکومت کے لئے وادئ ہلمند کو ترقی دینے والی تعمیراتی کمپنی نے ملازم رکھا ہوا تھا اور کابل میں متعینہ امریکی ٹیکنیکل امدادی مشن کے پھیلتے ہوئے عملے سے بھی بڑھ چکی تھی۔

عین اس وقت جب افغانستان دونوں دنیاؤں کے مزے لوٹ رہا تھا ایک یکایک اٹھنے والے مقامی بحران نے کابل کو اپنی خارجہ پالیسی میں ایک بڑے فیصلے پر مجبور کر دیا ۲۷ مارچ ۱۹۵۵ء کو حکومت پاکستان نے مغربی پاکستان میں ون یونٹ قائم کرنے کا آرڈی ننس نافذ کیا۔ افغانوں نے اسے پاکستان کے پٹھانوں کی کسی نہ کسی شکل میں خود مختاری کی آرزوؤں پر ایک چوٹ سمجھا ۲۸ مارچ کو وزیراعظم داؤد نے کابل ریڈیو پر ایک آتش بار تقریر کی اور اس عمل کی مذمت کی اور اگلے دن کابل میں پاکستانی سفارت خانہ لوٹا گیا اور پاکستانی پرچم کی توہین کی۔ یہ سب کچھ ایسے انبوہ کثیر نے کیا جو حکومت افغانستان کی مرضی سے ایسا کر رہا تھا۔

چند دن بعد پشاور میں افغان قونصل خانے پر جوابی حملہ کیا گیا اور پاکستان نے افغان درآمدات و برآمدات پر بھی پابندی لگا دی۔ اوائل مئی میں افغان وزیراعظم داؤد نے افغان فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ یہ لڑائی بالآخر ختم کر دی گئی، پابندی اٹھا لی گئی اور افغان فوج واپس بارکوں میں چلی گئی۔ مسئلہ "پختونستان" اور پاکستان افغان تعلقات پر اس سلسلۂ واقعات کا اثر سابقہ

باب میں زیر بحث آ چکا ہے۔

لیکن اس نام نہاد "واقعہ پرچم" کا اہم ترین اثر افغان سویٹ تعلقات پر ہوا۔

پاکستان نے باقی دنیا کے ساتھ آمد و رفت کا روتیی راستہ کاٹا تو افغانستان نے فوراً ہی روس کے ساتھ انتظامات کئے کہ اس کی درآمدات و برآمدات سویٹ ذرائع سے مہیا ہوں یا حمل و نقل سویٹ روس کے راستے ہو۔ اس تبدیلی سے شروع شروع میں خاصی مشکلات پیش آئیں لیکن روس نے بھرپور تعاون کیا اور ناکہ بندی اٹھنے تک افغان تجارت کا کافی حصہ سویٹ یونین کو یا اس کے راستے آ جا رہا تھا۔ اس میں سے کچھ حصہ بعد کے سالوں میں پاکستانی راستے پر واپس آ گیا لیکن ناکہ بندی سے پہلے کے دور سے کہیں زیادہ حصہ سویٹ راستوں کا عادی ہو گیا۔

فوجی تیاری کے دوران اپنی غیر تربیت یافتہ فوج اور دقیانوسی ساز و سامان کے افسوسناک مظاہرے سے ڈر کر اور پاکستانی فوج کا مقابلہ نہ کر سکنے کی اہلیت سے آگاہ ہو کر جسے امریکی امداد کے ذریعے بہت تیزی سے بہتر و برتر بنایا جا رہا تھا، وزیر اعظم داؤد نے نومبر ۱۹۵۵ء میں لوئے جرگہ بلایا اور اعلان کیا کہ وہ "پختونستان" کے لئے حمایت جاری رکھنے کا عزم رکھتا تھا اور وہ اس مقصد کی خاطر اپنے ملک کو مضبوط بنانے کے لئے اسلحہ حاصل

کرنا چاہتا تھا جہاں سے بھی ملے۔ اس نے اس موقع پر یہ بھی اظہار کیا کہ اس مقصد کے لئے مغرب سے ہمدردی اور حمایت حاصل کرنے کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔

چند ہفتے بعد بلگانن اور خروشچیف اپنے عظیم ایشیائی دورے کے دوران کابل میں پہنچے جس میں ہندوستان اور برما بھی شامل تھے۔ انہوں نے ۱۰۰ ملین ڈالر کا ایک طویل المیعاد اور معمولی سود پر قرض اقتصادی ترقی کے لئے پیش کیا جسے داؤد حکومت نے فوراً قبول کر لیا ۱۹۵۶ء میں برقابی کارخانوں، بندات آبپاشی، موٹروں کی مرمت کی دکانوں، درّہ سالنگ کے راستے ہندوکش کے آرپار سڑک کی تعمیر اور ایک فوجی اور کئی سول ایئر فیلڈوں کی تعمیر کے منصوبہ جاتی معاہدوں پر دستخط کئے گئے اور سال کے وسط تک اندازاً ۴۰۰ سوویٹ ٹیکنیشن ملک میں برسرکار ہو گئے[1] اپریل ۱۹۵۶ء میں ایک افغان فوجی مشن خریدِ اسلحہ کے لئے پراگ گیا اور اگست میں ایک بڑا مشن اسی مقصد کے لئے ماسکو روانہ ہوا۔ ستمبر میں اسلحہ کی پہلی کھیپ افغانستان میں پہنچ گئی جو ۲۵ ملین ڈالر کے ایک سودا کا حصّہ تھی[2]۔ اگلے ماہ

---

[1]۔ سوویٹ ایکسپوزیر اِن افغانستان "سنٹرل ایشین ریویو" جلد ششم، نمبر ایک (لندن، ۱۹۵۸ء)

[2]۔ ٹائمز (لندن) ۲۸ ستمبر ۱۹۵۶ء

جیٹ فوجی ائیر کرافٹ کی کھیپ بھی حوالے کر دی گئی۔ بعد میں بھاری بھرکم ہتھیار مشمولہ بہ ٹینک اور توپخانہ بھی پہنچا دیئے گئے اور افغانوں کو ان کے استعمال کی تربیت بھی دی گئی۔

ثقافتی اور سیاسی میدانوں میں بھی سوویٹ تعلقات بہت گہرے ہو گئے ہیں ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء میں کابل کے سالانہ جشن کے میلوں میں کمیونسٹ بلاک کے ممالک کی نمائندگی بہت نمایاں تھی۔ جنوری ۱۹۵۷ء میں ریڈیو ماسکو نے پشتو نشریات کا آغاز کیا جن میں کابل حکومت کے مہیا کردہ افغان ملازم رکھے گئے۔ داؤد نے ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء میں روس اور کمیونسٹ چین کے دورے کئے اور چواین لائی نے جنوری ۱۹۵۷ء میں کابل کا سفر کیا۔ ظاہر شاہ جولائی ۱۹۵۷ء میں روس کے شاہی دورے پر گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے آثار و شواہد بھی موجود ہیں کہ افغان روسیوں کے متعلق اپنے روایتی شک و شبہ کو خیرباد نہیں کہہ سکے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ حکومت نے شعبۂ تعلیم میں نہایت احتیاط سے سوویٹ امداد کو خارج کر دیا ہے اور اس کلیدی میدان میں نہ صرف مغربی امداد کی اجازت دی ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ عمومی طور پر داؤد حکومت کمیونسٹ بلاک سے جتنی اقتصادی، فوجی اور تکنیکی امداد مل سکتی ہے لینے کے لئے تیار معلوم ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مغرب کے ساتھ موجودہ تعلقات کو

نہ صرف قائم رکھنے بلکہ انہیں بڑھانے کی ہر ممکنہ کوشش کر رہی ہے۔
اس طرح وادیٔ ہلمند کا منصوبہ بلا شرکت غیرے ایک امریکی کارروائی
ہے، افغان ایرلائن (جسے ۱۹۵۵ء میں شروع کیا گیا تھا) کا
انتظام سازو سامان اور تربیت بھی ایک امریکی کمپنی کا مرہونِ منت
ہے اور ۱۹۵۸ء کے موسم بہار میں تند خو اور کم گو پرنس داؤد نے
امریکہ کے دورے میں بے حد مؤدت و جاذبیت کا مظاہرہ کیلہ
پاکستان کے ساتھ تعلقات کی بہتری کے سلسلے میں امریکی تعاون کو
خوش آمد کہا گیا ہے اور پختونستان ایجی ٹیشن ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء
میں کم رہی گو یہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں بھڑک اٹھی۔ آخر الذکر
سال میں تلخی یہاں تک پہنچ گئی کہ کابل اور راولپنڈی نے واقعی
اپنے سفارتی تعلقات توڑ لئے۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ آیا
بڑی طاقتوں کے درمیان توازن قائم رکھنے اور اپنے ہمسایوں کے
ساتھ تعلقات کے پل صراط پر چلنے کی روایتی اہلیت برقرار رکھنے
کی افغانستان کی کوششیں بالآخر سوویٹ غلبے کو روک سکیں گی یا نہیں؟

ہندوستان کا کردار

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے تحریک "پختونستان" کو بٹوارے سے
بھی پہلے انڈین کانگرس پارٹی کی حمایت حاصل رہی۔ یہ حمایت پاکستان
اور ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی جاری رہی جب پٹھان خودمختاری

کی تحریک قریباً مکمل طور پر افغان ہاتھوں میں چلی گئی۔ ابتدائی سالوں میں جب پاکستان اور ہندوستان دونوں ایک دوسرے کے خوف و دہشت میں بُری طرح مبتلا رہے ہندوستانی محرک نسبتاً سادہ تھا یعنی "میرے دشمن کا دشمن میرا دوست ہے"۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان پاکستان کے قائم رہنے کی صلاحیت کے متعلق کابل کے شکوک میں حصہ دار تھا اور اس امکان سے غیر متعلق نہیں تھا کہ وہ کسی دن افغانستان کے ساتھ مغربی پاکستان کے علاقوں میں شریک ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں افغانستان ہندوستان کی تھوڑی سی برآمدی مصنوعات کے لئے جو زیادہ تر پست معیار کی پارچات پر مشتمل تھیں ایک مفید منڈی تھا۔

جیسے جیسے ایشیائی قیادت کے لئے ہندوستان کی آرزوئیں بڑھنے لگیں ویسے ویسے روایتی طور پر غیر جانبدار افغانستان ایک قدرتی رنگروٹ معلوم ہونے لگا اور ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۴ء کے دور میں کابل میں ہندوستان کی سفارتی سرگرمیاں غیر معمولی طور پر تیز رہیں۔ ۱۹۵۴ء کے بعد پاکستان کو ملنے والی بھاری امریکی اقتصادی اور فوجی امداد نے اس تصویر میں ایک ایسی تبدیلی پیدا کر دی جو نئی دہلی کے لئے انتہائی ناخوشگوار تھی۔ امریکہ کے ساتھ پاکستان کے اتحاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے مقابلہ پر پاکستان کی طاقت ناگزیر طور پر بڑھ گئی لہٰذا فطری طور پر ہندوستان کو اپنی منصوبہ وار اقتصادی ترقی کو

قربان کرکے اپنے وسائل کا بڑا حصّہ دفاع کے لئے وقف کرنا پڑا۔ پاکستان کے قائم رہنے کے امکانات بہت حد تک بڑھ گئے۔ "مسئلہ پختونستان" کے آخری حل کے امکانات بھی امریکی کوششوں کی بدولت روشن ہو گئے۔ ہندوستان کی نگاہوں میں خطرناک ترین امر یہ تھا کہ پاکستان کی سیٹو اور بغداد (مینٹو) پیکٹ کی رکنیت "سرد جنگ" کو اس کی دہلیز تک لے آئی اور جنوبی ایشیا کی غیر جانبداریت کو زک پہنچی۔

ہندوستانی پراپیگنڈا اس موضوع کو اچھالتا رہا اور جب افغانستان حمایت کے لئے روس کی طرف زیادہ مائل ہوا تو نئی دہلی نے اس عمل کو امریکہ کی غلط اسلحہ بندیٔ پاکستان کا ناگزیر نتیجہ قرار دیا۔ گو یہ خود بھی ایشیا میں روسی عزائم کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اپنی شمال مشرقی سرحد پر مسلسل چینی کمیونسٹوں کے نرغے میں تھا۔ تاہم نئی دہلی کو کشمیر میں اپنے مقام و موقف کو بچانے کے لئے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں سوویٹ حمایت پر تکیہ کرنا پڑا لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے ترقیاتی پروگرام کو جاری رکھنے کے لئے مطلوبہ بھاری اقتصادی امداد اور بالآخر چینی دباؤ کی مزاحمت کا موقع حاصل کرنے کے لئے ہندوستان مغربی امداد سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی پالیسی بعض اوقات ایسے خطوط پر چلی جو غیر جانبدارانہ کی بجائے دو دلانہ تھے۔ مجموعی طور پر اس سے بخوبی یہ ثابت ہوگیا کہ آزاد ہندوستان خود کمیونسٹ ہوئے بغیر

بڑی طاقتوں کے درمیان "عظیم مقابلہ" کے آخری مرحلے میں نسبتاً برائے نام ہی اثر ڈال سکتا تھا۔

روس کا کردار :۔

ایک معقول قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جنوبی ایشیا میں روس کا آخری مقصد اس علاقے کو کمیونسٹ بنانا ہے لیکن ثانوی اور زیادہ فوری مقصد مغربی فوجی اتحادات جیسے سیٹو اور بغداد یا سینٹو پیکٹ اور مغربی حمایت پر مبنی مقامی فوجی تنظیمات کو ختم کرنا یا ناکارہ بنانا ہے جنہیں ماسکو اپنی جنوبی سرحدات کے لئے خطرہ گردانتا ہے۔ اولین مقصد واضح طور پر طویل المیعاد ہے اور ایک بڑی جنگ کے بغیر یہ عالمی رائے کی موجودہ آب وہوا میں خارج از امکان معلوم ہوتا ہے کہ اسے فوجی قبضہ کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی جب بین البرا عظمی میزائل اور دیگر تہ فیاتی ہتھیار ایشیا کی سرزمین پر کمیونسٹ مخالف فوجی تنصیبات و تنظیمات کی قدر و قیمت کو گھٹا دیں گے۔

روس کو عظیم مقابلہ کے تازہ ترین مرحلے میں کئی اثاثے حاصل ہوئے ہیں جو ماضی میں اسے نصیب نہ تھے۔ ان میں سویٹ فوجی اور اقتصادی امداد پر روز افزوں افغان انحصار، ہندوستان کی علانیہ غیر جانبدار پالیسی، پاکستان کا عدم استحکام جو کم از کم ماضی میں

خوفناک حد تک ظاہر ہوتا رہا ہے اور پاکستان کی بیشتر آبادی کے مغرب بیزار دلی جذبات اور ایک طاقتور اور متحرک چین کا تعاون شامل ہیں۔ پورے علاقے میں اقتصادی فلاح و بہبود کے لئے عوامی امنگیں موجزن ہیں اور روس نے نہایت ہوشیاری سے انہیں مہیا کیا ہے۔ آخر " پختونستان" اور کشمیر کے جھگڑوں میں روس کو عرب اسرائیلی آویزش کی طرح دائمی ناسور مل گئے ہیں جو حسب موقعہ ایک مسلح کشمکش میں بدلے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی روسی مقاصد کے راستے میں خوفناک رکاوٹیں بھی حائل ہیں۔ پاکستان بہت گہرے طریقے سے مغرب سے مربوط ہے۔ افغانستان روسی عزائم کو شک وشبہ سے دیکھتا ہے اور اپنی آزادی کا سختی سے متوالا ہے۔ علاوہ ازیں ایک اقتصادی اور سیاسی نظام کی حیثیت سے ایشیا میں کمیونزم کی دور دور تک پھیلی ہوئی کشش اکھڑ اور خود پسند افغانوں کے لئے برائے نام ہی ہے۔ افغانستان پر زیادہ دباؤ ایشیا کے اہم تر حصوں میں روس کے بے غرضانہ دوستی کے مؤقف کو تباہ کر دے گا۔ ہندوستان کے لئے اقتصادی امداد بھی ایک ایسے جمہوری سیاسی اور سماجی نظام کو تقویت دے رہی ہے جو شعوری طور پر کمیونسٹ چین کا مقابلہ کر رہا ہے۔

ایک لمحے کے لئے انحراف کرتے ہیں تو بعین قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ شاید جنوبی ایشیا ہی روس اور کمیونسٹ چین کے درمیان مقابلہ و مجادلہ کا وہ میدان ثابت ہو جو یک مشت کمیونسٹ

بلاک کو توڑ دے۔

امریکہ کا کردار :-

امریکہ "عظیم مقابلہ" میں برطانیہ کے بدل کے طور پر شامل ہوا لیکن واضح تحالف پہلوؤں کے سائے میں اولاً ایشیا کے براعظم میں اس کی اپنی جائے ایستادگی کوئی نہ تھی اور یہ زیادہ سے زیادہ اپنے واحد مضبوط اتحادی پاکستان کی پالیسی پر اثر ہی ڈال سکتا تھا لیکن اسے اپنی مرضی کے مطابق نہ ڈھال سکتا تھا۔ عمومی طور پر روس کی مزاحمت کے لئے ایشیائی وسائل کو منظم کرنے کی امریکی کوششوں کی ہندوستان نے مخالفت کی۔ امریکی توجہ اکثر اس علاقے سے ہٹانا پڑی، پہلے یورپ کی بحالی کی وجہ سے، پھر جنگ کوریا اور اس کے مابعد مشرق بعید میں تناؤ کی بناء پر، پھر عرب مشرق قریب میں خلفشار کی وجہ سے اور ابھی حال ہی میں برلن بحران کی بناء پر۔ یہ بات قابلِ فہم ہے کہ امریکہ افغانستان کو روس کے خلاف اپنی حاکمیت کی مطلوبہ ضمانت دینے کے لئے نا رضامند بلکہ نا قابل تھا۔ جنوبی ایشیا میں استحکام پیدا کرنے کی غرض سے امریکہ "پختونستان" اور کشمیر کے جھگڑوں میں مضبوط موقف اختیار کرنے یا ہندوستان کے خلاف پاکستان کی حمایت کرنے پر بھی لازماً غیر رضامند تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری جنگ عالمگیر کے بعد "عظیم مقابلہ" کی جنگی صفیں پیچھے دھکیل دی گئیں۔ اور کسی حد تک تاریکی میں چلی گئیں۔

افغانستان کو اب کوئی بھی صرف برطانوی حلقۂ اثر نہیں سمجھتا جیسا کہ ۱۹۱۹ء سے پہلے تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب سے روس اس میں واحد غالب ترین خارجی اثر بنا ہے افغانستان دو عالمی جنگوں کے درمیانی وقفہ کے مقابلے پر بہت کم حد تک ملکِ بے مالک رہ گیا ہے۔

پاکستان کی فوجی تنظیم امریکی فوجی امداد کے بعد کافی حد تک مضبوط ہو گئی ہے، لیکن اس کی اضافی صلاحیتیں اس کے اپنے مقاصد اور امریکی مقاصد کے نقطۂ نظر سے برائے نام ہی تبدیل ہوئی ہیں۔ اس طرح جیسا کہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ثابت ہوا جب سپہ سالار جنرل ایوب نے زمام حکومت سنبھالی پاکستانی فوج اندرونی تحفظ قائم قائم رکھ سکتی ہے۔ (بٹوارے سے کسی وقت بھی کسی نے اس کی اہلیت پر شک نہیں کیا) یہ اب بھی افغان فوج کو قابو میں رکھ سکتی ہے گو کابل کو سوویٹ فوجی امداد کے بعد دونوں افواج کی صلاحیتیں اندازاً اب یا جلد ہی ایسی ہی ہوں گی جیسی کہ وہ ہمیشہ رہی ہیں۔ یہ ہندوستانی فوج شکست نہیں دے سکتی گو یہ اب بھی ہمیشہ کی طرح ہندوستانی حملے کے خلاف ایک مؤثر دفاعی کارروائی کر سکتی ہے۔ ایرانی فوج کے ساتھ مل کر بھی جو امریکی فوجی امداد کی وصول کنندہ ہے یہ جنوب کی طرف سوویٹ پیش قدمی کا شاید ہی سامنا کر سکے گی۔

اس صورتحال میں روز بروز واضح ہوتا جا رہا ہے کہ "عظیم مقابلہ" کے آخری مرحلے کا آخری فیصلہ بنیادی طور پر ان بڑی اقوام کی اپنی

خواہش اور اہلیت پر منحصر ہوگا جن کی وہ اپنی آزادی برقرار رکھنے
کے لئے حامل ہوں۔ یہ تو شک وشبہ سے بالا ہے کہ وہ تمام اس خواہش
کی حامل ہیں۔ ان کی اہلیت کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھنا غلط ہوگا۔ افغانستان
کی آبادی اور فی الحقیقت اس کے رہنما اتنے ہی روس نواز ہیں جتنے ان کے
مدمقابل پاکستانی امریکہ نواز ہیں۔ موجودہ حکومت پاکستان کی ملک پر گرفت
افغانستان پر داؤد حکومت کی گرفت سے زیادہ مندوش نہیں ہے۔

دونوں فریقوں نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی نمایاں اہلیت
کا مظاہرہ کیا ہے۔ افغان ڈیڑھ صدی کی برطانوی روسی کشاکش کے باوجود
زندہ رہے ہیں۔ پاکستانی اپنی آزادی کے حصول اور اس کے تحفظ کی
وجہ سے زندہ ہیں جب بین الاقوامی دباؤ کم سے کم رہ جاتے ہیں تو
دونوں اپنی مذہبی و نسلی وحدت کی بناء پر اکٹھے رہنے کے رجحان کا بھی
مظاہرہ کرتے ہیں۔

"عظیم مقابلہ" کے قواعد وضوابط بھی بدل رہے ہیں کیونکہ جو
اقوام اور علاقے پہلے بساط شطرنج پر بڑی طاقتوں کے محض مہرے
تھے۔ اپنے آزادانہ اختیارات اور مقاصد حاصل کرتے جا رہے ہیں
ہمیں امید ہے کہ اسی میں مغرب کا آخری فائدہ مضمر ہے کیونکہ امریکہ
اور ۱۹۴۷ء سے برطانیہ ایسا ہونے پر رضامند ہیں البتہ روس ناگاہ
اب بھی ان پر کنٹرول کو اپنا آخری مقصد بنائے ہوئے ہے۔

سرحد پر اثرات :-

ان بین الاقوامی رجحانات و واقعات کا اثر لازماً سرحد پر بھی ہوا ہے۔ قبائلی نئے امریکہ ساختہ جیٹ لڑاکا طیارے دیکھ سکتے ہیں جو پشاور کے ایئر فیلڈ سے اڑتے ہیں جسے امریکہ نے بہتر بنایا ہے اپنی پہاڑیوں کی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ چند میل مغرب کی طرف سیل کر کے، میدان جلال آباد کے آغاز پر نظر ڈال سکتے ہیں جہاں سوویٹ ٹیکنیشن آبپاشی کے منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ عبدالغفار خان ۱۹۵۸ء کے موسم بہار میں حکومت پاکستان کی اجازت سے کابل گیا اور وہاں ایک محترم مہمان بنا، لیکن بعد میں اسے پھر ون یونٹ کے خلاف ایجی ٹیشن جاری رکھنے پر پاکستان میں جیل ڈال دیا گیا۔ وہ اپنے عمزاد بھائیوں سے ہم کلام ہوئے ہیں جو افغان فوج کی ملازمت سے واپس آئے ہیں اور جنہوں نے نئے سوویٹ آلات استعمال کئے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ سرحد میں زندگی کی روایتی نہج نمایاں طور پر برقرار ہے۔ نئی ایشیائی قومیت کی اہم لہریں جو کابل، کراچی اور راولپنڈی میں محسوس کی گئی ہیں سرحدی پہاڑیوں سے بلا تاثر گزر گئی ہیں۔ خوشحال خان خٹک کے قد و قامت کا کوئی عظیم پٹھان لیڈر پیدا نہیں ہوا۔ ڈیورنڈ لائن کی دونوں اطراف کے قبائلی اپنی نگاہوں میں ہنوز، آفریدی، وزیر اور مہمند ہیں نہ کہ افغان یا پاکستانی، حکومت اب بھی پاکستانی ہے۔

یا افغان پولٹیکل افسر جو قبیلے کو بربنائے استحقاق وظائف ادا کرتا ہے بس پولٹیکل افسر ہی ہے ۔ سرحد کی افغان طرف کا سوویٹ سیاح اور پاکستانی طرف کا امریکی سیاح آج بھی ایک معروضی دلچسپی اور تجسس کی چیز ہے جسے پختون دل کے تقاضوں کے مطابق سلوک ملتا ہے جو یہاں کا واحد مسلمہ قانون ہے ۔

جہاں تک پٹھانوں کا تعلق ہے "عظیم مقابلہ" ابھی تک ختم نہیں ہُوا۔ سوویٹ تربیت یافتہ اور مسلح افغان فوج کی تشکیل نے صدیوں پرانے خطرے کو کم کر دیا ہے جو قبائل حکومت کابل کو پیش کرتے رہے ہیں لیکن اس نے اسے ختم نہیں کیا۔ اوائل ۱۹۷۰ء میں پٹھانوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اب بھی کابل کے لئے گھمبیر اضطراب کا ایک سرچشمہ ہو سکتے ہیں ۔ جو پورے مشرقی افغانستان میں افغان عورتوں کی بے پردگی کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے حکومتی کوششوں کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا۔

اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ قبائل بلکہ کسی حد تک پوری پٹھان جمعیت اب بھی پاکستان اور افغانستان کے درمیان توازن اقتدار قائم رکھے ہوئے ہے۔ سرحد کے زیر انتظام اضلاع پاکستان میں خوب مدغم ہو چکے ہیں ۔ قبائلی ایجنسیاں ایسی نہیں ہو سکیں لیکن ان کی وفاداری سالہا سال سے مغرب کی بجائے اپنے مشرق سے ہے ۔ افغانستان میں سوویٹ پروردہ ، ترقیاتی پروگراموں کے باوجود ایجنسیاں اور اضلاع دونوں

جانتے ہیں کہ ان کی اقتصادی فلاح و بہبود پاکستان سے منسلک ہے۔

لیکن یہ اقتصادیات کا ایک سادہ سا مسئلہ نہیں ہے بسا اوقات سالہا سال سے افغان حکومت پٹھان طرز حیات کو اپنی سرحدات کے اندر زیادہ سے زیادہ آگے بڑھا رہی ہے اور نافذ کر رہی ہے اور یہ سب کچھ ایرانی ثقافت کو دبا کر کیا جا رہا ہے، جو پہلے کابل میں بالادست ہوتی تھی۔ یہ افغانستان کی غیر پٹھان آبادی کے لئے کتنا بھی غیر منصفانہ کیوں نہ ہو لیکن یہ پاکستان اور افغانستان کے پٹھانوں کے لئے بہت خوش آئند ہے۔

پاکستان میں رجحان مخالف سمت بہہ رہا ہے ۱۹۵۵ء سے پٹھانوں کو قومی زندگی میں جذب کرنے کی مسلسل کوشش رہی ہے جس کی جڑیں مسلمان ہندوستانی روایات میں پیوست ہیں۔ صوبہ سرحد کا خاتمہ، ون یونٹ کا قیام، سخت مرکز پسند ایوبی دور کی آمد اور دارالحکومت کی کراچی سے راولپنڈی تبدیلی سب اسی کے مددومعاون ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی چیزیں ایک جدید قومی مملکت کے لئے ضروری اور مستحسن ہیں لیکن بہت سے پٹھان اس طرح نہیں سوچتے۔ ون یونٹ کے خلاف نفرت اگر ۱۹۵۹ء میں زیادہ نہیں تو اتنی ضرور قائم تھی جتنی ۱۹۵۵ء میں تھی۔

پٹھانوں کو کابل مسلسل یاددہانی کراتا رہتا ہے کہ وہ ہندوپاکستان کے دیگر لوگوں سے علیحدہ اور افضل ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے

کہ اصلی پٹھان وطن پختون ولی کی بناء پر افغانستان میں دوبارہ بنایا جا رہا ہے۔ افغانستان میں غیر پٹھان پٹھانوں سے افضل ہونے کی بجائے اسفل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پاکستان پٹھانوں کو مسلسل دعوت دے رہا ہے کہ وہ "پٹھانیت" کی بجائے مسلمانوں اور پاکستانیوں کی حیثیت سے سوچیں۔ ہمیشہ کی طرح اس مقابلے میں باہم متخالف مؤثر بھی ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے متذکرہ بالا ہنگاموں میں افغانستان نے جو پٹھان روایت پرستی کا علمبردار ہے اپنے آپ کو پردے کی محترم رسم کا مخالف پایا جبکہ جدیدیت پسند پاکستان اس کا دفاع کر رہا تھا۔

اگرچہ سرحد کے سیاسی خاکوں میں تبدیلیاں غیر اغلب معلوم ہوتی ہیں پھر بھی پٹھانوں کی وفاداری کے لئے جد و جہد کا نتیجہ ابھی تک یقینی نہیں ہے۔ لیکن سرحد کے مسئلہ کو دور سے دیکھا جائے تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ پٹھان سرحدی سرزمین میں ایک ایسا تغیر آ رہا ہے جو اب تک کے تغیرات سے کہیں زیادہ تیز اور وسیع ہے۔ اس کی طویل اور رومانوی تاریخ سے آگاہی کی بدولت آئندہ ایسے منظر پر تھوڑا سا غمناک ہونا بھی لازمی ہے۔ لیکن یہ ناگزیر غمناکی قدرے کم ہو سکتی ہے بشرطیکہ نیا نظام جیسا کہ قوی امید ہے، پاکستانی افغان تعاون کے سیاق و سباق میں تشکیل پائے۔ اس طرح پٹھانوں کی حیرت انگیز توانائیاں اور صلاحیتیں تعلیم اور اقتصادی ترقی سے جلا اور وسعت پا کر لیکن آزاد اور برابر رہتے ہوئے دونوں ممالک کو دلکشی اور قیادت

مہیا کر سکیں گی، اور شاید بالآخر ان دونوں کے درمیان ایک رشتۂ دائمی بن جائیں گی۔

یہ کچھ بھی ہو پٹھانوں کی تاریخ کو ختم کرتے ہوئے لارڈ کرزن کے الفاظ کو دہرانا بہتر ہوگا جو اس نے اپنے دورِ حکومت کے خاتمے کے قریب ۲۰، جولائی ۱۹۰۴ء کو کہے تھے: "کوئی آدمی بھی جس نے تاریخ ہندوستان کا ایک صفحہ بھی پڑھا ہے سرحد کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کرے گا۔"

(۱۸) کتابیاتی نوٹ

پٹھانوں کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اکثر و بیشتر ممتاز مصنّفین کے قلم سے جو مغل شہنشاہ بابر سے لے کر الیاتور روز ولیبٹ تک ہیں۔ لیکن یہ تمام کتب زمان، مکان یا مصنّفین کے ذاتی نقطۂ نظر کی بدولت محدود ہیں جہاں تک راقم الحروف تعین کر سکا ہے مرحد پر کوئی ایسی واحد، جامع اور موجودہ دور تک محیط کتاب نہیں ہے جو علاقے کے مطالعہ کار کے لئے ایک عمومی حوالے کا کام دے سکے۔ عجیب بات ہے کہ ایسی مطلوبہ تصنیف کے قریب ترین جو کتاب موجود ہے وہ غالباً اس موضوع پر مغرب میں چھپنے والی پہلی کتاب ہے یہ ہے آنریبل ماؤنٹ سٹوارٹ ایلفنسٹن کی معرکتہ الآرا تصنیف "این اکاؤنٹ آف دی کنگڈم آف کابل اینڈ اٹس ڈیپنڈنسیز ان رشیا ٹارٹاری اینڈ انڈیا جو ۱۸۱۵ء میں لندن میں شائع ہوئی۔ ایلفنسٹن کا زیادہ تر مواد اس کے سفر کابل کے دوران اکٹھا کیا گیا جب وہ ۱۸۰۹ء میں پہلا برطانوی سفیر بنایا گیا جیسا کہ اس دور کے ایک تعلیم یافتہ شخص سے توقع کی جا سکتی تھی۔ ایلفنسٹن نے پٹھان رواجات قوانین، جغرافیہ، تاریخ اور سیاسی و سماجی تنظیم کے متعلق نہایت آزادی اور صحت کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ فاتح یا انتظام کار کی بجائے

Account of the Kingdom of Caubul, and its Dependencies in Persia, Tartary, and India
By: Mountstuart Elphinstone
ISBN-10: 1108036716

ایک محقق کی حیثیت سے آیا تھا لہٰذا اس کا بیان ہمدردانہ لیکن معروضی ہے اور مربیانہ لہجے سے مکمل طور پہ پاک ہے جو بعد کے برطانوی قلم کاروں کے ہاں اکثر و بیشتر پایا جاتا ہے۔

ایلفنسٹن کی تصنیف کے ساتھ انداز و رویہ میں ملتا جلتا چارلس میسن کا چار جلدوں میں "نیریٹو آف ویریس جرنیز ان بلوچستان، افغانستان اینڈ دی پنجاب" ہے۔ جو ۱۸۴۲ء میں شائع ہوا۔ میسن کا مواد انیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشروں میں اس علاقے میں طویل سیر و سیاحت کے دوران جمع ہوا۔ میسن ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کا ایک بھگوڑا تھا جس نے جد وجہد کرکے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ ایک مقامی باشندے کے بھیس میں سفر کرتا رہا۔ اس کی تصنیف ایلفنسٹن کا تکملہ ہے جو طبقہ شرفا کا ایک انتہائی شائستہ رکن تھا اور اٹھارہویں صدی کے سفیر کی شان و شوکت کے ساتھ اِدھر اُدھر پھرتا تھا۔ یہ دونوں تصنیفات انیسویں صدی کے ربع اول میں سرحد میں زندگی کے قریباً تمام شعبوں کی ایک نہایت گراں بہا تصویر پیش کرتی ہیں جب یہ علاقہ قریباً مکمل طور پر مغرب کی لمس سے نا آشنا تھا۔

لیکن یہ دونوں کتابیں ایک سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہیں اور سرحد جیسے علاقے میں بھی بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ ایلفنسٹن اور میسن کی تصنیفات کی بیشتر معلومات آج بھی مفید بلکہ بعض اوقات بے نظیر ہیں لیکن موجودہ دور میں انہیں بمشکل

Narrative of Various Journeys in Balochistan, Afghanistan, & the Punjab, 1826 to 1838, Kalat: During a Residence in Those Countries to Which Is Added ... at Kalat, and a Memoir on Eastern Balochistan
By: Charles Masson
ISBN-10: 8121510333

ہی حوالہ و استناد کا معیار سمجھا جاسکتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں کے ربع اول میں انگریز مصنفین نے سرحد کے مختلف پہلوؤں پر کتب کا ایک انبار لگا دیا۔ ان میں یادداشتیں، سوانح عمریاں، پسندیدہ موضوعات پر قلمکاروں کے رسائل، کسی پالیسی یا افسر وغیرہ پر تنقیصات و تقریظات، ہلکی پھلکی کتابیں اور درجنوں دیگر مخصوص موضوعات شامل ہیں۔ ان میں سے بہترین لیڈی بیٹی بیلفور کی "دی ہسٹری آف لارڈ لٹنز انڈین ایڈمنسٹریشن" (لندن ۱۸۹۹ء) سر رابرٹ واربرٹن کی "ایٹین ایرز ان دی خیبر" (لندن ۱۹۰۰ء) اور سر تھامس ہولڈچ کی "دی انڈین بارڈر لینڈ" اور "دی گیٹس آف انڈیا" (لندن ۱۹۰۱ء، ۱۹۱۰ء) ہیں جو نہ صرف قیمتی حقائق مہیا کرتی ہیں بلکہ اس دور کے مسائل میں بھی مفید بصیرت پیدا کرتی ہیں۔ اگر انہیں اس دور میں لکھی گئی بے شمار سرکاری رپورٹوں کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ اس زمانے کے واقعات کی کافی حد تک مکمل تصویر سازی کو ممکن بنا دیتی ہیں۔

لیکن تقریباً یہ تمام انتہائی طور پر ذاتی ہیں اور پٹھانوں پر اپنے تبصرہ میں "وہ" اور "ہم" کا نظریہ رکھتی ہیں جس سے علاقے کی مربوط تصویر سامنے نہیں آتی اور موجودہ قاری کو سرحد جیسا کہ تھا، کی بجائے زیادہ علم اس کا حاصل ہوتا ہے کہ انگریز سرحد میں کیسے رہتے تھے اور وہ اسے کس طرح دیکھتے تھے۔

The History Of Lord Lytton's Indian Administration, 1876 To 1880
By: Lady Betty Balfour
ISBN-10: 1173035974

Eighteen Years in the Khyber 1879-1898
By: Sir Robert Warburton
ISBN-10: 9693519132

The Indian Borderland, 1880-1900
By: Thomas Hungerford Holdich
ISBN-10: 0548302057

The gates of India, being an historical narrative
By: Thomas Hungerford Holdich
ISBN-10: 1171751494

بعد کے برطانوی قلمکاروں کی تحقیقات میں بھی یہی خامیاں
ملتی گو کافی حد تک کم۔ ان میں سے بہترین کولن ڈیویس کی "دی
پرابلم آف دی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر ۱۸۹۰ء تا ۱۹۰۸ء" (کیمبرج
۱۹۳۲ء) سر ولیم بارٹن کی "انڈیاز نارتھ ویسٹ فرنٹیئر" (لندن،
۱۹۳۹ء) اور ڈبلیو کے۔ فریزر ٹٹلر کی "افغانستان: اے سٹڈی
آف پولیٹیکل ڈیویلپمنٹس ان سنٹرل ایشیا" (آکسفورڈ! ۱۹۵۳ء) ہیں۔
ڈیویس کی کتاب اصل میں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک مقالہ
دکتوری تھا اور صرف ایک محدود دور پر محیط ہے لیکن قبائل کے
متعلق مفید ترین اعداد و شمار پر مشتمل ہیں جو اب بھی اہمیت رکھتے
ہیں بارٹن کی کتاب مصنف کے ذاتی تجربات پر محیط ہے لیکن برطانوی
حکومت کے بعد کے ایام پر نہایت مفید حقائق اور تبصرہ پیش کرتی
ہے۔ فریزر ٹٹلر بنیادی طور پر افغانستان کا ارتقاء بحیثیت ایک
مملکت سے متعلق ہے لیکن وہ اپنے بے نظیر ذاتی تجربے کی روشنی میں
قبائل کے مسائل کو نہایت مفید طور پر پیش منظر میں لاتا ہے جو
کابل کے نقطہ نظر کا مظہر ہے۔

جونہی یہ کتاب مکمل ہوئی سر اولف کیرو کی کتاب "دی
پٹھانز ۵۵۰ ق م تا ۱۹۵۷ء" (لندن! ۱۹۵۸ء) بھی منظر عام
پر آئی۔ سر اولف کی کتاب اب تک بہترین ہے۔ سرحد میں بیس
سالہ تجربہ اور وسیع تحقیق پر مبنی یہ کتاب جدید حوالہ جاتی کتب

The problem of the North-west frontier, 1890-1908, with a survey of policy since 1849
By: Cuthbert Collin Davies
ISBN-10: 0064916138

India's north-west frontier
By: Sir William Barton
ASIN: B0006AOLV8

Afghanistan : a Study of Political Development in Central Asia
By: Sir William Kerr Fraser-Tytler
ASIN: B0026Q2446

The Pathans: 550 B.C.-A.D. 1957
By: Olaf Caroe
ISBN-10: 0195772210

کے مذکورہ بالا فقدان کا بہت حد تک مداوا کرتی ہے لیکن اس کی
بھی اپنی تحدیدات ہیں۔ یہ قریباً سراسر تاریخی نوعیت کی ہے اور
اس کے حرف آخری سو کے قریب صفحات ہی برطانوی دور سے
متعلق ہیں۔ پاکستان کے تحت واقعات وترقیات قریب قریب
نظرانداز کر دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں انیسویں اور بیسویں صدیوں
کے ضخیم برطانوی سرکاری دستاویزات سے نسبتاً برائے نام ہی
استفادہ کیا گیا ہے جو لندن کی انڈیا آفس لائبریری اور پبلک
ریکارڈ آفس میں دستیاب ہیں۔ آخراً گو سراولف کیرو سرولیم
بارٹن کی طرح غیر معمولی حد تک پٹھان کردار واحساسات کا ہمدرد
ہے تاہم وہ ایک انگریز ہے اور ایک قدیم سرحدی انتظام کار
لہٰذا اس کے ہاں بھی اکثر سابقہ تصنیفات کی مانند "ہم" اور "وہ"
کا رویہ موجود ہے۔

ہلکے پھلکے ادب کے میدان میں ابھی حال ہی کے دو اچھے
سفرنامے ہیں۔ آئین سٹیفنز کا "بارنڈ مون" (لندن ۱۹۵۴ء)
اور پیٹر مائن کا "دی نیرو سمائیل" (لندن ۱۹۵۵ء) جن میں
سے موخر الذکر امریکہ میں بھی "جرنی ٹو دی پٹھانز" (گارڈن سٹی،
نیویارک ۱۹۵۵ء) کے نام سے چھپا۔ دونوں سٹیفنز اور مائن
انگریز ہیں جو برطانوی ہند میں پٹھانوں کو جانتے تھے اور ان کے
مداح تھے اور بٹوارے کے بعد انہوں نے ان علاقوں کے جذباتی

Journey to the Pathans
By: Peter Mayne
ASIN: B0007DT59C

The Narrow Smile
By: Peter Mayne
ASIN: B0028A5PIM

واپسی سفر کیے۔ ان کی کتابیں آج کے سرحد کے رنگ و آہنگ کی تصویر پیش کرتی ہیں لیکن پس منظر یا تعبیر و تفسیر کے لحاظ سے بے معنی ہیں۔

مذکورہ بالا تمام قلمکاروں میں ایک چیز جو مشترک ہے وہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب انگریز تھے لہٰذا انہیں سرحد کے ساتھ ایک مخصوص دلچسپی تھی اور ان کا زاویۂ نظر خواہ کتنا ہی عالمانہ یا ہمدردانہ کیوں نہ ہو لیکن یہ لازماً ایک صدی سے زیادہ پر پھیلی ہوئی تاریخ اور رسالات سے مشروط تھا۔ غیر انگریزوں کی تصنیفات بہت کم ہوئیں اور سوائے چند مختصرانہ کتابوں کے غیر اہم بھی تھیں سکنڈے نیویا کے فریڈرک بارتھ اور امریکی ہربرٹ وری لینڈ نے بہت اچھے بشریاتی مطالعات پیش کئے ہیں لیکن ان کے مکمل نتائج ابھی شرمندۂ اشاعت نہیں ہو سکے۔ جسٹس ولیم او ڈگلس نے اپنی "بی اونڈ دی ہائی ہمالیاز" (گارڈن سٹی، نیویارک، ۱۹۵۲ء) میں اپنے سفر سرحد کو کافی جگہ دی ہے۔ میرا اپنا سفر نامہ بھی ہے "دی وے آف، دی پٹھانز" (لندن، رابرٹ ہیل، ۱۹۶۲ء)۔ انگلینڈ اور امریکہ کی بڑی بڑی لائبریریوں کے کیٹالاگ اندراجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغانستان پر سویٹ قلمکار بہت کام کر رہے ہیں۔ بدقسمتی سے مصنف روسی زبان سے نابلد ہے لہٰذا اس کی تحقیق نہیں کر سکا۔

Beyond the High Himalayas
By: William O. Douglas
ISBN-10: 1446544664

The Way of the Pathans
By: James W. Spain
ISBN-10: 0196360994

بلوچ اور پشتون تاریخ پر کتابیں

انور رومان (تراجم) بلوچستان گزیٹیر ۔ بلوچ تاریخ ۔ پٹھان رسم و رواج اور تاریخ افغانستان تاریخ کے آئینے میں ۔ بلوچ ۔ پاوندے ۔ قدیم بلوچستان ۔ تاریخ سیستان سفر نامہ بلوچستان اور سندھ۔ پٹھان اور بلوچ۔ افغانستان دارا سے امان اللہ تک۔ فارورڈ پالیسی

میر گل خان نصیر کوچ و بلوچ ۔ تاریخ بلوچستان ۔ تاریخ خوانین قلات ۔ رزمیہ شاعری بلوچستان قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں۔ بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار۔ عشقیہ شاعری۔

کامل القادری مہمات بلوچستان۔ براھوی رسم ورواج۔ بلوچ قبائل۔

لالہ ہتورام
تاریخ بلوچستان

طاہر بزنجو
بابائے بلوچستان

بریگیڈیئر عثمان
بلوچستان رپورتاژ

سعود بخاری
بلوچستان کی سیاسی تحریکیں

شیر مری
مری بلوچ سیاسی کشمکش

Afghanistan from Darius to Amanullah. Pashtoon. Gazetteers of Balochistan(2vol). The Notes on Baluch National Struggle. Jirga Laws. Tigers of Balochistan. Unexplored Balochistan. The Frontiers of Balochistan. Notes on Afghanistan and Balochistan. Ahmed Shah Durrani. Afghanistan.

چند اہم کتابیں

بہشتی زیور۔ تحفۂ خواتین۔ فلسفہ افلاطون۔ ساحر سارے سخن۔ کلیات اقبال۔ احمد شاہ دُرانی بلونت سنگھ کے افسانے۔ فلسفہ جبران۔ کلیات ڈیل کارنیگی۔ تین جنگجو سپہ سالار۔ تین مصنف عظیم افسانہ نگاروں کے لافانی افسانے۔ تین عظیم فاتح۔ تین ڈکٹیٹر۔